بڑی منزل کا مسافر

قاسم علی شاہ

انتساب!

نوجوان نسل کے نام

جن سے ہمیں بہت سی

توقعات وابستہ ہیں۔

فہرست

تعارف

قاسم علی شاہ

قاسم علی شاہ صاحب پچھلے 17 سالوں سے شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں۔ آپ نے پاکستان کے معتبر ترین ادارے سے تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ ایم پی ڈی سی میں CSP آفیسرز DSD میں پنجاب گورنمنٹ سکول ٹیچرز اور ہیڈ ماسٹرز کو ٹریننگ دے چکے ہیں۔ آپ انجینئرنگ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، گورنمنٹ مرے کالج سیالکوٹ، کامسیٹ یونیورسٹی لاہور، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور، ایجوکیشن یونیورسٹی لاہور میں موٹیویشنل لیکچرز دے چکے ہیں۔ لاہور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے ہیڈ FM95 پر آپ کا پروگرام "منزل کا مسافر" بے شمار لوگوں کو رہنمائی فراہم کر رہا ہے۔ مختلف SHRM، مارکیٹنگ فورم اور ادبی مجالس کے ممبر ہیں۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی لاہور کیمپس کی آپ فیکلٹی میں شمار کیے جاتے ہیں۔ Samaa TV آپ کی Success Story پر ڈاکومنٹری نشر کر چکا ہے۔ لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی فیکلٹی کو ٹریننگ دے چکے ہیں۔ کئی مشہور کمپنیوں کی مشاورتی کونسل میں شامل ہیں۔ مختلف شعبہ زندگی کے لوگ آپ سے مشاورت کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ معروف ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے ملازمین کی ٹریننگ آپ سے کرواتی ہیں۔ مختلف NGO'S کے ساتھ مل کر اصلاح معاشرہ کے کام کر رہے ہیں۔ بچوں کی تربیت پر آپ کا لکھا ہوا کتابچہ "کامیاب بچہ کیسے بنتا ہے" اور آپ کے اقوال کی کتاب "ذرا نم ہو" ہزاروں لوگوں کو رہنمائی فراہم کر چکا ہے۔ اسی موضوع پر PTV پر بھی آپ کی گفتگو نشر ہو چکی ہیں۔ Youtue.com, Dailymotion.com, Tune.pk اور Vimeo.com پر آپ کے بے شمار لیکچرز موجود ہیں جن سے لاکھوں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ آپ کے مضامین روزنامہ اسلام، نوائے وقت، جنگ، ایکسپریس، ماہنامہ حکایت اور دیگر میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب یہ مضامین کتابی شکل "کامیابی کا پیغام" میں موجود ہیں۔ آپ کو پنجاب جوڈیشل اکیڈمی میں ہائی کورٹ کے ججز کو ٹریننگ دینے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ایک عرصہ سے بچوں کی اخلاقی تربیت کے موضوع پر کام کر رہے ہیں تاکہ یہ ننھے چراغ آنے والے وقتوں میں روشنی پھیلا سکیں۔

ادارہ

کامیابی

''اگر آپ جلد نتائج کے خواہاں رہتے ہیں تو میں آپ کو بتادوں کہ کامیابی میں بڑا وقت لگتا ہے!''

استیو جوبس

کامیابی کی نفسیات

کسی بھی فیلڈ میں جب کوئی جملہ بولا جاتا ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ اس فیلڈ میں یہ جملہ کب کہا گیا، کیوں کہا گیا، اس کے پیچھے منطق کیا تھی، اس کے پیچھے وجہ کیا تھی؟ ان ساری معلومات کو اس چیز کی ''نفسیات'' کہا جاتا ہے۔ تاریخ میں بعض عظیم شخصیات نے بہت ہی زبردست جملے کہے ہیں۔ مثال کے طور پر، ''اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیں، تب بھی ان کی بات نہیں مانوں گا۔'' یہ رسول کریم ﷺ کا جملہ مبارک ہے۔ یہ آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا تھا کہ جب آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کو مکہ کے سرداروں نے کہا تھا کہ آپ ان (محمد ﷺ) سے ایک بار بات کریں کہ وہ جس سے چاہیں، ہم شادی کرادیں گے، جتنا چاہیں، ہم مال دے دیں گے، جہاں چاہیں، ہم بادشاہ بنا دیں گے، جس طرح چاہیں، ہم کرنے کو تیار ہیں۔ صرف ایک بات ہماری بات مان لیں کہ وہ ہمارے بتوں کو برا کہتے ہیں اور جو نیا مذہب لے کر آئے ہیں، اسے چھوڑ دیں۔ دنیا کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا جملہ ہے۔ کیونکہ جملہ کہنا بڑا آسان ہوتا ہے، لیکن اس کو ثابت بڑا مشکل ہوتا

ہے۔ یہ جملہ آپ ﷺ کے اس دور کا ہے کہ جب آپ ﷺ کو نبوت کا اعلان کیے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہ ایسا کمال جملہ تھا جو پوری نفسیات بیان کرتا ہے کہ دنیا میں اس ایجنڈے کے مخالفین بہت زیادہ ہوں گے اور آپ ﷺ بالکل اکیلے ہوں گے، لیکن آپ ﷺ کا عزم اور یقین اس معیار کا ہوگا کہ ''ایک ہاتھ پر چاند اور ایک ہاتھ پر سورج رکھ دیا جائے تب بھی میں ان کی بات نہیں مانوں گا۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جس منزل کا انتخاب کیا ہے، وہ سورج اور چاند سے کہیں بڑی منزل ہے۔

اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم مستقل مزاج، پُرعزم اور یقین والے نہیں ہیں تو اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے جو راستہ چنا ہوتا ہے، وہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اس کیلئے وہ خود کو موٹیویٹ ہی نہیں کر پاتے۔ ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی راستے پر چل رہا ہے۔ ہم جس چیز اور جس راستے پر چل رہے ہوتے ہیں، اس کی قیمت بھی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ غور کیجیے تو آپ کو پتا چلے گا کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں، اس کی قیمت ہم ادا نہیں کر رہے ہوتے۔ جبکہ بڑی منزل کیلئے ہماری ضد، ہمارا نفس، ہماری عادتیں، ہماری جبلت کا اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تبھی ہم بڑے جملے کہنے کے قابل ہو پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے: تمہارے لیے بہترین نمونہ تمہارا نبی ﷺ ہے۔ (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ) اس کا مطلب ہے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنا پڑے گی۔ پیروی کرنا پڑے گی۔ اگر مثال نہ ہو تو مثال بن بھی نہیں سکتے۔ ہماری کامیابی کی یقین دہانی صرف ایک بات سے ہوتی ہے کہ ہماری خواہش جنون میں بدل جائے۔ آج کے دن اور منزل کے درمیان کا فاصلہ ختم تب ہوتا ہے کہ جب آپ کے پاس جنون ہو۔ کیونکہ جنون اگر ہے تو آپ قربانی بھی دیں گے، محنت بھی کریں گے، لوگوں کی پروا نہیں کریں گے اور ایک دن منزل مل جائے گی۔ جنون واحد چیز ہے جو راستہ گزار دیتا ہے۔ یہ واحد چیز ہے کہ جو پھر بھی آپ کی خود آ کر رہنمائی کرنے لگتے ہیں۔ یہ وہ

واحد شے ہے کہ اگر آپ گھر سے نکلتے ہیں تو منزلیں آپ کو پہلے ہی سلام کر رہی ہوتی ہیں۔

کامیابی کا ارتقا

ڈارون کہتا ہے کہ ”آگے وہی بڑھ سکتا ہے جو تبدیلی کو قبول کرتا ہے۔“ وہ مزید کہتا ہے کہ ”طاقت ور بھی مر جاتے ہیں جیسے ڈائنا سور جو انتہائی طاقت ور اور دیو ہیکل تھے مگر اب دنیا میں نہیں ہیں۔ دنیا کی سب سے پرانی مخلوق میں جو ابھی تک زندہ ہے، کاکروچ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بدترین حالات میں بھی رہتا ہے۔ حیاتیات بتاتی ہے کہ لال بیگ (کاکروچ) ہر سال اپنی جینیاتی ہیئت میں تبدیلی لاتا ہے۔ اس کی مثال یہ سبق دیتی ہے کہ جو مشکل حالات اور تبدیلی کو قبول کرتا ہے، وہ زندہ رہتا ہے۔ ذہین ترین بچوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ پندرہ بیس سال بعد بھی ویسے کے ویسے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی ذہانت میں کمی نہیں ہوتی، بلکہ انہوں نے ارتقا نہیں کیا ہوتا۔ انہوں نے وقت اور حالات کی تبدیلیوں کو قبول نہیں کیا ہوتا۔ تمام ناکام لوگوں کا فکری ارتقا نہیں ہوا ہوتا، یا یوں کہہ لیجیے کہ وہ اس لیے ناکام ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی فکر کو ارتقا نہیں دیا ہوتا۔ اس لیے وہ بہتر نہیں ہو رہے ہوتے۔ وہ پروگریسو نہیں ہوتے اور تبدیلی قبول نہیں کرتے۔

ایک ہی آنے والی رکاوٹ کا جواب مختلف ہوتا ہے۔ کوئی آنے والے کنکر کو اختتام سمجھتا ہے تو کوئی آنے والے پہاڑ سے بھی راستہ بنا کر گزر جاتا ہے۔ جو اپنی زندگی میں ارتقا کے عمل سے گزرتا ہے، بہتر ہوتا ہے۔ ترقی وہی کرتا ہے جو خود کو بہتر کرتا رہتا ہے۔ ہماری سوچ کا معیار بہتر ہونا چاہیے۔ ہماری سوچ ایک جگہ رکنی نہیں چاہیے۔ اگر ہمیں کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ غلط ہے۔ جب تک ہم نیا سوچنے کی طرف نہیں آئیں گے، بہتری نہیں آئے گی۔

دنیا میں سب سے زیادہ تحقیق انسان کے مزاج پر ہوئی ہے۔ وہ لوگ جن میں خودکشی کا

رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ برسوں بعد بھی ویسے کے ویسے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ منفی سوچتے ہیں۔ ان میں دباؤ کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا فکری ارتقا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، ایک دو سال کی بچی نے ایک بکرا دیکھا۔ اس نے اپنی زبان میں اسے "باکا" کہا۔ چند دن بعد پھر اس نے ایک گدھے کو دیکھا۔ اس نے کہا، یہ "بڑا باکا" ہے۔ پھر کچھ دن بعد اس نے راہ جاتے کسی اور جانور کو دیکھا جو بکرے سے چھوٹا تھا تو اس نے کہا، یہ "چھوٹا باکا" ہے۔ غور کیجیے جس نے دیکھا ہی باکا ہے تو وہ ہر ایک کو باکے سے جوڑے گا۔ جب ہم ارتقا کے عمل سے گزرتے ہیں تو منفیت کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنی کم علمی اور لاعلمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ پھر کسی کی بات کا برا نہیں مناتے۔ حساسیت کم ہو جاتی ہے اور ہم کسی کے نظریے کو سن سکتے ہیں۔

پرانی روایات

دنیا میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کی دیکھا دیکھی ناکام ہو رہے ہیں۔ ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جس کے پاس سمت نہیں ہے۔ وہ بغیر سمت کے کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس ان کی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جنہیں اپنا پتا ہی نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو بھی جانا نہیں ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو دوسروں کی مدد نہیں کرتے۔ یہ تمام لوگ ہیں "عام" ہیں اور عام لوگوں والی زندگی جینا کوئی بڑی بات نہیں۔ جو بچے چھوٹی عمر میں پڑھائی کی بجائے آوارہ گردی کرتے ہیں، وقت ضائع کرتے ہیں وہ زندگی میں عام لوگوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ جنہوں نے کچھ بننا اور کچھ کر کے دکھانا ہوتا ہے، وہ موجودہ روایات کو توڑتے ہیں اور آگے نکل جاتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ آپ کے خاندان میں، آپ کے ارد گرد آپ واحد ہوں جس نے کچھ بن کر دکھایا ہو۔

جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، اس میں بہت کشش ہوتی ہے۔ جو سڑک بنی ہوتی ہے، اس پر گاڑی چلانا آسان ہوتا ہے۔ جبکہ جو سڑک بنی نہ ہو، اس پر گاڑی چلانا مشکل ہوتا ہے۔ دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہنا بھی کو آتا ہے۔ پتا تو تب چلتا ہے کہ جب دریا کے بہاؤ کے خلاف چلا جاتا ہے۔ لوگ آسان کام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مشکل کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ نیا راستہ بنانا اور اس پر چل کر دکھانا بہت بڑا کام ہے، مگر بہت مشکل بھی۔ کسی نے کیا خوب کہا کہ جنہیں راستہ نہیں ملتا اگر وہ سچے ہوں تو وہ راستہ خود بنا لیتے ہیں۔ لیکن جو جھوٹے ہوں ان کو راستہ مل بھی جائے تو وہ نہیں چلتے، کیونکہ وہ راستے پر چلنا ہی نہیں چاہتے۔

ہمارے معاشرے میں منفی سوچ بہت عام ہے۔ لوگ منفی سوچتے ہیں۔ ہر دوسرا آدمی تنقید کرنے میں مگن ہے۔ بغیر کسی وجہ کے گلہ کر رہا ہے۔ ہر ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے میں مصروف ہے۔ ہر دوسرا آدمی بے مقصد ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی مقصد نہیں ہے۔ لوگ اچھا اخلاق نہیں اپناتے کہ ہمیں لوگ کم تر سمجھیں گے۔ یہ سب پرانی روایتیں ہیں جو معاشرے میں پہلے سے موجود ہیں اور چلی آ رہی ہیں۔ ہم جس گھر میں پیدا ہوتے ہیں، اپنی مرضی سے تو پیدا نہیں ہوتے۔ ہمیں گھر مل جاتا ہے۔ اس گھر کی کچھ روایتیں ہوتی ہیں۔ اس کا ایک اپنا کلچر ہوتا ہے۔ وہ چاہے صحیح ہو یا غلط ہو، یہی روایتیں ہماری شخصیت بناتی ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ کامیابی کے ساتھ زندگی گزاری جائے تو اس سلسلے میں ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ان روایتوں کو شناخت کیا جائے جو ہمارے فائدے کی نہیں اور انھیں چھوڑنے کی کوشش کی جائے۔ جو شے ہمیں فائدہ دے رہی ہے اور نہ کسی دوسرے کو فائدہ دے رہی ہے اسے اختیار کرنے اور اس میں اپنا وقت اور توانائیاں ضائع کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟ پرانی بے فائدہ روایتوں کو چھوڑ کر ایسی نئی روایتوں کی ریت ڈالیے جن سے آپ کا اور دوسروں کا فائدہ ہو۔

ہم اس وقت تک کسی اچھی چیز کو نہیں اپنا سکتے جب تک کہ ہمیں اس کے فائدے کے

متعلق پتا نہیں ہوگا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ہمارے والد صاحب ناکام تھے تو میں بھی ناکام ہو جاؤں گا۔ بڑی بات یہ ہے کہ میں عام گھر سے تعلق رکھتا ہوں، میرے اردگرد بھی عام سے لوگ ہوں، لیکن اس کے باوجود میں بڑا انسان بن جاؤں۔

اصل یہ دیکھنا ہے کہ اگر آج کوئی بلندی تک پہنچا ہے تو اس نے اپنا آغاز کہاں سے کیا؟ مثال کے طور پر، ایک آدمی کہتا ہے کہ میں نے اپنا مکان بنایا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ گھر تو سبھی لوگ بناتے ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس کے خاندان میں پہلے کسی نے بھی اپنا گھر نہ بنایا ہو تو یہ اس کیلئے بہت بڑی بات ہوگی۔

عام چیز ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے، جبکہ نایاب چیز جگہ جگہ دستیاب نہیں ہوتی۔ اسی طرح معاشرے میں کوئی خوبی ایسی ہو جو سب میں نہ پائی جاتی ہو، وہ نایاب ہوگی اور نایاب چیز قیمتی ہوتی ہے۔ اگر آپ معاشرے کی جاری روایتوں کو توڑتے ہیں اور کوئی ایسی خوبی اپناتے ہیں جو معاشرے میں نہیں ہے تو پھر آپ کامیاب ہیں۔ جو بچہ نالائق ہے، وہ کتابیں نہیں کھولتا، محنت نہیں کرتا، وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ جب کہ ایک بچہ جو کتابیں کھولتا ہے، محنت کرتا ہے، دن رات ایک کرتا ہے خواہ وہ تنور پر روٹیاں ہی کیوں نہ لگاتا ہو، وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نایاب بن جاتا ہے۔

کامیابی کا معیار موجودہ یا گزشتہ حالت سے نہیں لگایا جاسکتا، کامیابی کا اصل معیار نتیجہ ہے۔ امیر کا بچہ ہو کر امیر بن جانا بڑی بات نہیں ہے، غریب کا بچہ ہو کر امیر بن جانا بہت بڑی بات ہے۔

فرض کیجیے، آپ کے والد صاحب پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ آپ کے گھر میں تعلیم و تربیت نہیں ہے، وسائل نہیں ہیں، اس کے باوجود آپ محنت کرتے ہیں اور کچھ بن کر دکھا دیتے ہیں تو پھر یہ معمولی بات ہے۔

مثال دینے والے تو بہت ہوتے ہیں، مگر مثال بننے والے کم ہی ہوتے ہیں۔ جو فرد

مثال بنتا ہے۔ وہ Trend setter ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے میں نئی طرح ڈالتا ہے۔ آپ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو پرانی ڈگر پر چلنے کی بجائے نئی طرح ڈالنے کا سوچئے۔ آج کی ایک فیصلہ یہ کہ مجھے نئی روایتیں اپنے خاندان میں لے کر آنا ہے۔ میں نے ایک مثال بننا ہے۔ آپ وہ بنیں جس کی مثال دی جائے۔ لوگ کہیں، دیکھو کیا بات ہے کہ آپ نے کتنے مشکل حالات میں، کتنے محدود وسائل میں کیا کمال کر دکھایا۔ اس کے پاس فیس دینے کے پیسے تک نہیں ہوتے تھے، لیکن اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔

دنیا میں سب سے بڑی مثال حضور اکرم ﷺ کی ذات مبارک کی ہے۔ عرب کا معاشرہ جہالت کی گہرائیوں میں گرا ہوا تھا۔ لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر رہے تھے۔ اخلاق نام کی چیز نہیں تھی۔ بے ایمانی و بددیانتی کی انتہا تھی۔ لوگوں میں شائستگی نہیں تھی۔ لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی ماں کا احترام نہیں کرتے تھے۔ اپنے بیوی بچوں کی طرف دھیان نہیں دیتے تھے۔ ان کی تربیت کو اہم نہیں سمجھتے تھے۔ اس وقت جہالت اتنی زیادہ تھی کہ اگر اس وقت کی جہالت کو مثال کے طور پر بھی سمجھنا چاہیں تو سمجھ نہیں سکتے کہ کہاں بیٹی پیدا ہونا، اور اسے زندہ درگور کر دینا... اور کہاں حضور اکرم ﷺ کی ذات مبارک کہ جنہوں نے مثال قائم کی۔ انہوں نے ہر چیز کو بدل کر رکھ دیا، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تمہارے گھر میں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو یہ خدا کی رحمت ہے۔ بیٹی جسے معاشرہ زندہ دفن کر رہا تھا، اسے رحمت کہہ دیا۔

برصغیر میں اسلام اولیائے کرام کی وجہ سے پھیلا ہے۔ یہ بات درست ہے۔ اس کے ساتھ مسلمان تاجروں کی وجہ سے بھی اسلام پھیلا۔ مسلمان تاجر اتنے ایمان دار اور دیانت دار تھے کہ ہندو متاثر ہو جاتے تھے۔

مثال بننا حضور اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ آپ بھی اپنے اردگرد کے ماحول کیلئے مثال بن سکتے ہیں۔ جہالت، حماقت، غیر سنجیدگی کو چھوڑ کر اور سنجیدہ ہو جائیے۔ پہلے یہ کام کر کے

دوسروں کیلئے مثال بن جایئے۔

وہ لوگ جو مشہور ہونا چاہتے ہیں جو اپنی شناخت بنانا چاہتے ہیں، وہ ترقی کر جاتے ہیں۔ ہماری کامیابی کا پہلا تعلق ہماری شناخت سے ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں شناخت کا جذبہ نہیں ہوتا وہ ترقی نہیں کرتے، کامیاب نہیں ہوتے۔ انہیں کچھ کرکے دکھانے کا کوئی شوق نہیں ہوتا جبکہ بعض لوگوں کو کچھ کر دکھانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر شناخت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں میں تو یہ جذبہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ کام کرتے کرتے مرجاتے ہیں۔ پھر ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا ہے، جیسے حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ۔ اگر مثال بننا ہے تو اپنی شناخت پیدا کرنی پڑے گی۔

رسول کریم ﷺ کی ایک سنت مداومت عمل ہے۔ مداومت عمل کا مطلب ہے، جو خوبی ایک بار اپنالی اسے ساری زندگی اپنے اندر رکھنا، اسے کبھی نہ چھوڑنا۔ جیسے آپ ﷺ کا اخلاق سب کے ساتھ ساری زندگی اچھا رہا۔ آپ ﷺ نے کبھی اخلاق کو نہیں چھوڑا۔ آپ ﷺ دیانت دار تھے۔ آپ ﷺ نے کبھی دیانت داری نہیں چھوڑی۔ اگر آپ کو مثال بننا ہے تو پھر جن خوبیوں کو آپ اختیار کرلیں، انھیں نہیں چھوڑنا۔ یہ نہ ہو کہ آج اخلاق اچھا ہے، کل کو برا ہو گیا۔ کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کے ساتھ برا ہے، تب بھی آپ کا اخلاق اچھا ہو۔ یہ مداومت عمل کی شان ہے۔

جب آپ نئی مثال بناتے ہیں تو دنیا آپ کو بے وقوف سمجھتی ہے۔ لوگ تنقید کرتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہم زندگی میں اپنے کاموں کے متعلق ہر ایک کو جواب دہ نہیں ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں کو جواب زندگی خود دیتی ہے۔ جب آپ کوئی چیز اپناتے ہیں یا کسی چیز کی پیروی کرتے ہیں تو بعض لوگ اس وقت تنقید کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ کو جواب نہیں دینا۔ بس آپ نے انتظار کرنا ہے۔ زندگی خود ہی انہیں جواب دے دے گی۔

حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں، "بڑی منزلوں کے مسافر چھوٹے جھگڑوں میں نہیں

پڑتے۔" وہ مزید فرماتے ہیں: "بڑی منزلوں کے مسافر دل نہیں ہارتے۔ ان کی ہمت جوان رہتی ہے۔"

ہماری سب سے بڑی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن نہیں پڑھتے اور نہ سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم اتنے عجیب لوگ ہیں کہ ہمیں دنیادار مصنوعی ہیروز کی زندگیوں کا مکمل پتا ہوتا ہے مگر رسول کریم ﷺ کی ذات مبارکہ کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ اگر سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ کیا جائے تو قدم قدم پر رہنمائی ملتی ہے۔ چلئے، خود ہی بتایئے کہ ایک کتاب آپ کے گھر جاتی ہے۔ یہ کتاب آپ کے گھر کے کتنے لوگ پڑھتے ہیں۔ مطالعے کا کلچر کامیابی کی طرف لے کر جاتا ہے۔ جس نے انسان کو سمجھنا ہے، وہ حضرت آدم علیہ السلام کو پڑھے: جس نے بہترین انسان کو سمجھنا ہے، وہ رسول کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ پڑھے۔

شاندار کامیابی حاصل کرنے والوں کا راز

اس دنیا میں انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد جیسے آتی ہے، ویسے ہی چلی جاتی ہے۔ وہ یوں زندگی گزارتے ہیں گویا کبھی زندہ ہی نہ تھے۔ جبکہ بعض لوگ آتے ہیں اور ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہو جاتا ہے۔

وہ کیوں رہتے ہیں؟ دونوں کی زندگیوں میں صرف ایک فرق ہے۔ وہ فرق کامیابی کا ہے۔ وہ کامیابیاں جو انھوں نے حاصل کی ہوتی ہیں۔ ان کی کامیابیوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے ساتھ ان کا مضبوط تعلق بن جاتا ہے۔

ایک لڑکا جب کلاس میں پڑھتا تھا تو کوئی اس کے ساتھ کھانا کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ دنیا اسے "نپولین" کے نام سے جاننے لگی۔ جب اس کے پیچھے سبب تلاش کی گئی تو پتا چلا کہ اس کی زندگی میں ایسی محرومیاں تھیں جس نے اسے اتنا بڑا انسان بنا دیا۔ دنیا

کے جتنے بھی بڑے فلسفی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ محرومی، کمی یا پھر احساس کمتری اتنی طاقتور چیزیں ہیں کہ اگر یہ کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو وہ عام انسان کو خاص بنا سکتی ہیں... بشرطیکہ یہ کہ آدمی ان نعمتوں کی قدر کرے۔

ایک لڑکی کو ایک لڑکے سے محبت ہوگئی۔ لڑکی ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جبکہ لڑکے کا تعلق امیر گھرانے سے تھا۔ ایک دن لڑکے کے گھر پر وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی دوران لڑکے کی ماں آ گئی۔ اس نے لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور مارتے ہوئے اس کو گیٹ تک لے گئی۔ گیٹ پر چھوڑنے کے بعد اس نے کہا کہ تیری یہ مجال کہ تو میرے بیٹے کے ساتھ عشق لڑائے۔ لڑکی اٹھی اور چلی گئی۔ جب وہ واپس پلٹی تو مادام کیوری بن چکی تھی۔ مادام کیوری کو "مادام" بنانے میں اس کی بے عزتی شامل تھی۔

ہمارے پاس ایسی کوئی محرومی، احساس کمتری یا ایسی کوئی بے عزتی نہیں ہوتی جو طاقت بن کر ہمیں چلنے پر مجبور کرے۔ احساس کمتری میں اتنی طاقت ہے کہ اسے ختم کرنے کے چکر میں آدمی اتنی محنت کرتا ہے کہ ساری دنیا پیچھے رہ جاتی ہے اور وہ آگے نکل جاتا ہے۔

جتنے بھی خوف ہیں، انھیں دور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ خوف کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ کامیاب لوگوں کو جب اپنے احساس محرومی کا پتا لگ جاتا ہے تو وہ اپنے احساس محرومی سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

احساس محرومی سے لڑائی بہت ہی مشکل مرحلہ ہے۔ باہر کی دنیا سے لڑنا آسان ہوتا ہے جبکہ اندر کی دنیا سے لڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ احساس محرومی اندر کی چیز ہے۔ یہ اتنی مشکل اس لیے ہے کہ آپ کو خود ہی اپنے اندر کی بزدل ذات کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ جب آپ اس سے لڑنا شروع کرتے ہیں تو ایک دن آتا ہے کہ آپ اسے مار بھگاتے ہیں۔

جو آدمی پہلا آپ کو فتح کر لیتا ہے اس کیلئے دنیا فتح کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ جتنے بھی صوفیائے کرام ہیں ان میں سے کئی عشق مجازی سے گزرے ہیں۔ یہ عشق مجازی سے گزر کر

عشق حقیقی کی طرف گئے۔ اگر اس کی وجہ تلاش کریں تو پتا چلتا ہے کہ جو بندہ مجازی ناکامی کا سامنا کر لیتا ہے، اس کو حقیقت کا سامنا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب وہ وصال، دوری، جدائی کو برداشت کر لیتا ہے تو پھر وہ اتنا بڑا انسان بن سکتا ہے کہ اس کا نام بڑے بڑے صوفیائے کرام میں شامل ہو جاتا ہے۔

دنیا میں سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی محرومی، کوئی وصال اور کوئی خامی ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن کامیاب اور ناکام لوگوں کی ان محرومیوں کے جوابات مختلف ہوتے ہیں۔ کیسی ہی محرومیاں ہوں، کیسے ہی حالات ہوں، اگر آپ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو ان باتوں پر عمل کیجیے:

1) اپنی ذات کو سمجھنا

سب سے پہلا کام اپنی ذات کو سمجھنا ہے۔ جب ہم اپنے اندر خود کو تلاش کر لیں گے تو ہمیں کئی قسم کی محرومیاں، خوف، تنقید اور کئی خامیاں نظر آئیں گی۔ ہمیں ان خامیوں اور محرومیوں کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ستر سال کا بوڑھا ہے، مگر اس کی عادتیں سولہ سال والے بچے کی طرح ہیں۔ یہ اس لیے کہ اس نے اپنی بچپن کی خامیوں کو دور نہیں کیا ہوتا۔ ایڈیسن کی عمر جب 72 سال تھی تو اس کی لیباٹری کو آگ لگ گئی۔ پوری لیباٹری جل گئی۔ وہ باہر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جب ساری لیباٹری جل گئی تو اس نے کہا کہ اب نئے سرے سے کام کرنے کا موقع ملے گا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے وقت پر اپنی محرومیوں کو منظم کر لیا ہوتا ہے۔

اگر آپ اس وقت طالب علم ہیں تو اپنی خامیاں تلاش کرنے اور کھوجنے کی یہ آئیڈیل عمر ہے۔ اگر آپ اس وقت اپنی خامیوں کو تلاش کر لیتے ہیں تو آنے والی زندگی آسان ہو جائے گی۔

2) ٹیلنٹ

کامیاب ہونے کیلئے دوسرا کام اپنی بہترین صلاحیتیں تلاش کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر

شخص کو ایک کام ایسا دیا ہوتا ہے کہ اس جیسا کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی کام آگے چل کر عزت، پیسہ اور تعلقات کی تشکیل کرتا ہے۔ ہمیں اس کام کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ مل جائے تو پھر اسے پالش کرنا ہوتا ہے۔ اگر وقت پر مل جائے تو تھوڑا تھوڑا روز اسے پالش کرتے رہنا چاہیے۔ ایک تحقیق کے مطابق اگر کسی نے زندگی میں اپنی بہترین صلاحیت کو دس ہزار گھنٹے دیئے ہیں تو وہ عام سے خاص ہو جاتا ہے۔ وہ اس کام کا اسپیشلسٹ بن جاتا ہے اور پھر اس کام میں مہارت کی وجہ سے دنیا میں اس کا نام بن سکتا ہے۔

جس کے پاس ہتھیار ہوتا ہے، وہ اسے چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ لیکن وہ اس ہتھیار کی وجہ سے پُر اعتماد نظر آتا ہے۔ مثلاً جس کو تیرنا آتا ہے وہ سوئمنگ پول میں جا کر خوشی خوشی تیرنا شروع کر دیتا ہے، جبکہ جسے تیرنا نہیں آتا، وہ ڈرے گا کہ میں ڈوب نہ جاؤں۔ یہ اس لیے ہے کہ جس کے پاس صلاحیت ہوتی ہے، اسے وہ کام کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔ اور جس کے پاس صلاحیت نہیں ہوتی، اس کو خوف ہوتا ہے۔

ہمارا ٹیلنٹ ہمارے اندر اعتماد پیدا کرتا ہے۔ جب ہم اپنے ٹیلنٹ کی طرف تھوڑا سا متوجہ ہوتے ہیں تو وہ پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ ہم اپنے ٹیلنٹ کے متعلق تھوڑا سا سنجیدہ ہو جائیں تو اسے آسانی کے ساتھ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ ہماری ڈگری ہوتی ہے، مگر اس ڈگری کے مطابق ٹیلنٹ نہیں ہوتا۔ ہم زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ ڈگری کے پیچھے لگا دیتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے ہاتھ ٹیلنٹ نہیں آتا۔

تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ زیادہ تر کامیاب ترین افراد نے اسکول، کالج یا یونیورسٹی کو چھوڑ دیا۔ کیوں؟ انھوں نے ڈگری کے حصول کی کوشش کرنے کی بجائے اپنے اندر ٹیلنٹ بڑھانے کی مشقت کی۔ عملی زندگی میں ڈگری کام نہیں کرتی، مہارت نتیجہ دیتی ہے۔

ٹیلنٹ یا صلاحیت یا مہارت ایسی چیز ہے کہ اس کے بعد کسی کا سہارا نہیں رہتا۔ آپ جو کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ کر سکتے ہیں۔ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ ایک

دم سے چیمپئن نہیں بن جاتا۔ شروع میں نقصان ہوتا ہے۔ لیکن جیسے ہی اسے پالش کرنا شروع کیا جاتا ہے تو پتا چل جاتا ہے کہ اس کو کیسے استعمال کرنا ہے۔ تھوڑا سا وقت گزرنے کے بعد وہ نتائج دینا شروع کر دیتا ہے، کیونکہ اسے سمت مل جاتی ہے۔

کامیابی کی اخلاقیات

کامیابیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک دنیا کی کامیابی اور دوسری آخرت کی۔ آپ کو ایک کامیابی کیلئے نہیں پیدا کیا گیا یہ تو ہماری کم فہمی ہے کہ ہم نے آخرت کی کامیابی کو ہی کامیابی سمجھا ہے۔ آپ تو روز ہر نماز کے بعد یہ دعا مانگتے ہیں، "اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی کامیابی دے اور آخرت میں بھی کامیابی عطا فرما، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔" آپ کی تو دعا شروع ہی دنیا سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام آخرت پر ہوتا ہے۔

دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ کاروبار پڑھاتے ہیں اور کچھ لوگوں نے کاروبار کر کے تجربہ کیا ہوتا ہے۔ کتنا فرق ہے کہ ایک استاد آپ کو تیراکی کا لیکچر دے اور خود کبھی اس نے تیراکی نہ کی ہو۔ کتنی عجیب بات لگتی ہے کہ ایک استاد آپ کو یہ سکھائے کہ ایک کروڑ روپیہ کیسے کمایا جا سکتا ہے اور اس نے کبھی ایک کروڑ دیکھا ہی نہ ہو۔ کتنا عجیب لگتا ہے کہ ایک استاد آپ کو اخلاقیات کے بارے میں سمجھائے اور اس نے کبھی اخلاقیات کی پیروی ہی نہ کی ہو۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایک استاد بہادری کی بات کرے اور ساتھ کہے کہ مجھے ڈر بہت لگ رہا ہے۔ کیا کمال ہے کہ استاد لیکچر دے کہ قناعت کی عظمت کیا ہے، قناعت کا فائدہ کیا ہے اور صبر کیا ہوتا ہے اور ساتھ ہی کہے کہ مجھے بھوک لگی ہے، جلدی سے کچھ کھانے کو لاؤ۔

اتنا تضاد... آج ہم اپنے معاشرے میں بھی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن، میرے رسول ﷺ نے جو بات کہی اس میں کوئی تضاد نہیں، کیوں کہ انھوں نے جو کہا، پہلے کر کے دکھایا۔ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: "دیانت دار تاجر شہداء، انبیاء، اور صدیقین کی صف میں کھڑا ہوگا۔" یہ اس لیے سچ ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے تجارت کر کے دکھایا۔

نک کا یقین

مونیوشنل کہانی لکھنے کیلئے کردار بنانے پڑیں گے، اس کا ایک پلاٹ بنانا پڑے گا، اس کا ایک اختتام بھی بنانا پڑے گا۔ پھر اس سے ایک سبق اخذ کرنا پڑے گا۔ لیکن جس کی اپنی کہانی موجود ہو، اسے ان جھمیلوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

نک وائے چیچ ایک ایسی ہی زندہ اور سچی کہانی ہے جس نے اپنی زندگی بغیر بازوؤں اور بغیر ٹانگوں سے شروع کی۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو اسے زندگی میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ مجھے مر جانا چاہیے۔ میں زندہ کیوں ہوں، مجھے خودکشی کر لینی چاہیے، ڈوب کر مر جانا چاہیے۔ خود کو دنیا سے دور کر لینے کا احساس دنیا کا منفی ترین احساس ہے۔ لیکن، اس احساس سے اپنی زندگی شروع کرنے والا جب اتنا بڑا ٹرینر بن جائے کہ دنیا کی بڑی بڑی جگہوں پر اس کے لیکچر ہو رہے ہوں، لوگ اس کو سن کر روئیں، زندگیاں بدل جائیں اور وہ کہیں کہ اس نک نے میری زندگی بدل دی.. کیا ہی حیرت انگیز منظر ہوگا۔

نک کہتا ہے، نہ بازو نہ ٹانگیں اور نہ کوئی ہاتھ.. لیکن اس کے باوجود میری کوئی حد نہیں ہے۔ مجھے کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ قدرت نے میرے ساتھ خاص رویہ اپنایا ہے تاکہ میں کچھ کروں۔

یہ سب سے بڑا یقین ہے جو آدمی کو بہت کچھ کرنے پر کھڑا کر دیتا ہے۔

ہمارے ساتھ چھوٹا سا مسئلہ آتا ہے تو ہم چیخیں مارتے ہیں۔ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ ہم اپنے مسئلے کو سب سے بڑا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مسئلے کی اوقات تو شاید بہت ہی چھوٹی ہوتی ہے، لیکن دراصل ہم خود کو مسئلے سے بہت ہی چھوٹا سمجھنے لگتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب صورت

کہا ہے کہ "میں اُن حادثوں سے مر چکا ہوں جو ابھی ہوئے بھی نہیں۔"

انسان چیزوں کو اتنا بڑھاوا دیتا ہے کہ وہ چیزیں اتنی بڑی ہوتی ہی نہیں ہیں۔ وہ صرف واہمے ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سارے میرے خلاف ہیں، میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے، میرا کیا قصور ہے، ترقی ممکن نہیں ہے، سب کچھ قسمت سے ہے، اندھیرا ہی اندھیرا ہے، میری ہی ٹانگیں کیوں کھینچی جاتی ہیں... مگر وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ان سارے واقعات کے پیچھے کیا معانی پوشیدہ ہیں۔

نک کی کہانی میں سیکھنے کے قابل سب سے اہم بات یہ ہے کہ ٹانگوں کے بغیر، بازوؤں کے بغیر بھی کہانی بنا جا سکتا ہے، بلکہ کامیاب کہانی بنا جا سکتا ہے۔ وہ نوجوان جس نے بچپن میں دو بار خودکشی کی کوشش کی، آج وہ دنیا کا سفر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، شاید دنیا والوں کو لگ رہا ہے کہ میں کچھ تلاش رہا ہوں، لیکن میں تو اپنی تلاش کر رہا ہوں۔ دنیا مجھے کہتی ہے کہ تمہارا احساس کیا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میرا صرف ایک احساس ہے اور وہ احساس ہے صرف اور صرف اپنی تلاش۔

جب آپ اپنی زندگی میں اس احساس کو واضح کر لیتے ہیں تو آپ کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو دنیا کے شب و روز میں خود کو تلاش کرتا ہے، دراصل وہی حقیقی زندگی گزار رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم سب کچھ کرتے ہیں، خوشی، غم، مسئلے، تنقید، رکاوٹیں، لڑائی جھگڑے سب ہماری زندگی میں آتے ہیں؛ ان تمام حالات میں ہم طرح طرح کے حل تلاش کرتے ہیں، مگر ہم خود کو تلاش نہیں کرتے۔

شوق

پریم جی نے کہا، "میری کمپنی اور میں کبھی پیسے کے پیچھے نہیں بھاگے۔ ہم ہمیشہ ساکھ کے پیچھے بھاگتے ہیں اور پیسہ ہمارے پیچھے بھاگتا ہے۔"

یہ الفاظ ایک کامیاب ترین کاروباری کے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمیں سکھایا ہی یہ جاتا ہے کہ تم اس لیے پڑھ رہے ہو تا کہ نوکری مل جائے۔ لڑکی اس لیے پڑھ رہی ہے تا کہ اچھا رشتہ مل جائے۔ جب ہمارے اہداف (ٹارگٹس) ہی اتنے چھوٹے ہوں گے تو پھر زندگی کہاں گزرے گی۔ خدارا، اس کام کو کیجیے جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیدا کیا ہے تا کہ کام آپ کو کام نہ لگے۔ اگر کام آپ کو کام لگے اور آپ کیلئے بوجھ بن جائے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے شوق کو دریافت نہیں کر سکے ہیں۔ آپ نے کاموں کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے۔ اور زندگی جس کیلئے بوجھ ہوتی ہے، وہ مُردہ ہوتا ہے۔ صرف دفنانا باقی ہوتا ہے۔ مشہور فلم "تھری ایڈیٹس" کے آخر میں فوٹو گرافر اپنے والد سے کہتا ہے، "فادر! اٹس اوکے... پیسہ کم کما لوں گا، لیکن وہ کروں گا جس میں میری تسلی ہے، میرا جذبہ ہے۔"

یاد رکھیے، ہر ایک کے اندر میٹر لگا ہوا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ آپ کا کام کیا ہے۔ جو بتاتا ہے کہ آپ کو کدھر جانا ہے۔ بعض اوقات زمانے کی تقدیر زمانے کے ہاتھ کی لکیر پر نہیں، آپ کے ہاتھ کی لکیر پر لکھی ہوتی ہے۔ جناحؒ کے ہاتھ کو دیکھیں۔ جناحؒ کے ہاتھ پر قوم کی تقدیر لکھی ہوئی تھی۔ تقدیر آپ کو بدلنی ہوتی ہے۔ آپ انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ کوئی مسیحا آئے اور تقدیر بدلے، جبکہ خدا نے آپ سے کام لینا ہوتا ہے۔ عبدالستار ایدھی صاحب نہ ہوتے تو کتنے ہی لاوارث پڑے رہ جاتے، کتنے یتیم بے سہارا رہ جاتے۔ وہ کتنوں کے باپ بن گئے، کتنوں کے جنازوں کے کفن بن گئے اور کتنوں کیلئے آسانی کا ذریعہ بن گئے۔

بعض اوقات ایک فرد پورے معاشرے کے معیار کو بدل ڈالتا ہے۔ وہ Trendsetter کہلاتا ہے۔ یہ ٹرینڈ سیٹر آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ آپ کے اندر کیا کچھ دفن ہے۔ ایڈیسن دنیا میں واحد سائنس داں ہے جس کی ایجادات کی تعداد 1249 ہیں جس میں ہم صرف بلب کو جانتے ہیں۔ ایک بلب کی ایجاد کیلئے ایڈیسن نے دس ہزار سے زائد کوششیں کیں۔ بیٹری بنانے کیلئے اس نے اس سے بھی زیادہ کوششیں کیں۔ اس نے ایک جملہ کہا تھا، "جس کو اپنے ٹیلنٹ کا پتا لگ جاتا ہے وہ ملازم

نہیں ہو سکتا اور نہ وہ غلامی برداشت کرتا ہے۔" غلام اور ملازم ہمیشہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اپنا پتا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو سستا بیچ رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو Pay Cheques پر چلا رہے ہوتے ہیں۔

اکثر لوگ اپنے شوق بدلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے شوق اس لیے بدلتے رہتے ہیں کہ انہیں یہ شعور ہی نہیں ہوتا کہ ان کا حقیقی شوق جو انہیں خدا کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے، کیا ہے؟ لیکن جب اپنا شوق واضح ہو جائے تو پھر وہ کبھی نہیں چھوٹتا۔

فرض کیجیے، کمرے میں اندھیرا ہے اور آپ باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ اچانک آپ کا ہاتھ کھڑکی سے چھوا تو آپ سمجھے کہ یہی دروازہ ہے۔ حالانکہ وہ دروازہ نہیں ہے۔ اسی طرح آپ جس چیز کو راستہ سمجھتے ہیں، وہ راستہ نہ ہو تو آپ کنفیوژ ہو جائیں گے۔ یہ کنفیوژن تب پیدا ہوتی ہے کہ جب آپ کی زندگی میں کوئی روشنی نہیں ہوتی۔ جب اپنی ذات کے بارے میں شعور بڑھتا ہے تو پتا چلنا شروع ہو جاتا ہے کہ مجھے اس دنیا میں کیا کرنا ہے۔ جو فرد فائنل چوائس پر چلا جاتا ہے، اس کیلئے چوائسس ختم ہو جاتی ہیں۔ آخر کار، وہ ایک چیز کا انتخاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بس اب کشتیاں جلا دو۔ کشتیاں وہی جلائے گا جس کو اپنی منزل کا پتا ہوتا ہے کہ میرا یہی کام ہے۔

عام طور پر، انسان کی وقتی موٹیویشن بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ اس غیر معمولی توانائی سے فیصلہ کن کام لیں۔ طے کر لیجیے کہ آپ کو اپنی زندگی میں آج کے بعد کیا کرنا ہے۔ پھر، دنیا کو وہ کر کے دکھا دیجیے۔



اُستاد

''استاد وہ نہیں جو کتاب پڑھائے، اصل استاد تو وہ ہے
جس کی بات دلوں کو چھو جائے!''

استاد کی تعریف

استاد ایک موٹیویٹر ہوتا ہے۔ استاد کیلئے صرف پڑھا دینا، بتا دینا کافی نہیں ہے۔ عمل کیلئے اکسانا، قوت ارادی پیدا کرنا، عزم پیدا کرنا، انرجی پیدا کرنا... استاد کا کام ہے۔ پچھلے سو سال کے اندر صرف انہی ملکوں نے ترقی کی ہے جہاں پڑھانے کا لائسنس ہے۔ وہاں پر اسلحے کا لائسنس آسانی مل جاتا ہے، مگر پڑھانے کا اجازت نامہ مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلحے سے صرف اتنے لوگ مر سکتے ہیں جتنی گولیاں اس میں ہوتی ہیں، جبکہ ایک استاد میں لامحدود گولیاں ہوتی ہیں۔ اس میں اتنا بارود ہوتا ہے کہ یا تو وہ پوری نسل کو اُڑا کر رکھ دیتا ہے یا بنا دیتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اسے پڑھانے کا لائسنس دیا جاتا ہے جس میں چھے خصوصیات ہوں:

1- متعلقہ مضمون پر مکمل مہارت

پہلی خصوصیت یہ کہ استاد کو اپنے مضمون پر مکمل مہارت ہو۔ مضمون پر مہارت کا مطلب ہے اپنے مضمون کو وقت کے ساتھ ساتھ اپ گریڈ کرنا۔

2- بات چیت / ابلاغ کی صلاحیت

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ استاد میں بات چیت / ابلاغ کی صلاحیت ہو۔ ابلاغ کی

صلاحیت کا مطلب ہے کہ استاد اپنی بات اپنے شاگردوں کو سمجھا سکے۔ اگر وہ اسٹوڈنٹ کی سطح پر آ کر نہیں سمجھا سکتا تو وہ جتنا بڑا استاد کیوں نہ ہو، اس کا مطلب ہے کہ اس میں بات چیت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

3- سماجی ذہانت/ملنساری

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سماجی ذہانت پائی جائے، یعنی اس میں ملنساری کی صلاحیت ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ استاد کو انسانوں کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ ملنسار ہی نہیں ہوگا تو کیسے کام کرے گا۔

4 موٹیویشن

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اگر استاد میں موٹیویشن نہیں ہے، جذبہ نہیں ہے تو وہ استاد نہیں ہے۔ حضرت علی بن عثمان الہجویریؒ اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں فرماتے ہیں، "برتن سے وہی نکلے گا جو اس میں ڈالا گیا ہے۔" اگر استاد کے پاس موٹیویشن نہیں ہے تو وہ موٹیویشن دے بھی نہیں سکتا۔ یہ پڑھانے والی چیز نہیں ہے۔ یہ دینے والی چیز ہے۔ موٹیویٹر کو لائسنس ملتا ہے۔

5 سیکھنے کا شوق

پانچویں خصوصیت استاد کیلئے یہ ہے کہ اس میں سیکھنے کا شوق ہو۔ جو خود پیاسا ہو وہ دوسرے کو پیاسا بنا سکتا ہے۔ جس کو خود ہی پیاس کا ادراک نہ ہو، وہ دوسروں کو کیا خاک پیاس کا شعور دے گا۔

6 آگے بڑھنے کا جذبہ

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہو، کیونکہ استاد وہ شخص ہوتا ہے جس نے قوم کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود آگے بڑھنے والا نہیں ہے تو کبھی بھی آگے بڑھنے والے لوگ پیدا نہیں کر سکے گا۔

موثر استاد

ایک محقق کے مطابق، بہرحال جب بھی کسی چیز کی قدر نکالنی ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس چیز نے معاشرے میں اپنی کتنی اہمیت بنائی ہے۔ اگر کوئی چیز خود ہی اہمیت نہ بنا سکی تو پھر چاہے تعداد میں جتنی بھی زیادہ ہو جائے، اہمیت نہیں بنے گی۔ ہمارے ملک میں استاد خود ہی اپنی اہمیت نہیں بنا سکا۔ وہ سر کا تاج تھا۔ اگر وہ سر کا تاج خود ہی نہیں بن پایا تو پھر کوئی کیوں سر کا تاج بنائے۔ اگر علم سکھانے والے نے یہ طے ہی نہیں کیا کہ کتنی بڑی ذمہ داری میرے پاس ہے، کیا میں اس کا اہل بھی ہوں یا نہیں اور میں نے اپنا آپ کو منوانا بھی ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر، اگر ایک کامک کو کسی محفل میں بلایا جائے تو وہ بھی خود کو منوا کر جاتا ہے جبکہ استاد عموماً خود کو نہیں منواتا کہ میں استاد ہوں۔ استاد جب بچوں کو متاثر نہیں کر سکے گا تو بچے بھی اس کا ادب نہیں کریں گے۔ وہ صرف ڈر کی وجہ سے اس کا ادب کریں گے۔

حضرت علامہ اقبالؒ اپنے دوستوں میں بیٹھے تھے کہ سامنے سے ان کے استاد مولوی میر حسن صاحب گزرے۔ علامہ اقبال ایک دم اٹھے اور ان کے ساتھ چل دیے اور ان کو گھر تک چھوڑ کر آئے۔ دوستوں نے دیکھا کہ آپؒ کے ایک پاؤں میں جوتی ہے، دوسرے میں نہیں ہے کیونکہ آپؒ جلدی میں جوتی پہننا بھول گئے تھے۔ آپ نے یہ ادب اس لیے کیا کہ استاد نے خود کو منوایا تھا۔ آج ہمارے پاس کتنے مولوی میر حسن ہیں؟ ہم رسمی طور پر ادب تو کر رہے ہیں، لیکن دلی طور پر ادب نہیں کرتے۔ اس کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا تو مل جاتا ہے، مگر اس سے انقلاب نہیں آتا۔ جو تعلیم ملنی چاہیے تھی، وہ نہیں مل رہی۔ صرف رٹا لگوا دینا، سبق یاد کروا دینا... تعلیم نہیں ہے۔ تعلیم تو اندر کی تبدیلی کا نام ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: "استاد علم نہیں دیتا، استاد علم کی پیاس دیتا ہے۔ اگر پیاس مل جائے تو علم خود چل کر آتا ہے"۔ یعنی پیاس اتنی طاقتور چیز ہے کہ اگر آپ علم کے پیاسے ہیں تو پھر

آپ اس کیلئے کتاب بھی خریدیں گے، اس کیلئے ورکشاپ میں جائیں گے، اس کیلئے سفر بھی کریں گے، اس کیلئے اسکالرشپ کا بھی پتا کریں گے۔ اس کیلئے ہجرت بھی کریں گے، اس کیلئے بڑی سے بڑی قیمت بھی ادا کریں گے، اس کیلئے پیدل بھی چلیں گے۔

اگر گھوڑے کو پیاس لگی ہو اور اسے دس لوگ پکڑیں، تب اسے کوئی پانی پینے سے روک نہیں سکتا۔ اگر گھوڑے کو پیاس نہ ہو اور دس لوگ اسے زبردستی پانی پلانا چاہیں تو وہ نہیں پیئے گا۔ آج بھی آپ اگر قابل استاد بن جائیں لوگ پلکیں بچھائیں گے۔ آپ آج اپنا مقام بنانے کو تیار ہوں، دنیا سرنگوں ہونے کو تیار ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ ہی طے نہ کریں تو جتنا مرضی اسکیل بڑھ جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مولانا رومؒ سے ان کے آخری ایام میں کسی نے پوچھا، آپ دنیا سے جانے لگے ہیں۔ آپؒ نے جواب دیا، ''میں دنیا کی مسند سے اتروں گا، دلوں کی مسند پر بیٹھوں گا۔'' کتنے بڑے استاد تھے جنہیں یہ یقین تھا کہ مجھے دنیا سے جانے کی کوئی پروا نہیں ہے، کیونکہ جو کام میں نے کیا ہے اس کام کی وجہ سے لوگ مجھے دلوں میں بٹھائیں گے۔ یہ اتنا بڑا سچ تھا کہ آٹھ سو سال بعد حضرت علامہ اقبالؒ جیسی شخصیت بھی کہتی ہے کہ میں اقبال نہ ہوتا اگر رومی میرا استاد نہ ہوتا۔ آپ کے اندر کوئی ایسا انداز ضرور ہونا چاہیے جو بچے کے دل کو اچھا لگے۔

سب سے پہلے خود کو مانئے۔ جب اپنی نظر میں اپنا مقام بن جائے گا تو پھر زمانہ بھی آپ کے مقام کی قدر کرے گا، لیکن آپ اپنی نگاہوں میں قابل قدر نہیں ہیں تو دنیا میں بھی قدر نہیں ہوگی۔ جب تک استاد آٹھ سے ایک بجے والا استاد ہوگا، وہ اپنا مقام نہیں بنا سکے گا۔ جب بھی اس میں کوئی ٹیلنٹ ہوگا، اپنا مقام خود بنا لے گا۔ یہ واحد پروفیشن ہے جو اپنے پر چوبیس گھنٹے طاری رکھنا پڑتا ہے۔ دنیا میں آنا اور جانا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ہر مخلوق کے ساتھ ہوا ہے۔ دنیا میں موثر ہونا مسئلہ ہے۔

شروع میں جب بھی گاڑی رکتی ہے تو دھکے سے ہی چلتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی گاڑی

ایک دم سے رفتار پکڑ لے تو پھر وہ نہیں چل سکتی۔ اسی طرح، بچے کو راستے پر چلانے کیلئے دھکے کی ضرورت ہوتی ہے اور کتنے بچے اس دھکے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بچوں کے کانوں میں یہ آواز پڑنی چاہیے کہ تم کر سکتے ہو، بس تھوڑی سی ہمت کرو۔ اس لیے آپ صرف استاد نہ بنیں، بلکہ موثر استاد بنیں۔ اپنے اندر کوئی ایسا فن پیدا کریں جس سے بچہ متاثر ہو، کیونکہ فزکس، کیمسٹری، میتھ بہت آسان ہے اگر استاد متاثر کرنے والا ہے۔ اگر استاد متاثر نہیں کر سکتا تو پھر دنیا کے آسان ترین مضمون میں بھی آدمی رہ جاتا ہے۔

ہر وہ فن بڑھنے لگتا ہے جس میں شاباشی کا عنصر شامل ہوتا ہے، اس لیے پہلا ہدف یہ بنائیے کہ آپ کو موثر استاد بننا ہے اور موثر استاد بننے کیلئے ان نکات پر عمل کیجیے:

1- اخلاق

بچہ ہم سے علم بعد میں لیتا ہے، پہلے وہ ہمارے اخلاق سے متاثر ہوتا ہے۔ ہمارا برتاؤ بہت تلخ ہوتا ہے، جبکہ مضمون اچھا ہوتا ہے۔ جب ہمارا مضمون اچھا ہوگا اور ہم برے ہوں گے تو بچہ اچھے مضمون کو بھی برا سمجھے گا۔ سب سے پہلے ہمیں اخلاق میں اچھا بننا ہے اور اچھے اخلاق کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جو بھی مسائل اور تکالیف ہیں، انہیں اپنے گھر کے صندوق میں بند کر دیں اور بچے سے اخلاق سے پیش آئیں۔ بچے کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ آپ کتنے پریشان ہیں۔ اس کے سامنے تو صرف ایک انسان ہے جس نے اسے پڑھانا ہے۔ کبھی اپنی ذات کے غم، دکھ، تکلیفیں بچے تک نہ پہنچائیں کیونکہ وہ آپ کو آئیڈیلائز کرتا ہے۔ اگر آپ اپنے دکھ بچوں کے ساتھ شیئر کریں گے تو وہ آپ کی شخصیت کو کمزوری کے طور پر لے گا اور ساتھ ہی اپنے مضمون کو بھی کمزور کر دے گا۔ امریکا میں ایک تجربہ کیا گیا جس کے تحت مریضوں کو مختلف گروپوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر تمام گروپ کے مریضوں کو ایک ہی دوائی دی جاتی۔ سب سے پہلے وہ مریض ٹھیک ہوتا جس کا معالج اچھے اخلاق والا تھا۔ انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ دوائی سے زیادہ اخلاق اچھی صحت دیتا ہے۔ ہمارا ذہن یقین

کی بنیاد پر چلتا ہے۔ ہم قدم بھی اس یقین کی بنیاد پر اٹھاتے ہیں کہ نیچے زمین ہے یا نہیں ہے۔ اگر آپ پر بچے کا یقین نہیں ہے تو بچہ آپ کو کبھی متاثر استاد نہیں سمجھے گا۔

2- وعدہ پورا کیجیے

آپ قابل اعتبار بنیں۔ آپ کی شخصیت ایسی ہو کہ آپ پر اعتماد کیا جا سکے۔ آپ کی شخصیت پر، آپ کی بات چیت پر اعتماد کیا جا سکے۔ لوگوں کو وعدے پر پورا اترنے والے لوگ پسند ہوتے ہیں۔ جھوٹا لارے لگانے والا فرد کسی کو پسند نہیں۔ بچے کو دکھائیں کہ آپ میں کردار ہے۔ غور کیجیے کہ ہمارے رسول پاک ﷺ کسی سے وعدہ کرتے تو ہر حال میں پورا کرتے۔ وہ واقعہ تو آپ کو یاد ہے کہ ایک جگہ کھڑے ہونے کا وعدہ کیا تو تین دن ایک ہی جگہ کھڑے رہے، کیونکہ انہیں پتا تھا کہ استاد کیلئے وعدہ کتنی بڑی چیز ہے۔ آپ ﷺ سے بڑا استاد تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ بھی ایک استاد کی حیثیت سے وفا کرنا سیکھیے۔ بچوں کو کچھ کہیں تو پھر ثابت بھی کریں۔ ایک کلاس میں حاضری رجسٹر نہیں مل رہا تھا۔ بچوں نے کہیں چھپایا ہوا تھا۔ استاد نے بڑی قسم کھا کر کہا کہ اگر تم مجھے بتا دو تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ایک بچے نے قسم پر یقین کر کے ہاتھ کھڑا کر دیا اور کہا کہ سر وہ الماری کے اوپر پڑا ہوا ہے۔ استاد نے وہ رجسٹر لے لیا۔ اس کے بعد پھر اس بچے کو مارا۔ کیا اس واقعے سے بچے کے ذہن میں استاد کا تاثر یہ بیٹھا کہ یہ وہ مخلوق ہے جو ادب کے لائق نہیں ہے؟ ادارہ ہو، معاشرہ ہو، گھر ہو، اسکول ہو، انسان اپنی جگہ خود ہی بناتا ہے۔ ایک صاحب کو کسی نے کچھ کہا، انہیں غصہ آیا تو اس نے بد اخلاقی سے اس کا جواب دیا۔ اس پر دوسرے شخص نے اتنا مارا کہ کپڑے پھاڑ دیئے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ کاش تیری زبان پر قابو ہوتا اور آج تیرا یہ حال نہ ہوتا۔ انسان کی زبان، انسان کا اخلاق، انسان کی شخصیت اٹھا دیتی ہے یا گرا دیتی ہے۔

3- منصوبہ سازی

استاد ایک اچھا منصوبہ ساز ہوتا ہے۔ اگر آپ منصوبہ سازی کی عادت اپنی زندگی میں

شامل کر لیتے ہیں تو آپ کے بہت سے مسئلے ویسے ہی حل ہونے لگتے ہیں۔ یہ پابندی نہیں ہوتی۔ یہ ایک عادت ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے روز نہانا، نئے کپڑے پہننا۔ اگر کسی سے کوئی قیمتی چیز ملے تو آپ اسے سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اسی طرح قدرت بھی آپ کو وقت دیتی ہے جو انتہائی قیمتی چیز ہے۔ اس لیے وقت کی پلاننگ کیجئے۔ جو چیزیں اچھی ہوتی ہیں، انہیں پلان کر کے استعمال کرنا چاہیے۔ اس کو آپ لیکچر تیار کرنے کے حوالے سے، اپنی سیلف مینجمنٹ کے حوالے، اپنی زندگی کے حوالے سے، اپنے کام کے حوالے سے، اپنی تعلیم کے حوالے سے، اپنی بہتری کے حوالے سے پلان کیجیے۔ آج لوگ بہت پڑھ لکھ چکے ہیں، لیکن ان کی شخصیت میں بہتری نہیں ہے۔ ان کی تعلیم بڑھ گئی ہے، لیکن وہ خود پیچھے رہ گئے ہیں۔ جب تعلیم بڑھ جائے اور اندر خلا رہے، اس کا مطلب ہے کہ بہتری نہیں آئی۔ صرف ڈگری بڑھ جانا کمال نہیں ہے۔ اندر کچھ نہ کچھ ہونا ڈگری سے بڑی چیز ہے۔ اس کی اہمیت پہچانئے، کیونکہ یہ چیز آپ کو اضطراب میں لے جاتی ہے اور اضطراب بتاتا ہے کہ آپ زندہ ہیں۔

4- کسی بچے کو چھوٹا نہ سمجھیے

جہاں پر آپ پڑھا رہے ہیں وہ علاقہ رہنے کے لحاظ سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، چاہے غریبوں کے بچے ہی کیوں نہ ہوں، آپ انہیں چھوٹا نہ سمجھیں، معمولی نہ سمجھیں۔ پتا نہیں وہ کتنا بڑا انسان بن جائے، کیونکہ جھگیوں سے بڑے انسان بنتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے نام دیکھیں تو وہ اسی طرح چھوٹے گھروں اور مشکل حالات سے نکلے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ خود کو ثابت کرنا ہے۔ اگر کسی فرد کو آپ نے دیکھنا ہے تو اسے اہمیت دیجیے۔ یہ کبھی نہ دیکھیں کہ یہ اس کا گھر کیسا ہے۔ اگر آپ اسے اہمیت نہیں دیں گے تو آپ زیادتی کریں گے۔ پڑھانے کا مطلب علم دینا نہیں ہے، اس کو اس کی اپنی نگاہوں میں اتنا معتبر کر دیں کہ اس کا دل کرے کہ مجھے کچھ کرنا ہے۔

5- اہل بنیں

بہت سے ممالک میں اسلحے کا لائسنس ملنا آسان ہے، مگر پڑھانے کا لائسنس ملنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلحے سے صرف اتنے ہی لوگ مریں گے جتنی اس میں گولیاں ہوں گی۔ لیکن ایک استاد جتنے لوگوں کو مارتا ہے اس کی تعداد کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ جاہل انسان بچوں کو پڑھائے گا تو آنے والی نسلیں برباد ہو جائیں گی۔ باہر کی دنیا میں استاد کا معنی "موٹیویشن" ہے۔ انہوں نے استاد کی تعریف بدل دی ہے۔ اگر استاد سے موٹیویشن نہیں ملتی تو پھر وہ استاد نہیں ہے۔ استاد کو لائسنس دیتے وقت جو چیزیں چیک کی جاتی ہیں اور ان میں ایک شے موٹیویشن ہے۔ آپ کے ذریعے بچے کے سوچنے کا انداز بدلنا چاہیے۔ اس لیے آپ موٹیویٹر بنیں۔ اگر آپ بچوں کو موٹیویٹ کرتے ہیں تو بچہ آپ کو یاد رکھے گا، وہ آپ کی قدر کرے گا، وہ آپ کی بات کا اثر لے گا۔

6- بچوں کو خواب دیں

جن بچوں کا پڑھائی میں دل نہ لگے، وہ پڑھائی سے اچاٹ ہوں اور وہ بھاگ جائیں، اس کی صرف ایک ہی وجہ ہوتی ہے کہ ان بچوں کے خواب نہیں ہوتے۔ جب بھی آدمی زیادہ کام یا زیادہ محنت کرتا ہے تو اس کا کوئی جواز ہوتا ہے کہ وہ کس لیے یہ کام کر رہا ہے۔ بچوں کو خواب دیجیے۔ جب بچوں کو خواب ملیں گے تو ان کا خود آگے بڑھنے کو دل چاہے گا۔ آپ بچوں سے کہیں کہ آپ ڈاکٹر بن سکتے ہیں، انجینئر بن سکتے ہیں، لیڈر بن سکتے ہیں۔ دنیا میں خواب راج کرتے ہیں، افراد راج نہیں کرتے۔ خواب کی زیادہ زندگی ہوتی ہے۔ خواب دکھانے والوں کی زیادہ زندگی ہوتی ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ خواب دینے والے انسان تھے۔ انہوں نے خواب دیا، اس لیے وہ آج تک زندہ ہیں۔

7- لیڈر

استاد کو ایک اچھا لیڈر ہونا چاہیے۔ اگر استاد لیڈ نہیں کرتا، خود مثال نہیں بنتا، اس کی

مثال بچوں کے سامنے نہیں ہے تو پھر بچے بھی مثالی نہیں بنیں گے۔ لیڈر وہ ہوتا ہے جو Lead کرتا ہے جو سب کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ وہ انجن ہوتا ہے باقی سب ڈبے ہوتے ہیں۔ اگر کسی کی زندگی میں استاد آئے اور فرد وہیں کا وہیں رہے تو اس کا مطلب ہے کہ استاد نہیں ہے۔ استاد تو انسان کو کہیں اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس ملک میں فزکس، کیمسٹری پڑھانے والے بہت ہیں، مگر متاثر کرنے والے بہت کم ہیں۔ جس دن استاد متاثر کرنے والا ہوگا تو اس ملک میں انقلاب آئے گا۔ انقلاب یوں ہی نہیں آتا۔ تمام محکمے، تمام شعبے استاد بناتا ہے۔ یہ واحد پروفیشن ہے جس کے پاس کسی بچے نے پڑھ کر پولیس والا بننا ہے، کسی نے سائنس دان بننا ہے، کسی نے آرمی میں جانا ہے، کسی نے جج بننا ہے، کسی نے استاد ہی بننا ہے، کسی نے پروفیسر بننا ہے... کہیں نہ کہیں جانا ہے۔ اگر یہ ٹھیک ہوگا تو جو اس کے پاس آئے گا پھر وہ کمال کا بنے گا۔

استاد کا احترام

اگر آپ اچھے اساتذہ کا احترام کرتے ہیں تو آپ کے دیکھا دیکھی اور لوگ بھی احترام کرنے لگتے ہیں۔ آج ہم نے ساری روایات کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ایک استاد ہیں۔ ان کے پاس پڑھنے جاؤ تو وہ اپنے اسٹوڈنٹ کو پیار دیتا ہے۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔ میری جب پہلی بار ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بچوں نے ادب سے استاد کے ہاتھ چومے۔ مجھے بڑی تکلیف ہوئی اور بڑا عجیب سا لگا۔ وقت گزرا۔ میں ان سے پڑھنے لگا۔ ان کی شفقت، محبت کمال کی تھی۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ وقت دیتے۔ وہ دوسروں کو بھی ملا دیتے تھے۔ جب سمجھ آیا تو میں یونیورسٹی میں ٹاپ پوزیشن میں تھا۔ میں [illegible] لے کر گیا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ میں نے بے اختیار ان کے ہاتھ چوم لیے۔ مجھے اس دن پتا لگا کہ احترام ہوتا کیا ہے جو دل سے نکلے۔

جب بچوں کو کہا جاتا ہے کہ استاد کا ماں باپ کا احترام کیا کرو، ان کا احترام کبھی بھی دل سے نہیں ہوتا۔ اگر دل میں احساس ہوگا تو احترام بھی ہوگا۔ ہم نے سب سے بڑی زیادتی یہ کی ہے کہ ہم نے استاد کے احترام کو خود ختم کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج استاد اچھی سے اچھی بات کہتا ہے، وہ بات دل پر اثر نہیں کرتی کیونکہ استاد دل میں رکھنے کے قابل نہیں لگتا۔ جس دن استاد ہمارے لیے معتبر ہوگا، اس کی بات بھی قابل اعتبار ہوگی۔

استاد ایک قائد

استاد ایک ٹرین کے انجن کی طرح ہوتا ہے۔ اس میں درج ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

1- منزل تک لے کر جانا

انجن ٹرین کو منزل تک لے کر جاتا ہے۔ جسے خود منزل کا نہیں پتا، وہ منزل پر نہیں لے کر جا سکتا۔ اگر آپ کو اپنی منزل کا پتا نہیں ہے تو پھر آپ جن بچوں کو پڑھا رہے ہیں، ان کی بھی کوئی منزل نہیں ہوگی۔ جس انسان کو اپنی منزل کا پتا ہے، وہ اپنا کام عبادت کی طرح کرے گا۔ جو بچہ آپ کے پاس پڑھنے کیلئے آیا ہے، قرآن و حدیث کے مطابق اس کی تربیت کیجیے۔ یہ آپ کی منزل ہے۔

2- آخری ڈبے کو بھی ساتھ لے کر چلنا

کلاس میں ایسے بچے ضرور ہوتے ہیں جو پڑھنے والے نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کو گھر کا ماحول پڑھنے والا نہیں ملتا۔ کچھ کو غصہ بہت آتا ہے۔ یہ سب آخری ڈبے ہوتے ہیں۔ لیڈر وہ ہوتا ہے جو آخری ڈبے کو بھی لے کر چلے۔ تپتی دوپہر میں مدینہ شریف کی گلیوں میں حضور اکرم ﷺ ایک ایسی عورت سے باتیں کر رہے تھے جو نیم پاگل تھی۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا، یارسول اللہ ﷺ، یہ تو پاگل ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر اس کی میں نہیں سنوں گا تو کون سنے گا؟" آپ ﷺ نے پاگل عورت پر بھی رحم فرمایا۔ حضرت قائد

اعظم محمد علی جناحؒ فرمایا کرتے تھے: "مجھے کھوٹے سکے چلانے آتے ہیں۔" لیڈر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ پوری ٹیم تیار کرتا ہے اور کھوٹے سکوں کو بھی چلاتا ہے۔ اگر آپ کھوٹے سکے چلا جاتے ہیں تو پھر آپ لیڈر ہیں۔

3- آگ خود کھاتا ہے دوسروں کو نہیں کھلانی پڑتی

آپ کبھی اپنی والدہ کی محنت اور کوشش دیکھیں کہ کس طرح انہوں نے آپ کو پالا اور یہاں تک پہنچایا۔ کبھی باپ کی محنت کو دیکھیں، کیسے محنت کر کے رزق حلال کماتا ہے اور آپ کے منہ میں حلال لقمہ ڈالتا ہے۔ اگر آپ ذمہ دار ہیں، تکلیف اٹھاتے ہیں تو آپ انمول ہیں۔ ایک صحابیؓ آپ ﷺ کی بارگاہ میں آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں، یارسول اللہ ﷺ، میں نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے۔ آپ ﷺ اپنا پیٹ مبارک دکھاتے ہیں۔ وہاں پر دو پتھر بندھے ہوتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ آپ خوشحال ہوں۔

4- متعین شدہ راستے پر چلنا

زندگی میں جو کرنا ہے اس کی پہلے منصوبہ بندی کیجیے۔ آپ جو چاہتے ہیں اسے آج ہی لکھ لیجیے۔ حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں، "کبھی اللہ تعالیٰ سے مانگنے لگو تو اپنی اوقات دیکھ کر نہ مانگنا، بلکہ اس کی شان دیکھ کر مانگنا۔" اگر آپ نے دس سال بعد کوئی چیز حاصل کرنی ہے تو اس کی منصوبہ بندی ہونی چاہیے، ورنہ یہ دس سال ضائع ہو جائیں گے۔ آپ دنیا میں کہیں چلے جائیں، اس سے بڑی خوبصورتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ پانچ بار کہا جاتا ہے "فلاح کی طرف آؤ۔" آپ کا تو راستہ ہی کامیابی کا راستہ ہے۔

5- خودداری

خودداری کا مطلب ہے، کسی کا محتاج نہ ہونا، آزاد ہونا۔ ویسے تو انسان اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے مگر یہ ہو کہ آپ اپنے ذہنوں کا محتاج ہو، بلکہ وہ آپ کے محتاج ہوں۔ اگر چھتی زمین

سے انجن کو ہٹا دیا جائے تو ڈبے پھر بھی چلتے رہتے ہیں، کیونکہ انجن نے رفتار اتنی پیدا کی ہوتی ہے کہ وہ کچھ دیر چلتے رہتے ہیں۔ جان میکسوئل نے لیڈر شپ پر تحقیق کی اور کہا کہ سچ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایک عام (فیکٹر) ایسا نہیں ہے جس پر کوئی بھی کمپنی، زندگی، ادارہ یا ملک قابل تعریف بن جائے۔ لیکن اگر آپ کو ایک چیز رکھنی پڑ جائے تو وہ ایک چیز ہے، لیڈر شپ! حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ''سو بھیڑوں کا لشکر ہو، اگر ان کی امامت شیر کر رہا ہو تو بھیڑیں خود کو شیر سمجھیں گی اور اگر سو شیروں کا لشکر ہو اور ان کی امامت بھیڑ کر رہی ہو تو شیر بھی بھیڑ بن جائیں گے۔'' دنیا میں وہ خاندان ترقی کرتے ہیں جن میں امام اچھے ہوتے ہیں۔

ہر انسان استاد نہیں ہوسکتا

80 فیصد اساتذہ ایسے ہیں جو اپنے علم سے ناانصافی کرتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس پڑھانے کی مہارت نہیں ہے۔ وہ حقیقی محقق نہیں ہیں۔ وہ کوشش نہیں کرتے، حوصلہ افزائی نہیں کرتے، مثبت نہیں ہیں۔ برتن سے نکلتا وہی ہے جو ڈالا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو فرد پڑھانے کیلئے لگایا جاتا ہے وہ قابل نہیں ہوتا۔ صرف پبلک سروس کا امتحان پاس کر لینے سے استاد نہیں بن جاتا۔

پڑھانے کا مطلب ہے، سکھانا، کلاس کو کنٹرول کرنا، کلاس کو اس طرح پڑھایا جائے کہ پانچ گھنٹے کا پتا ہی نہ چلے۔ یورپیوں کے بچوں کیلئے ان کا استاد ان کا رول ماڈل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں آج بھی رٹا سسٹم چل رہا ہے۔ جس کا رٹا سب سے اچھا ہوتا ہے، وہ گولڈ میڈل لیتا ہے۔ کوئی ذہانت نہیں۔ کوئی ای کیو نہیں ہے، کوئی صلاحیت نہیں ہے، مہارت نہیں ہے۔ ڈگریوں کے انبار لگے ہیں۔

ہمارے ملک میں انٹرن شپ عذاب ہے۔ اسے لوگ بددلی سے کرتے ہیں۔ کسی نے خوبصورت جملہ کہا ہے کہ آدمی کام سے تھکتا ہے، محبت سے نہیں تھکتا۔ جس کو کام سے محبت

ہے، وہ تھک ہی نہیں سکتا۔ اس دنیا میں تعلیم پر سب سے زیادہ کام اپنے ''رویے کی تعلیم'' پر ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا میں گریجویشن کے بعد بچہ اپنے مضامین تبدیل کر سکتا ہے۔ یہاں نہیں کر سکتا۔ وہاں ماسٹر کی ڈگری کے بعد ایم فل کسی دوسرے مضمون میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، اگر شوق ہے تو اسے پورا کیجیے۔

اچھے استاد کا پہلا راز

دنیا کا کوئی بھی طالب علم صرف فزکس، کیمسٹری یا دوسرے مضامین پڑھنے نہیں آتا۔ دراصل وہ ایک تعلیمی ادارے یا ایک استاد کے پاس اس لیے آتا ہے کہ استاد یا ادارہ اس کو یہ یقین دے دے کہ تم کچھ کر سکتے ہو۔ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے تمام کے تمام استاد بہت اچھا پڑھاتے ہیں، بڑی محنت کرتے ہیں لیکن بچے کو یقین نہیں دیتے۔ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ سب سے پہلا نمبر یقین کا آتا ہے، دماغ کا نہیں آتا۔ اگر آپ ایک بچے کو یقین دے دیتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ بیٹا، اگر آپ اپنی صلاحیت پر یقین کرو گے تو یہی صلاحیت آپ کو آسمان کی بلندیوں تک لے کر جائے گی تو آپ اس پر دنیا کا سب سے بڑا احسان کر دیتے ہیں۔

ایک اچھے استاد کو بچے کے اندر پہلے محنت کا یقین پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اسے کہنا پڑتا ہے کہ بیٹا، آپ اپنی محنت پر یقین کیجیے۔ جب بچے کو اپنی محنت پر یقین ہو جاتا ہے تو پھر اس کا پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ جب اس کا پڑھنے کو دل کرتا ہے تو پھر اسے پڑھنے کا کہنا نہیں پڑتا۔ اس کو کسی بیرونی سہارے یا موٹیویشن کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب اس کے اندر کی موٹیویشن اسے پڑھنے پر مجبور کرتی ہے تو پھر وہی عام سا بچہ لائق بچہ بن جاتا ہے۔

بچے کو دوسرا یقین خدا کی ذات کا دینا ضروری ہے کہ بیٹا، تم خدا پر یقین رکھو۔ اس کے کرم پر یقین رکھو۔ آج تک اس نے کسی کی محنت ضائع نہیں کی۔ جب بھی کوئی شخص آگے

بڑھنے کیلئے محنت کرتا ہے، کوشش کرتا ہے تو قدرت اس کی معاون ہو جاتی ہے۔ وہ اس کو دھکا لگانا شروع کر دیتی ہے۔ قدرت اس کیلئے راستہ بنانا شروع کر دیتی ہے۔ منزل اس کے انتظار میں ہوتی ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے، ''اللہ تعالی اس کا ساتھ ضرور دیتا ہے جو ثابت قدم ہے۔'' اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ یہ کام ضرور کیجیے۔ اسے فزکس پڑھائیں، کیمسٹری پڑھائیں، ریاضی پڑھائیں، تمام مضامین پڑھائیں لیکن سب سے بڑھ کر جو چیز آپ کو دینی ہے، وہ یقین ہے۔ اگر آپ اس کے اندر یقین پیدا کر دیتے ہیں تو پھر یقین کیجیے، آپ عام استاد نہیں رہتے۔ آپ ایک موثر استاد بن جاتے ہیں۔

اچھے استاد کا دوسرا راز

دنیا کے بہت کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ جب بھی آپ کو آگے بڑھنا ہے، آپ کو کسی مقام یا منزل پر پہنچنا ہوتا ہے تو آپ کیلئے بہت ضروری ہے کہ وہاں تک پہنچنے کا آپ کے پاس کوئی مقصد ہو۔ اگر آپ کی زندگی میں کوئی مقصد ہے تو پھر آپ عام انسان نہیں ہیں۔ آپ دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں۔ تحقیق یہ بتاتی ہے کہ دنیا کے ستانوے فیصد لوگوں کے پاس مقصد حیات نہیں ہوتا اور دنیا میں صرف تین فیصد لوگوں کے پاس مقصد حیات ہوتا ہے۔ یہ ایک فیصد لوگ پوری دنیا پر راج کرتے ہیں۔ یہی امیر ہوتے ہیں، یہی غیر معمولی ترقی کرتے ہیں، یہی اپنی فیلڈ میں ٹاپ پر چلے جاتے ہیں۔ ستانوے فیصد لوگ ساری زندگی ان تین فیصد کیلئے کام کرتے رہتے ہیں۔

اگر آپ بچوں کو مقصد دے دیتے ہیں تو پھر آپ عام استاد نہیں رہتے، مگر مقصد دینے کیلئے یہ ضروری ہے کہ آپ کے پاس بھی کوئی مقصد ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے آج کے استاد کے پاس کوئی مقصد نہیں ہے۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ آپ کیوں پڑھا رہے ہیں تو وہ جواب دیتا ہے، اپنا اور اپنے بچوں کو پالنے کیلئے۔ اس کے پاس چند پیسوں کا مقصد ہوتا

ہے۔ وہ اپنے جیب خرچ کیلئے اور اپنی زندگی گزارنے کیلئے ایک دہاڑی دار مزدور والی سوچ لیے گھر سے نکلتا ہے۔ اس لیے نسلوں کی تبدیلی اس کی تعلیم سے ممکن نہیں ہوتی۔

اگر آپ موثر استاد بننا چاہتے ہیں تو آپ کو سب سے پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا مقصد لائیے۔ اگر آپ زندگی میں مقصد لے آتے ہیں تو اس مقصد کا شعور آپ کے بچوں میں بھی جائے گا۔ جن انسانوں کو آپ اسکول میں، کالج میں، یونیورسٹی میں کسی بھی سطح پر پڑھا رہے ہیں انہیں مقصد سے روشناس کرائیے۔ انہیں بتائیے کہ زندگی بغیر مقصد کے حیوانوں کی زندگی ہے۔ انسان کی زندگی کا سب سے خوبصورت مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد تلاش کرے، پھر اس مقصد کیلئے کام کرے۔ جو انسان اپنے مقصد کیلئے تگ و دو کرتا ہے وہ اپنے مطلوبہ مقام و منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔

موثر استاد بننے کا راز یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی مقصد ضرور ہو۔ ساتھ ہی وہ بچوں کو بھی مقصد سے روشناس کرائے۔ وہ بچوں کو ٹارگٹ دے، چھوٹے چھوٹے ٹاسک دے تاکہ بچوں کو شروع سے عادت پڑ جائے کہ ہمیں زندگی کے صرف دن، ہفتے، مہینے اور سال پورے نہیں کرنے، بلکہ دن، ہفتے اور مہینوں کو کسی مقصد کے تحت گزارنا ہے۔

اچھے استاد کا تیسرا راز

دنیا کا ہر انسان ترقی کرنا چاہتا ہے، آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ آپ کسی سے انٹرویو لیں اور پوچھ لیں کہ کیا وہ ترقی کرنا چاہتا ہے؟ وہ طالب علم ہو، ماں ہو، باپ ہو، استاد ہو، بزنس مین ہو، اس کا زندگی کے کسی شعبے سے بھی تعلق ہو، وہ اعتراف کرے گا کہ وہ ترقی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اسے ترقی کے سب سے بڑے راز کا پتا نہیں ہوتا۔ وہ راز یہ ہے کہ دنیا میں ترقی صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ چلنے والے ہوتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک فرد کے ساتھ نہیں چلتے، بڑی ٹیم بنا کر کیسے چلیں گے۔ ہم تعلق توڑنے پر آتے ہیں تو اپنے سگے بہن بھائیوں سے تعلق توڑ دیتے ہیں۔ ہمیں واسطہ پڑ جائے تو ہم والدہ سے ناراض ہو جاتے

ہیں۔ ہمیں ساتھ چلنا پڑ جائے تو ہمیں اپنے والد صاحب ہی اچھے نہیں لگتے۔ ہم اپنے خاندان کو، اپنے گھر کو، اپنی فیملی کو، اپنے رشتے داروں کو، اپنے محلے داروں کو، اپنے علاقے کو، اپنے شہر کو اور اپنے ملک کو ساتھ لے کر نہیں چل سکتے تو پھر ہم ترقی کیسے کر سکتے ہیں۔

اگر ایک شخص ایک بڑی فیکٹری چلا رہا ہے اور اس فیکٹری میں تین ہزار ملازم ہیں تو تین ہزار ملازموں کو چلانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ان تین ہزار ملازمین کو ساتھ لے چل سکتا ہے۔ اگر آپ کو ساتھ چلنا آتا ہے تو پھر آپ ایک مؤثر استاد بن سکتے ہیں۔ آپ دوسروں کے کام آتے ہیں، آپ معاوضے کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ آپ یہ دیکھتے ہیں کہ میری یہ ساری محنت بچوں پر نہیں بلکہ اپنی ذات پر ہے اور یہ تمام ساتھ دراصل میری کامیابی ہے۔ یہ مجھے آگے لے کر جا رہا ہے تو یقین کیجیے، کامیابی آپ کے قدم ضرور چومے گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ بچے دیکھتے ہیں کہ ہمارے اساتذہ ہمیں ساتھ لے کر نہیں چلتے۔ وہ ہمیں چھوٹے چھوٹے ہوم ورک پر ذلیل کرتے ہیں، خراب کرتے ہیں۔ ان کا جی ہی نہیں کرتا کہ وہ اپنے استاد کی عزت کریں۔ وہ صرف نمبروں کی وجہ سے اپنے استاد کا احترام کرتے ہیں، لیکن دل سے احترام نہیں کرتے۔ احترام اور محبت ہمیشہ دل سے ہوتی ہے۔ انسان کبھی ایسے فرد کے ساتھ چلنا نہیں چاہتا جو کسی دوسرے کے کام آنا نہیں جانتا۔ یہی مزاج ہمیں معاشرے میں نظر آتا ہے۔ یہی بچے کل بڑے ہوتے ہیں، پولیس مین بنتے ہیں، استاد بنتے ہیں، پروفیسر بنتے ہیں، سائنسداں بنتے ہیں... جہاں بھی نظر آتے ہیں، ساتھ چلنے والے نہیں ہوتے۔ جب ہم پیچھے جا کر دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ انھیں دورِ طالبعلمی میں ایسا مزاج ملا ہوتا ہے۔

اچھے استاد کا چوتھا راز

آپ دنیا کی مرتبہ تاریخ نکال کر دیکھیں تو آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ تاریخ انسانی میں دنیا کے کامیاب ترین لوگ، مؤثر ترین لوگ، دنیا کے کامیاب ترین استاد، کامیاب ترین دانشور، وہ اصل کردار والے لوگ تھے۔

آج کا استاد... اس کے پاس مضمون ہے، فزکس ہے، کیمسٹری ہے، یادداشت ہے، ڈگری ہے، پروفیسر ہے، لیکن اس کے پاس کردار نہیں ہے۔ جب کردار نہیں ہوتا تو زندگی بھی تھوڑی ہو جاتی ہے۔ یہ اس زندگی کی بات ہے جو بڑے اساتذہ کو ملتی ہے۔ سقراط زہر کا پیالہ سامنے رکھتا ہے، مسکراتا ہے۔ اس کے پاس کھڑا شخص پوچھتا ہے، تم مرنے لگے ہو اور مسکرا رہے ہو؟ وہ کہتا ہے، نہیں میری زندگی بہت زیادہ ہے کیونکہ میری زندگی یہ نہیں ہے، میری زندگی تو میرے افکار کی زندگی ہے، میری سوچ کی زندگی ہے، میرے کہے جملوں کی زندگی ہے، وہ تمام درس جو میں نے ان سڑکوں پر، ان چوراہوں میں، ان اسکولوں میں دیے تھے، یہ کئی ہزار سال پڑھائے جائیں گے۔ آج دنیا میں فلسفے کا کوئی طالب علم ممکن ہی نہیں کہ فلسفے کی ڈگری سقراط کو پڑھے بغیر لے سکے۔ یہ کمال ہوتا ہے ایک بڑے استاد کا۔

جب بھی کردار ہوگا، زندگی بڑھ جائے گی۔ یہی راز، یہی دانش، یہی فہم جب حضرت بابا بلھے شاہ کو سمجھ آتا ہے تو وہ ایک چھوٹا سا مصرع کہہ دیتے ہیں، "بلھے شاہ، اسی مرنا نہیں... گور پیا کوئی ہور۔"

اچھے استاد کا پانچواں راز

ہمارے ملک میں ڈگریوں کی بھرمار ہے، پروفیسروں کی بھرمار ہے، استادوں کی بھرمار ہے، لیکن جب آپ ڈھونڈنے جاتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس پڑھانے کی صلاحیت کتنی ہے تو آپ حیران ہوتے ہیں۔ ان کے پاس پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تو ہوتی ہیں، وہ ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں، پروفیسر بھی ہوتے ہیں، انہوں نے ماسٹر بھی کیا ہوتا ہے لیکن ان میں پڑھانے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ کیا عجیب بات ہے کہ آپ کشتی ایسے ملاح کے حوالے کر دیں جو کشتی چلانا ہی نہ جانتا ہو۔ کیا عجیب ہے کہ آپ ایک الماری بنانا چاہیں اور کارپینٹر کہے کہ میں ہوں تو کارپینٹر لیکن الماری نہیں بنا سکتا۔ کیا عجیب ہے کہ ایک ڈاکٹر کے پاس آپ جائیں، وہ کہے کہ ڈگری میرے پاس ہے، لیکن میں دوائی نہیں دے سکتا

کیوں کہ مجھے پتا ہی نہیں ہے کہ کیسے دوائی لکھی جاتی ہے۔ کیا عجیب ہے کہ آپ کسی ایسے فرد کے پاس چلے جائیں جو لوہے کا کام کرتا ہو، لوہار ہو، وہ کہے ہوں تو میں لوہار، لیکن مجھے لوہے کا کام نہیں کرنا آتا۔ گویا، ہمارے ہاں جتنے پیشے، جتنے شعبے موجود ہیں، اس کے ایکسپرٹ نہیں ہیں۔

ہمارے ملک کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ کو یہ راز ہی نہیں پتا کہ جب تک ان کے پاس بولنے کی صلاحیت نہیں ہے، ان کو اپنی بات سمجھانی نہیں آتی، ان کو اپنی بات منتقل کرنی نہیں آتی، ان کا لب و لہجہ ایک بڑے استاد والا نہیں ہے، ان کا انداز بیاں ایک اچھے استاد والا نہیں ہے، انہوں نے اپنی آواز پر، اپنی باڈی لینگویج پر کام نہیں کیا، انہوں نے سیکھا نہیں کہ کس طرح سمجھایا جائے، انہوں نے دیکھا نہیں ہے کہ کیسے کام کیا جائے تو بات بچوں کے دل میں اتر جاتا ہے، انہیں یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ اگر بات سمجھانے کی صلاحیت کا پتا ہو تو پھر گھنٹوں کا لیکچر منٹوں کا بن جاتا ہے۔ یہ اگر انہیں نہیں پتا ہوتا تو پھر ہوتا یہ ہے کہ اساتذہ کے لیکچر بور ہوتے ہیں، کلاسوں میں بیٹھے ہوئے بچوں کو نیند آتی ہے، پروفیسر پڑھا رہا ہوتا ہے، بچے اپنے موبائل نکال کر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے کہ آج کے استاد کو انگیج کرنا نہیں آتا۔ جب بھی آپ کو جوڑنا آتا ہوتا ہے تو آپ عام استاد نہیں رہتے، آپ موثر استاد بن جاتے ہیں۔

اچھے استاد کا چھٹا راز

اگر کسی استاد سے پوچھا جائے کہ آپ کیوں پڑھا رہے ہیں تو عموماً یہ جواب ملتا ہے کہ میرے کچھ دن گزر جائیں۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ وہ جواب دیتا ہے، مجھے اس کی خبر نہیں ہے۔ جس استاد کے پاس ویژن ہی نہیں ہے، اس کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس کی آج کی محنت کتنی نسلوں کو متاثر کر سکتی ہے، جس کے پاس خواب ہی نہیں ہیں کہ یہ چھوٹا سا لوز ار جسے آپ پڑھانا کہہ رہے ہیں، جس کو ہمارے معاشرے میں بہت

کھوٹا سا کام سمجھا جاتا ہے، قوموں کو بناتا ہے، نسلوں کو بناتا ہے، آنے والی نسلوں کو سنوارتا ہے یا بگاڑتا ہے۔

پولس نے کہا تھا: ''اگر ایک استاد ایک نسل کو پڑھا لے، دوسری کو پڑھا لے، تیسری کو بھی پڑھا لے تو اس کے بعد اسے گولی مار دینی چاہیے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جو تین نسلوں کو متاثر کر دے، درا صل وہ تین نسلوں کو متاثر نہیں کرتا، وہ کئی زمانوں کو متاثر کرتا ہے۔ معذرت کے ساتھ، ہمارا استاد ایک نسل کو بھی متاثر نہیں کر پا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ویژن ہی نہیں ہے۔ اسے اپنی محنت پر یقین ہی نہیں ہے۔ شاید ایک خودکش حملہ آور سو انسانوں کی جان لے لیتا ہے، لیکن اگر ایک استاد موثر اور قابل نہیں ہے تو وہ سو نسلوں کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ لوگ استاد سے پڑھنے آتے ہیں، وہ رٹے لگواتا ہے۔ لوگ اس سے علم لینے آتے ہیں، وہ نشان لگواتا ہے کہ یہاں سے لے کر یہاں تک یاد کر لو۔ وہ اپنے مضمون سے باہر جا ہی نہیں جاتا۔ اس کے پاس نہ زندگی ہوتی ہے اور نہ وہ زندگی دے سکتا ہے۔ اس کے اندر کوئی رنگ ہوتا ہے اور نہ بچوں کے اندر رنگ بھر سکتا ہے۔ ایک لاش کی مانند کلاس میں آنا، کام کرا دینا اور گھر چلے جانا... یہ تعلیم نہیں ہے۔

ویژن والا انسان ہمیشہ زندہ انسان ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ جذبے والا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک بجلی سی دوڑ رہی ہوتی ہے اور یہی بجلی وہ بچوں کو، اگلی نسلوں کو منتقل کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، میں کافی نہیں ہوں، میری طرح کے کئی لوگ چاہئیں۔ وہ اپنے علم کو، اپنی عقل کو، اپنے شعور کو دوسروں میں شامل کرنا شروع کرتا ہے۔ وہ اتنا کمال کا انسان ہوتا ہے کہ وہ شکر گزار بن جاتا ہے اور شکر گزاری کی سب سے بہترین تعریف یہ ہے کہ ''آپ کو جو اللہ تعالیٰ دے، آپ اگر اس میں دوسروں کو شامل کرنے لگ پڑیں تو آپ شکر گزار انسان ہیں۔''

اگر آپ کے پاس رزق ہے اور وہ آپ خود ہی کھاتے جا رہے ہیں تو پھر آپ شکر کے اگلے درجے پر نہیں ہیں۔ آپ اپنے رزق میں تھوڑا سا حصہ دوسروں کو دینا شروع کر دیں۔

عملی شکر ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے۔ آپ اپنا علم دوسروں کو دینا شروع کیجیے۔ یہ آپ کے علم کا عملی شکر ہے۔ المیہ یہ ہے کہ آج کے استاد کے پاس مسئلے ہی اتنے ہیں کہ وہ علم بانٹنے کی بجائے رزق کی فکریں بانٹ رہا ہے۔ وہ پورا سال بچے کو ڈراتا رہتا ہے اور کہتا رہتا ہے کہ کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پریشانیاں، فکریں، ڈپریشن بچوں کو تقسیم کرتا رہتا ہے۔ پھر وہی بچہ کل کو محروم باشندہ بن کر معاشرے کا محروم فرد بن جاتا ہے۔ پاکستان کو ایک اور محروم فرد مل جاتا ہے۔ پھر ہم اس سے توقع لگاتے ہیں کہ وہ اقبال کا شاہین بنے۔ بھلا، وہ کیسے اقبال کا شاہین بنے گا۔

اچھے استاد کا ساتواں راز

آپ کسی اچھی سی بیکری میں جاتے ہیں تو آپ وہاں جا کر دیکھتے ہیں کہ ایک اچھا سا کیک رکھا ہے۔ آپ اسے کھاتے بعد میں ہیں، سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کتنا خوب صورت ہے۔ یہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے، دیکھنے سے اندازہ کرتے ہیں کہ یہ بڑا ذائقہ دار ہوگا۔ آپ پیسے دیتے ہیں اور کیک اٹھا کر گھر لے آتے ہیں۔ اس کی نفاست بتاتی ہے کہ کیک اچھا ہے، ذائقے دار ہے۔ یہ بعد کی بات ہے کہ اچھا لگتا ہے یا نہیں۔ سب سے پہلے ہماری آنکھ دیکھتی ہے کہ وہ چیز اچھی ہے یا نہیں۔ کیک کی طرح ہمیں بھی لوگ اس طرح دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

آج کے استاد کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ دیکھنے میں ہی اچھا نہیں لگتا۔ وہ اپنے حلیے سے، اپنے لباس سے، اپنے انداز سے، اپنے جوتوں سے، اپنے اٹھنے بیٹھنے سے، اپنے کھانے پینے کے انداز سے استاد نہیں لگتا۔ دنیا کے مؤثر ترین انسان مہذب لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں کھانے کی تمیز ہوتی ہے۔ انہیں پہننے کی تمیز ہوتی ہے۔ انہیں چلنے کی تمیز ہوتی ہے۔ انہیں بات کرنے کی تمیز ہوتی ہے۔ آپ بھی یہ چیزیں اپنی زندگی میں شامل کر کے

دیکھئے، لوگ آپ سے محبت کرنے لگیں گے۔ لوگ آپ کے پاس بیٹھنا چاہیں گے۔ لوگ آپ کے ساتھ وقت گزارنا چاہیں گے۔ لوگ اس خواہش کا اظہار کریں گے کہ آپ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں۔ لوگ آپ کا تذکرہ اچھے انداز میں کریں گے۔

آج کے استاد کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک بہترین کاٹن کا سوٹ پہنتا ہے اور نیچے جوگر پہن لیتا ہے۔ بچوں کو وہ فٹ بال کا کھلاڑی زیادہ لگتا ہے۔ ایک موثر استاد نہیں لگتا۔ بچے نے مضمون بعد میں پڑھنا ہے، پہلے اپنے استاد کا حلیہ دیکھنا ہے۔ یقین کیجیے، صرف کلاس روم ہی میں نہیں، استاد کہیں جا رہا ہو، کسی محفل میں ہو، حتیٰ کہ بازار میں سودا سلف لے رہا ہو، وہ اگر اچھا استاد ہے تو اپنی چال ڈھال سے بتا دیتا ہے کہ وہ استاد ہے۔

اگر آپ کے چھوٹے چھوٹے معاملات اچھے ہیں، عمدہ ہیں تو آپ موثر انسان ہیں۔ اگر آپ موثر انسان ہیں تو موثر استاد بھی ہیں۔ کئی سال بعد جب بچے بڑے ہو جائیں گے وہ آپ کو یاد ضرور رکھیں گے۔ وہ مذکرہ دیکھیں گے۔ وہ مہذب انسانوں کی فہرست میں آپ کو کھڑا کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ واقعی ایک انسان ملا تھا جو بہت زیادہ شائستہ تھا۔



حکمت و دانائی

"دانائی آپ کی ٹھہراؤ اور سکوت کی صلاحیت سے آتی ہے۔ بس، دیکھئے اور سنئے۔
آپ کے الفاظ اور حرکات آپ کے ٹھہراؤ کے تابع ہوں!"

ایکہارٹ ٹولے

زندگی کی اہمیت

زندگی کو جتنی اہمیت دینی چاہیے، ہم اسے اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ سب سے قیمتی چیز زندگی ہے۔ لوگ دس روپے کی خاطر دس دس گھنٹے لڑتے نظر آتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ پانچ گھنٹے واپس نہیں آ سکتے۔ عدالتوں میں چلے جائیں، ساٹھ فیصد مقدمات ایسے ملیں گے جو بیٹھ کر حل ہو سکتے تھے لیکن وہ پولیس، وکیل اور عدالت کی نظر ہو گئے۔ جیلوں میں بے شمار ایسے قیدی ملیں گے جن کے کیس حقیقتاً کیس تھے ہی نہیں۔ وہ کیس بننا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ جرم ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ غلطی سرزد ہی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ لیکن انہوں نے زندگی کو اہمیت نہیں دی، اس لیے انہیں قید کا سامنا کرنا۔ اگر آپ زندگی کو اہمیت نہیں دیتے تو پھر جو بھی چیز ہو اور اس کی قدر نہ ہو تو اس کے ہونے کا، اس کی موجودگی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

دن میں کئی بار زندگی کو محسوس کیجیے۔ ایک کتاب Power of Now ہے۔ اردو میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ لمحے کی طاقت، وہ لمحہ جو آپ اس وقت گزار رہے ہیں۔ اس کتاب کا سارا فلسفہ یہ ہے کہ کسی بھی طرح لمحہ موجود کو محسوس کیجیے۔ کتاب کے مصنف [illegible] سے سوال کیا گیا کہ کیسے محسوس کریں؟ وہ جواب دیتے ہیں [illegible]

کچھ ہو رہا ہے، اسے قبول کیجیے۔ دوم، اسے تھوڑی دیر کیلئے تبدیل کرنے کی تمنا ختم کر دیجیے۔ سوم، جو کچھ ہو رہا ہے، اسے قبول کرنا سیکھیے۔

یہ کہنا تو بڑا آسان ہے، مگر عملی طور پر کرنا بڑا مشکل ہے۔ احساس وہ ہے جو آپ لمحہ موجود میں محسوس کرتے ہیں۔

دماغ کا اپنا دماغ کوئی نہیں ہوتا۔ اس کو جس طرف لگا دیں، یہ لگا رہتا ہے۔ جب آپ اسے فرضی خوشی دیتے ہیں تو یہ اگلے ہی لمحے فرضی خوشی کو اصلی خوشی سمجھ لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب آپ مثبت ہوتے ہیں تو ساری مثبت چیزیں آپ کی طرف آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب آپ منفی ہوتے ہیں تو ساری منفی چیزیں آپ کی طرف کھنچنا شروع ہو جاتی ہیں۔

زندگی ایک بار ملی ہے، اس لیے جینے کا حق ادا کیجیے۔ اس زندگی کو محسوس کر کے شان دار بنا کر جائیے۔ جو شخص کہتا ہے کہ میں کل سے کروں گا، اس کا شان دار لمحہ کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی کبھی شان دار نہیں ہو پاتی۔ اسی لمحے سے شروع کیجیے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں، ''دنیا کے کتنے لوگوں کا کل آتا ہی نہیں ہے۔'' جس کا آج نہیں، اس کا کل بھی نہیں ہے۔ آج کے لمحے میں رہتے ہوئے یقین کر لیجیے کہ یہ جذبات، یہ چیزیں، یہ لمحات دوبارہ نہیں آنے۔

زندگی کا سبق

ہر آدمی، ہر مرد و زن اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مجھے نہیں مرنا، دوسروں کو مر جانا ہے۔ یہ حادثہ، یہ واقعہ، یہ سانحہ جو کسی دوسرے کے ساتھ ہوا ہے، میرے ساتھ نہیں ہوگا۔ یہ ایک واہمہ ہے جو تقریباً ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ ایک ایسا دن بھی ضرور آتا ہے جس دن ہم نے چلے جانا ہے، جس دن ہم زمین سے چار پانچ فٹ نیچے ہوں گے، جس دن ہمارا دنیا میں وجود نہیں ہوگا، جس دن ہمارا دنیا میں کوئی تذکرہ نہیں ہوگا۔ کتنے ہی ماہر فن، کتنے ہی طرم خاں ایسے ہیں جنہیں آج کوئی نہیں جانتا، مگر وہ اپنے وقت کے بڑے نام تھے۔ ہم بھی اپنے بڑوں کو نہیں جانتے۔ ہمیں اپنی تاریخ کا بھی نہیں پتا۔ ہم کل کی باتیں تو جانتے ہیں، مگر سو سال پہلے جو

قبرستانوں میں دفن ہو گئے، آج ان کے نام تک کا بھی نہیں معلوم۔ انسان اتنا چھوٹا ہے کہ پوری کائنات میں ایک زمین، اس زمین میں ایک ملک، ایک ملک میں ایک صوبہ، ایک صوبے میں ایک شہر اور ایک شہر میں ایک انسان... یہ ہے اس کی Value کہ اسے دفن ہونے کیلئے چھ فٹ زمین چاہیے۔ اس کے بعد مٹی، گرد و غبار... ہفتے، مہینے، سال، صدیاں گزر جاتی ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پھر اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی ہوتے تھے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ جب کسی کو پتا ہی نہیں ہوتا۔ کس قدر بے بسی ہے۔

کھربوں سال کا فاصلہ ہے۔ جب انسان پیدا نہیں ہوا تھا، پھر نا معلوم کتنے کھرب سال کا فاصلہ ہے۔ پھر وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ مرے گا۔ پھر، نامعلوم کتنے ہزار سال کا فاصلہ ہے کہ جب اسے اٹھایا جائے گا۔ اس کے درمیان اس کی مختصری زندگی ہے۔ اس مختصری زندگی میں ایک بچپن ہوتا ہے جس میں ہمارے کھیل ہوتے ہیں، جس میں کاغذ کی کشتی ہوتی ہے، جس میں گڑیا کی شادی ہے، جس میں ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہوتے ہیں، جس میں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہم خوش ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے ایک کینڈی بھی بہت ہوتی ہے۔ آخر کار، ہم بڑھنے لگتے ہیں۔ پھر بڑے ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی ہماری زندگی میں شعور آ جاتا ہے۔ جیسے ہی شعور آتا ہے، شعوری زندگی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ شعور سے پہلے زندگی نہیں ہوتی، وہ تو ایک لاعلمی ہوتی ہے، کیونکہ شعور نہیں ہوتا۔ شعور کے آنے کی پہلی پہچان یہ ہے کہ شعور آتے ہی انسان پوچھتا ہے کہ میں دنیا میں کیوں آیا ہوں۔ اس سوال کا تعلق نہ عمر کے ساتھ ہے، نہ بال سفید ہونے کے ساتھ ہے، نہ اسکول و کالج کے ساتھ ہے۔ یہ سوال کبھی بھی اٹھ سکتا ہے۔ دنیا کی کسی مخلوق میں یہ سوال نہیں اٹھتا۔ صرف انسان وہ واحد مخلوق ہے جس کے دل میں یہ سوال اٹھتا ہے۔ ایک دانشور کہتا ہے کہ ذرا سوچئے کہ تخلیقِ انسانی سے پہلے انسان بنانے والے "خالق" کے خیال میں تھا، پھر اس کی تخلیق کی... اور یہ جان جائے کہ میں قیمتی ہوں، دوسری مخلوقات سے بہت افضل ہوں،

دوسری مخلوقات کا میں سردار ہوں، وہی اشرف المخلوقات کہلانے کا حق دار ہے۔ شعور یہ بتاتا ہے کہ ہم عام مخلوق نہیں ہیں۔ ہم بڑے انسان ہیں۔ ہم بڑے کام کیلئے آئے ہیں۔ دنیا میں صرف پیدا ہو جانا اور مر جانا زندگی نہیں ہے۔ جب یہ بات حضرت علامہ اقبال کو سمجھ آئی تو وہ فرماتے ہیں، ''تقدیر کے پابند ہیں حیوانات و نباتات... مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند!'' تقدیر تو نباتات کیلئے ہے۔ انسان تو تقدیر لکھنے والا ہے۔ کائنات کے اس نظام میں اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھتا کہ ہم غریب ہیں، کس کے بیٹے ہیں، کالے ہیں، گورے ہیں، ذات کیا ہے، برادری کیا ہے۔ وہ صرف ایک چیز دیکھتا ہے کہ جو دستک دے رہا ہے، جو کوشش کر رہا ہے، جو محنت کر رہا ہے، جو آنسو بہا رہا ہے، جو خون پسینا ایک کر رہا ہے، اس کیلئے وہ حرکت میں آ جاتا ہے۔ قوانین انسان کیلئے ہیں۔ جب کوئی دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو پھر وہ چمکتا ہے۔ پھر محنت میں مل کر ہیرا بن جاتا ہے۔

زندگی کو محسوس کیے بغیر گزر جانا

جنت کا آغاز دنیا ہی سے ہو جاتا ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے کسی نے پوچھا کہ جنتی دروازے دنیا میں نہیں ہوتے۔ انہوں نے جواب دیا، جس کی دنیا میں نیت، ارادہ اور عادات جنتی والی نہیں ہیں، وہ آگے کیسے جنت میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں نے دنیا میں جن نعمتوں سے تمہیں نوازا تھا، کیا وہ تیرا حق تھا؟ وہ تو تیرا حق نہیں تھا۔ اگر وہ تیرا حق نہیں تھا تو پھر دنیا تیرے لیے تو جنت تھی۔ تو نے جنت کو جہنم خود بنایا۔ تو نے قدر نہیں کی، احساس نہیں کیا، زندگی کو محسوس نہیں کیا، زندگی کو ضائع کیا، زندگی کو بےکار کر دیا۔

آپ کسی اچھی بیکری میں جائیں اور وہاں سے ایک ہزار روپے کا اچھا کیک لیں اور اپنے قریبی دوست کے پاس اس کے گھر جائیں اور اسے گفٹ کے طور پر پیش کریں۔ یہ ہزار روپیہ آپ کیلئے ہزار روپیہ نہیں رہے گا۔ وہ تحفے میں بدل جائے گا۔ [illegible] خلوص اور محبت کی چاشنی بھی شامل ہو جائے گی۔ وہ دوست آپ سے انتہائی محبت کے ساتھ پیش آئے

گے۔ وہ آپ سے کہے گا کہ یہ تکلف آپ نے کیوں کیا؟ لیکن، اگر اگلے ہی لمحے وہ آپ کا دیا ہوا کیک اٹھائے اور زمین پر پھینک دے تو؟ ایک لمحے کیلئے سوچئے کہ آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟ بات ہزار روپے کی نہیں ہے، بات آپ کے خلوص، چاہت اور تحفے کی ہے۔ اسی طرح کائنات کے مالک نے زندگی بھی تحفے کی شکل میں ہمیں دی ہے۔ سوچئے کہ ہم زندگی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ آپ ایک لمحے کیلئے کسی ہسپتال میں جائیں۔ وہاں لوگوں کی چیخیں جاری ہوتی ہیں۔ آپ ان سے پوچھیں کہ کیا ہوا؟ وہ جواب دیں گے کہ بس وقت پورا ہو گیا تھا۔ وقت پورا ہو جائے تو انسان میت ہے۔ پھر صدیوں کا فاصلہ ہے۔ نام مٹ جائے گا، ہر چیز مٹ جائے گی، وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

آپ کے پاس کائنات کا سب سے بڑا خزانہ یہ زندگی ہے۔ آپ اسے محسوس کیجیے۔ اگر آپ کے پانچ روپے کسی نالی یا گٹر میں گر جائیں تو آپ یہ نکال لیں گے اور اس کی قدر کریں گے۔ اگر زندگی کا دن ضائع ہو جائے تو اس کی قدر ہی نہیں کی جاتی۔ یہ زندگی، اس کا ایک ایک لمحہ اللہ کی امانت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہمارے اوقات سے زیادہ دیا ہے۔ ایک لمحے کیلئے سوچئے اور وہ زندگی جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے، اسے محسوس کیجیے۔ غور کیجیے کہ ہم اپنی زندگی کے ساتھ کیسے پیش آ رہے ہیں۔ یہ ہمارا بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو محسوس نہیں کرتے، یہ گزرتی جا رہی ہے۔

واقعات کے معانی

سقراط جب چھوٹا تھا تو وہ ایک راستے پر چل کر جایا کرتا تھا۔ راستے میں ایک کمہار تھا جو مٹی سے برتن بناتا تھا۔ سقراط روز راستے میں بیٹھ کر بڑے آرام سے اس کمہار کو غور سے دیکھتا تھا۔ ایک دن کمہار نے اسے اپنے پاس بلا لیا اور پوچھا بیٹا، "تو روز یہاں سے گزرتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے؟ مجھ تو ہے جو تو دیکھتا ہے۔" سقراط نے جواب دیا، "میں کچھ سوچتا رہتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ آپ اپنے ہاتھوں سے جو کچھ بناتے ہیں، ان کے بارے میں میرے

چھوٹے چھوٹے کچھ سوال ہیں۔ کمہار نے کہا کہ سوال پوچھو۔

سقراط: یہ جو تم بناتے ہو، پہلے کہاں بنتا ہے؟

کمہار: پہلے یہ میرے خیال میں بنتا ہے۔

سوال: بابا مجھے سمجھ آ گیا۔

کمہار: کیا سمجھے؟

سقراط: ہر چیز تخلیق سے پہلے خیال میں بدلتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ خالق کے خیال میں ہم کہیں بن چکے تھے، تخلیق بعد میں ہوئی۔

سقراط: جب آپ یہ بنا رہے ہوتے ہیں تو برتن میں ایسا کیا ڈالتے ہیں کہ یہ اتنا خوبصورت بن جاتا ہے؟

کمہار: میں اس میں اپنی محبت ڈالتا ہوں۔ جو چیز بنا رہا ہوتا ہوں، اس میں میرا پورا خلوص، میری پوری صلاحیتیں شامل ہوتی ہیں، کیونکہ یہ میری پہچان ہے۔

سقراط: مجھے سمجھ آ گیا بابا۔ جو بنانے والا ہے وہ ہم سے بڑی محبت کرتا ہے کیونکہ اس نے ہمیں بنایا ہے۔

سقراط: یہ برتن نہیں معلوم تم کب سے بنا رہے ہو۔ کوئی خواہش ہے تمہاری جو تمہارے دل میں ہو کہ پوری ہو؟

کمہار: میں ایک ایسا برتن بناؤں کہ بس دنیا عش عش کر اٹھے۔ میں پھر ویسا برتن نہ بنا سکوں۔

سقراط: مجھے سمجھ آ گیا کہ بنانے والا ایسی تخلیق کرتا ہے کہ دنیا عش عش کر اٹھتی ہے کہ دنیا میں اس شخص کے بعد کوئی اس جیسا نہیں آئے گا۔

صاحبان عقل و فہم اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے معانی نکال لیتے ہیں، کیوں کہ ہماری زندگی کے ہر واقعے میں اللہ نے ہمارے لیے عقل کے

بڑے بڑے سبق پوشیدہ رکھے ہیں۔

شعور کی بلندی

شعور کوئی چھونے والی چیز نہیں ہے۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا ہے۔ وقت آتا ہے تو یہ ایکٹیو ہو جاتا ہے۔ یہ اظہار شروع کر دیتا ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے تو ایک وقت کے بعد مردانگی، بلوغت کی شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہے۔ آواز بدل جاتی ہے، ہارمونز بدل جاتے ہیں، چہرے پر بال آنے لگتے ہیں۔ اسی طرح شعور ایک خاص وقت کے بعد پروان چڑھتا ہے تو انسان کے اندر سے جیسے بلوغت پھوٹتی ہے، ویسے ہی شعور پھوٹ پڑتا ہے۔ اچھی قسمت یہ ہوتی ہے کہ شعور موروثی طور پر اچھال جائے۔ بعض اوقات انسان کے اوپر ایسی ذمے داریاں پڑ جاتی ہیں جس کی وجہ سے اس کا شعور بلند ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات وقت سے پہلے انسان کی مجلس اتنی سنجیدہ ہوتی ہے کہ شعور وقت سے پہلے ہی بلند تر ہو جاتا ہے۔

وہ حرکات اور وہ چیزیں جو بلوغت کے ساتھ کرنی چاہئیں، اگر پہلے سے کسی کو شروع کرا دی جائیں تو وقت سے پہلے ہارمونی تبدیلیاں ابنارمل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح کبھی بھی غیر فطری طریقے سے شعور نہیں آنا چاہیے۔ ہمیشہ فطری طور پر شعور کی بہتری ہونی چاہیے۔ دل میں سوال اٹھا کہ کیسے ماحول اچھال گیا، دل میں سوال اٹھا کہ کتابیں پڑھنی چاہئیں، دل میں سوال اٹھا کہ مجھے کسی اچھی مجلس میں جا کر سیکھنا چاہیے، دل میں سوال اٹھا کہ میرے پانچ سوال ہیں، مجھے ان سوالوں کے جواب کیلئے مشقت کرنی چاہیے۔ یہ ساری چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ آپ کا شعور بلند ہو رہا ہے۔ اگر آپ چھوٹی عمر میں سنجیدہ مسئلوں پر بات چیت کر رہے ہیں تو پھر آپ خوش نصیب ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کا آنے والا وقت اس سے بہتر وقت ہوگا۔ اگر اب آپ کی نوٹ بک اور ڈائریاں بھری ہوئی ہیں اور آپ چیزیں نوٹ کر رہے ہیں تو پھر آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔ آپ نے صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا ہے، کیونکہ جو لوگ زیادہ وقت میں بہت تھوڑا کام بھی نہیں کر سکتے وہ کام آپ نے تھوڑے وقت میں کر لیا۔ آپ کو بڑے با ادب

روپے کی خاطر لڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ پتا لگے گا کہ شعور ہی کوئی نہیں۔ بعض لوگ آپ کو ملیں گے جو بہت کم عمر میں فطانت کا اظہار کریں گے۔ کسی نے کیا خوب کہا کہ "کسی کے بڑے بڑے کاموں کو نہ دیکھو، ہمیشہ دیکھو کہ وہ چھوٹے چھوٹے کام کیسے کرتا ہے۔"

انسان کے شعور کی پہچان چھوٹے چھوٹے کاموں سے ہوتی ہے۔ جو شخص چھوٹے چھوٹے کاموں میں احتیاط نہیں کرتا، وہ بڑا انسان نہیں ہے۔ ایک بزرگ نے آم کھائے اور کھانے کے بعد سارے چھلکے لپیٹ کر دوسری جگہ جا کر پھینک دیئے۔ کسی نے پوچھا، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ اس گلی کے غریب رہائشی جب ان چھلکوں کو دیکھیں گے تو ان کے دل میں آئے گا کہ کاش ہم بھی کھاتے۔ ان کو اس دکھ سے بچانے کیلئے میں نے یہ عمل کیا ہے۔ یہ آپ پر ہے کہ آپ کسی بھی کام میں کس قدر ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

کبھی کسی نے میٹرک کے بعد اسپوکن انگلش سیکھی اور بعد میں بولی نہ ہو تو بھول جاتی ہے، کمپیوٹر کا شارٹ کورس کیا ہو اور استعمال نہ کیا ہو تو وہ بھول جاتا ہے۔ شعور جب بھی مستعار لیا جائے اور اس کا آگے مصرف نہ ہو تو وہ شعور پاس نہیں رہتا۔ شعور ہمیشہ تب لے کر چلا جاتا ہے کہ جب اس شعور کا آگے کچھ استعمال ہو۔ شعور آپ جس معیار کا چاہ رہے ہیں، اس معیار کے شعور کو پہلے دیکھیں کہ اس کے سامنے امتحان کیا ہے۔ کسی ذہین سے مقابلہ نہیں ہوتا بلکہ مقابلہ تو انسان کا اپنی ذات کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ پہلے سے آپ کا شعور کتنا بہتر ہوا ہے۔ آپ اپنے آپ سے مقابلہ کرنے کیلئے پہلے سے کتنے بہتر طور پر تیار ہیں۔ اگر آپ تیار نہیں ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے شعور کو بہتر نہیں کر پائے۔

شعور کو کیسے بڑھایا جائے

شعور بڑھانے والے عوامل سے کم پر تیار نہ ہوں۔ درج ذیل چیزیں شعور بڑھانے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گی:

1- کتابیں

کتاب اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کسی مغربی فلسفی کے بہ قول، جنت میں بھی شاید کتابیں ہوں گی۔ کتابیں شعور بڑھانے میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہ دیکھا کیجیے کہ کون سا ٹرینڈ چل رہا ہے؟ کس چیز کی آج کل زیادہ بات ہو رہی ہے؟ اس لحاظ سے کتابیں خریدا کیجیے۔ اس سے آپ کے شعور میں اضافہ ہوگا۔

2- مشاہدہ

صرف دن گزاریں نہیں... مشاہدہ کیجیے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ فرماتے ہیں، ''میں کسی جگہ سے گزرا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شہزادی اپنی نوکرانی کو مار رہی تھی۔ وقت گزر گیا۔ کئی سال بعد پھر اسی علاقے سے گزرا۔ وہاں ایک قبرستان تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک قبر کھلی تھی۔ اس میں کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔ کھوپڑی کی آنکھ میں چڑیا کا بچہ تھا۔ وہ اپنا منہ نکالتا، چڑیا اس کے منہ میں دانہ ڈال دیتی۔ میں سوچنے لگا کہ اے مالک، اگر تو نے یہ دکھایا ہے تو پھر اس کی کوئی وجہ ضرور ہے۔ اس کے بعد بابا جی مراقبے میں چلے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس شہزادی کی تصویر اور وہ واقعہ سامنے آیا کہ نوکرانی نے سرمہ پیسا تھا اور اس سرمے میں ریزکن رہ گئی تھی۔ جب نوکرانی نے شہزادی کی آنکھ وہ سرمہ لگایا تو آنکھ میں ریزکن برداشت نہ ہو سکی۔ شہزادی نے کوڑا اٹھایا اور نوکرانی کو مارنا شروع کر دیا۔ پھر بابا جی فرماتے ہیں، جب میں نے آگے جا کر دیکھا تو کھوپڑی اسی شہزادی کی تھی۔ میں نے اپنے اللہ تعالیٰ کے حضور کہا کہ اے میرے مالک، جو آنکھ ریزکن برداشت نہیں کرتی تھی، آج وہ ایک چڑیا کی چونچ بھی برداشت کر رہی ہے۔'' یہ ہے مشاہدہ!

پورا زمانہ ایک کتاب ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ ناکام ہو رہے ہیں تا کہ آپ ناکام نہ ہوں۔ ایک آدمی قرض لیتا ہے۔ قرض واپس نہیں کیا جاتا، جھگڑا ہے، دس سبق مل جاتے ہیں کہ کبھی قرض نہیں لینا۔ اسی طرح ایک غلطی کئی لوگوں کو سبق دے جاتی ہے۔ دنیا میں سمجھدار وہ ہے جو اپنی غلطیوں سے سیکھے، جبکہ زیادہ سمجھدار وہ ہے جو دوسروں کی غلطیوں سے سیکھے۔

حضرت علی المرتضیٰ ؓ فرماتے ہیں: "کبھی خوشی اور غم کی حالت میں فیصلہ نہ کرو۔" آپؓ پھر فرماتے ہیں: "میں دنیا کے راستوں سے زیادہ آسمان کے راستوں کو جانتا ہوں۔" یعنی خوش قسمت انسان وہ ہے جو رہے تو دنیا میں، مگر اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ جڑا ہو۔

اس دنیا میں ایک اچھے مشاہدہ کرنے والے کی طرح زندگی گزاریے، کیونکہ جب آپ مشاہدہ کرنے والے بن جاتے ہیں تو پھر دنیا کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ پھر ہر چیز بولتی ہے، ہر چیز بتاتی ہے، ہر چیز سمجھاتی ہے کہ میری طرف دیکھو۔ پہاڑ اپنی عظمت بتاتا ہے کہ میں کھڑا ہوں، مگر میں نے کیا کھڑا ہونا ہے، اس کھڑا کرنے والے کو دیکھو جس نے مجھے کھڑا کیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے صوفی مسافر ہوتے ہیں۔ وہ غزنوی سے نکلتے ہیں، لاہور پہنچتے ہیں، پاؤں میں جوتی نہیں ہوتی مگر وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اللہ والا جنگل میں ڈیرہ لگالے تو پگڈنڈیاں خود بن جاتی ہیں۔ یہ شعور والے لوگ ہوتے ہیں اور شعور مشاہدے سے آتا ہے۔

3- استاد

صرف اسکول والا استاد ہی استاد نہیں ہوتا، صرف یونیورسٹی والا استاد ہی استاد نہیں ہوتا، ہر وہ فرد جو آپ کو سکھاتا ہے، وہ استاد ہے۔ جب آپ میں سیکھنے کی طلب ہوگی تو پھر زمانے کی چیزیں معاون اور مددگار ہو جاتی ہیں۔ اس لیے آپ کی زندگی میں استاد ضرور ہونا چاہیے۔ کیا معلوم، اس کا ستر سال کا تجربہ آپ کو ایک ہی نشست میں مل جائے۔ زیادہ گمراہ وہ ہوتے ہیں جن کی زندگی میں کوئی رہبر نہیں ہوتا۔ رہبر کسی بھی شکل میں ہوسکتا ہے۔ زندگی میں ایک سیٹ ضرور رکھیں جس میں استاد کا ادب، احترام اور محبت شامل ہو اور آپ کا سیکھنے کا عمل جاری رہے۔

4- تجربہ

اگر آپ نے اپنا شعور بڑھانا ہے تو پھر آپ کبھی تجربے سے نہ ڈریے۔ جیل کے

قیدیوں سے باتیں کرنا، ان سے سیکھنا اور سکھانا ایک طرف اور دو سو کتابیں پڑھنا ایک طرف۔ جو تجربے سے بچ گیا، وہ علم سے محروم رہا۔ تجربہ بہت بڑا مرشد ہے اور انسان کے یہاں تک پہنچنے میں تجربے کا بہت بڑا کردار ہے۔ کرسی سو تجربے کر کے بنی ہے، چین سو تجربے کر کے بنا، ہم جو کپڑے پہنتے ہیں، سو تجربوں کے بعد اس طرح کے بنے ہیں۔ ایک تجربہ وہ ہوتا ہے جو قدرت اچانک کرا دیتی ہے۔ یہ اچھا اور برا دونوں ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک تجربہ آپ پلان کر کے، کوشش کر کے کرتے ہیں۔ اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ تجربے کو ہمیشہ خوش آمدید کہا کیجیے، کیونکہ انسان سیکھتا ہے یا سکھاتا ہے۔

5۔ علم

سید سرفراز شاہ صاحب ایک واقعہ سناتے ہیں کہ ایک شخص نے چلہ کاٹا۔ کئی دن کی ریاضت تھی۔ اس کے استاد نے کہا تھا کہ جب تمہارا چلہ مکمل ہو جائے گا اور تم جنگل سے باہر آؤ گے تو تمہیں ایک فرشتہ ملے گا اور وہ فرشتہ پوچھے گا کہ تمہیں کیا چاہیے۔ تم اس وقت اس سے علم مانگنا۔ اس کا چلہ مکمل ہوا۔ جیسے ہی وہ جنگل سے باہر آیا، اسے سامنے ایک شخص ملا۔ اس نے کہا، آپ نے اتنی ریاضت کی ہے، حکم کریں میں آپ کیلئے کیا کر سکتا ہوں۔ اس نے سوچا، اس وقت میرا نفس جو تقاضا کر رہا ہے وہ کچھ اور ہے جبکہ جو مجھے کہا گیا ہے وہ کچھ اور ہے۔ اس نے اس شخص سے علم مانگ لیا۔ اس نے علم دے دیا۔ وہ علم لے کر اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک بستی آ گئی۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ اس نے ایک دروازے پر دستک دی اور گھر والوں کو کہا کہ میں مسافر ہوں، مجھے ایک رات کیلئے یہاں ٹھہرا لیں۔ گھر والوں نے اسے ٹھہرا لیا۔ اسے کھانا دیا۔ رات کے پچھلے پہر اسے رونے اور آہ و بکا کی آواز آئی۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک چارپائی پر کوئی میت کے انداز میں لیٹا ہوا ہے اور لوگ اسے لے جا رہے ہیں۔ اس نے گھر کے میزبان سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ جواب ملا کہ یہ اس علاقے کے سردار کا بیٹا ہے۔ یہ بیمار ہے، مرا نہیں ہے لیکن یہاں پہ یہ

رواج ہے کہ جب بھی کوئی اتنی تکلیف میں ہوتا ہے تو اس کو لے کر پورے گاؤں پھرتے ہیں کہ ہے کوئی ایسا جو اس کیلئے کچھ کر سکے اور اس کی مشکل آسان ہو جائے۔ وہ چونکہ علم والا تھا، کہنے لگا، بات سنو تمہارے گاؤں کے باہر ایک جڑی بوٹی ہے، اسے لاؤ اور اسے پیس کر اس کے منہ میں ڈالو، یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ حسب ہدایت وہ جڑی بوٹی لائی گئی، اسے پیس کر اس کے منہ میں ڈالا گیا اور وہ لڑکا ٹھیک ہو گیا۔ چند دن بعد اس قبیلے پر دوسرے قبیلے کا حملہ ہوا۔ علم والا دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے قبیلے والوں کو مشورہ دیا کہ آپ ایسا ایسا کریں گے تو جنگ جیت جائیں گے۔ انہوں نے ویسا ہی کیا اور وہ جنگ جیت گئے۔ جنگ جیتنے کے بعد قبیلے کے سردار نے اسے بلایا اور کہا کہ آج سے اس قبیلے کا سردار یہ علم والا ہے۔ جیسے ہی وہ سردار بنا، اسے اپنے استاد کی بات یاد آ گئی کہ اگر میں بادشاہت کو قبول کرتا تو شاید علم رہ جاتا۔ میں نے علم کا انتخاب کیا اور بادشاہت میرے قدموں میں آ گئی۔

علم جہاں سے ملے، جس شکل میں ملے، اسے ضرور حاصل کیجیے۔ یہی سردار بناتی ہے، یہی مخدوم بناتی ہے، یہی بڑا انسان بناتی ہے۔

ارتقائی عمل

دنیا میں جب کوئی بھی نظریہ آتا ہے، اس نظریے کو دنیا کے بڑے دماغ سوچنے لگتے ہیں۔ پھر تحقیق کے بعد وہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ کوئی بھی نظریہ ایک دم سے نہیں بنتا۔ وہ بڑے مراحل کے بعد بنتا ہے۔ بے شمار ایسے نظریات ہیں کہ شروع میں جب ان کے بارے میں سوچا گیا تو انہیں بڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر، دنیا میں بہت عرصے تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ دنیا چپٹی ہے۔ جب پہلی بار کسی نے غور و خوض کیا تو اسے پتا چلا کہ انسانی آنکھ صرف ساٹھ کلو میٹر تک دیکھ سکتی ہے۔ مزید اس سے آگے دیکھنے کیلئے ساٹھ کلو میٹر فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ جن لوگوں نے پہلی دفعہ یہ بات کی کہ دنیا گول ہے، انہیں مارنے کی کوشش کی گئی کیونکہ انسان کا ذہن اتنا جمود میں تھا کہ وہ اس

نظریے کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوا۔ لاتعداد لوگ اس عقیدے کو مذہبی عقیدہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے نظریات ہیں جنہیں ہم مانتے ہیں، وہ بڑی محنت اور غور و خوض کے بعد یہاں تک پہنچے ہیں۔ وہ ایک دم سے نہیں مل گئے۔ مثال کے طور پر، آج سے پانچ سو سال پہلے کی یونیورسٹی میں نیوٹن نہیں تھا۔ اسی طرح، آج سے کچھ سال قبل اگر بیج موبائل کی بات ہوتی تو یہ بہت عجیب لگتا تھا۔ دنیا نے یہ کہنا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔

ایک پین کی قیمت دس روپے سے لیکر چالیس ہزار روپے تک ہو سکتی ہے۔ جس پین کو ہم استعمال کرتے ہیں، ذرا سوچئے کہ صرف اس پین کو بنانے کیلئے انسان کو کتنی تگ و دو کرنی پڑی ہوگی۔ جب یہ پین پہلی دفعہ بنا، اس میں سیاہی ڈالی گئی تو اس کا وزن زیادہ ہوگیا۔ پھر اس میں جدت آتی گئی اور آج اس پین کا وزن چند گرام ہے۔ آج آپ اسے اپنی جیب میں رکھ سکتے ہیں، اٹھا سکتے ہیں، دے سکتے ہیں اور لے سکتے ہیں کیونکہ اب اس کا استعمال بہت آسان ہوگیا ہے۔ کام کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ اس سے تلوار سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس سے انقلاب برپا کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ اس سے علم اگلی نسل میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ ڈارون کے نظریے پر بات ہوئی ہے اور یہ بات بھی پڑھے لکھے طبقے میں ہوئی۔ اس کے نظریے کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ جس پر سب سے زیادہ تنقید ہوئی، وہ یہ ہے کہ نعوذ باللہ انسان کسی اور مخلوق سے بنا ہے۔ اس کے نظریے کا دوسرا حصہ جو بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، کہتا ہے کہ "رہتا صرف وہی ہے جو تبدیلی کو قبول کر سکتا ہے اور جو وقت، حالات، زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ تبدیل ہوتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔"

فکری ارتقا

سب سے پہلے ارتقا آپ کی دانش کا ہوتا ہے۔ آپ کی سوچ، آپ کی فکر کو تبدیلی اور نمو کی ضرورت ہوتی ہے۔ فکری ارتقا کے تین ذرائع ہیں:

1۔ باقاعدہ طور پر سوچنا سیکھئے۔ کوشش کیجیے اور آپ کی ایسی دنیا کے تھینک ٹینک کو ضرور پڑھیں جو سوچنا سکھاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایڈورڈ ڈی بونو کو ضرور پڑھیں۔ وہ بڑے آسان آسان طریقے بتاتا ہے کہ سوچنا کیسے ہے، اپنی فکر اور سوچنے کی صلاحیت کو بہتر کیسے بناتا ہے۔

2۔ کتابیں پڑھیے، مطالعہ کیجیے۔ اگر آپ کا مطالعہ اچھا ہے تو پھر آپ نئی معلومات، نئی چیزوں کے بارے میں آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ بہتر ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کائنات کی وسعت اور بنانے والے کے مظاہر کو نہیں دیکھتے تو پھر آپ کی نظر چھوٹی رہتی ہے۔ چھوٹی نظر والوں کا دل بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ ذات چھوٹے دل میں سما نہیں سکتی۔ وہ مومن کے دل میں سماتی ہے اور مومن کے دل میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ وہ ارتقا کے ذریعے یادِ خدا کو دل میں لے آتا ہے۔

3۔ سیکھنے کا کوئی موقع ضائع نہ جانے دیجیے۔ اگر آپ کو کوئی کار ریزہ بھی اچھی بات سکھائے تو اس سے لے لیں۔ حلوائی سے بھی ملے تو لے لیں۔ موچی سے بھی ملے تو لے لیں۔ دنیا میں زیادہ تر لوگ اپنی ناکامیوں سے نہیں سیکھتے اور دنیا کے کچھ خوش قسمت ہوتے ہیں، جو دوسروں کی ناکامیوں سے سیکھتے ہیں۔ یہ دنیا اور آپ کی زندگی ایک کتاب ہے۔ اس میں علم بکھرا پڑا ہے، وہ جگہ جگہ موجود ہے۔ فقط آپ نے آگے بڑھنا ہے، پیاسا بننا ہے... علم کا پیاسا... اور اس پیاس نے آپ کی علم کی طلب کو پورا کرنا ہے۔

فکری ارتقا کی تلاش

بڑے بڑے علم والے لاہور شہر آئے اور چلے گئے۔ لیکن طالبِ علم ان تک نہیں پہنچ سکے۔ اگر آپ کم از کم لاہور جیسے شہر کے دانش مندوں تک نہیں پہنچے تو پھر آنے والے وقت کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ جب تک لوگوں کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آتی، اس وقت تک ان کے حالات و واقعات بھی ویسے ہی رہتے ہیں۔ آپ یہاں علمی محافل تلاش کیجیے۔ پاک

ٹی ہاؤس میں کون سی کتاب کی رونمائی کہاں ہورہی ہے، پلاک میں کیا ہورہا ہے، الحمرا میں کیا ہورہا ہے، حسنت وینسٹ میں کیا ہورہا ہے، دبستان میں کیا ہورہا ہے، ایوانِ اقبال میں کیا ہورہا ہے، اقبال اکیڈمی کیا کرارہی ہے، کون سی علمی ادبی شخصیت آئی ہے۔ ان کے بارے میں ضرور جائیں۔ ایک ملک میں ادب کے نوبل انعام یافتہ کو سننے کیلئے لوگ لائنوں میں لگے ہوئے تھے۔ جبکہ ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ اول تو ہم لاعلم ہیں اور دوسرے، لڑاکا طیارے ہیں۔ ہم میں نہ بہتری ہے، نہ لچک ہے اور ضد اتنی زیادہ ہے کہ ہر کوئی ہمیں کافر لگتا ہے۔ اگر ہمارا حلیہ مذہبی ہے اور دوسرے کا مذہبی نہیں ہے تو ہمارے دل میں سوال آئے گا کہ یہ بخشا نہیں جائے گا۔ سوال ہے کہ کیا بخشا ہم نے ہے یا اللہ تعالیٰ نے.. ایسا صرف اور صرف بہتر نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

ہم اگر اپنی تقسیم کا لیول دیکھیں تو ہم نیچے تک تقسیم ہو چکے ہیں۔ ہم پہلے پاکستانی، پھر صوبوں میں، پھر ذاتوں میں، پھر نظریوں میں، پھر سیاست میں اور اس کے بعد کرتے کرتے ہم اپنے بہن بھائیوں اور خاندان میں بھی تقسیم در تقسیم ہیں۔ کسی سے رابطے میں نہیں ہیں۔ خاندان کے تباہ ہونے کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہورہا ہے۔ لوگ آپس میں ملنا چھوڑ رہے ہیں۔ خاندان سے رابطہ ختم ہو چکا ہے۔ والدین نے ذمے داریاں لینی چھوڑ دی ہیں۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ نظریوں سے اختلاف ہے۔ لچک نہیں ہے۔ بہتری کی طرف نہیں گئے اور نہ جانا چاہتے ہیں۔ جب بھی آدمی بہتر ہوتا ہے تو اسے نفرت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کائنات کی سب سے عظیم ہستی حضور اکرم ﷺ ہیں۔ بڑھیا آپ ﷺ پر روز کوڑا پھینکتی تھی، مگر آپ ﷺ پھر بھی معاف فرما دیتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کا ظرف تھا۔ طائف کے بچے پتھر مارتے ہیں، حضرت جبرائیل علیہ السلام آکر پوچھتے ہیں کہ آپ ﷺ حکم فرمائیں تو پہاڑوں کو آپس میں ملا کر طائف والوں کو ختم کر دیا جائے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے معاف کیا، کیونکہ میں رحمت بن کر آیا ہوں، یہ نہیں جانتے جو بات میں کر رہا

ہوں۔ آنے والا زمانہ انہیں بتا دے گا۔ یہ تو سمجھ آتا ہے کہ یہ جملہ کسی بڑے انسان کا جملہ ہے۔ آپ صرف اس جملے کو سامنے رکھیے اور سوچیے کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہم میں کتنا ظرف ہے۔ کتنے لوگوں سے ہم نے نفرت پالی ہوئی ہے۔ ہمارا فوکس، ہماری اندر کی شخصیت کی بہتری، ہماری یکسوئی، ہمارا ارتقا... کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔ ہم عمر میں بڑے ہو جاتے ہیں، لیکن اندر کا انسان نا سمجھ بچہ اور ڈفر سا انسان رہ جاتا ہے۔

کوشش کیجیے کہ آپ اپنے نظریات پر کام کریں۔ دنیا میں رویے پر جو نئے نظریات آ رہے ہیں، جو تحقیقات ہو رہی ہیں، انہیں ضرور پڑھیں۔ جب آپ زمانے کا علم لیتے ہیں تو آپ میں وسعت آتی ہے۔ نئے تجربے کیجیے۔ کوشش کر کے نئی جگہوں سے سیکھیں۔ نئے شہروں سے سیکھیں۔ سوال والے انسان بنیں۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ "آدھا علم سوال میں ہے"۔ آپ سوال والے انسان بنتے ہیں تو پھر علم بھی آپ کی طرف تحمل کرانے لگتا ہے۔ لیکن اگر آپ کے پاس سوال نہیں ہیں تو پھر آپ بہتر نہیں ہو سکتے۔

اپنی بہتری کیلئے مسلسل کوشش کیجیے۔ اپنی وہ صلاحیتیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو گفٹ کی ہیں، جن سے آپ کی شناخت ہوئی ہے، اگر آپ بہتر ہوتے ہیں تو کامیابی کیلئے ارتقائی عمل مکمل کرتے ہیں۔ پھر، یقین کیجیے کہ یہ چیزیں آپ کی غلام بن جاتی ہیں۔ یہ ارتقا اتنا ضروری ہے کہ حدیث کا مفہوم ہے کہ "ہلاک ہوا وہ شخص جس کا آج کا دن پچھلے دن سے بہتر نہیں ہے۔" اگر آپ پچھلے دن سے بہتر نہیں ہو رہے، آج کے دن کچھ نیا نہیں سیکھا، کچھ اپنی عادات پر کام نہیں کیا، اپنی غلطیوں کو بہتر نہیں کیا تو پھر دن گزریں گے، ہفتے گزریں گے، مہینے سال بن جائیں گے اور سال زندگی کو تمام کر کے چلے جائیں گے۔ دنیا میں کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی کہ آپ آئے تھے اور آپ چلے گئے۔

اپنی پہچان

جب کوئی سوال سنجیدہ ہوتا ہے تو وہ انجام کار عمل پر لاتا ہے۔ لیکن اگر سوال سنجیدہ نہیں

ہے تو پھر وہ عمل کی طرف نہیں جاتا۔ خود شناسی بھی ایسا ہی ایک سنجیدہ سوال ہے۔ اگر آپ اس سوال کو دل میں رکھ لیتے ہیں اور غور و فکر شروع کر دیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اس کا جواب اشاروں کی صورت میں دیتا ہے۔

دنیا کا کوئی انسان ایک دم سے اپنے آپ کو نہیں پہچان سکا۔ ایک شخص پیدا ہوا، کاروبار کے حصول علم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ گیا مگر وہاں جا کر وکالت کی تعلیم حاصل کر لی۔ بعد میں لیڈر بن گیا۔ دنیا اسے "قائداعظم" کے نام سے جاننے لگی۔ قدرت نے لازم کر دیا ہے کہ یہ راستہ ڈھونڈنے سے ہی ملے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ بٹن دبائیں اور آپ خود کو پہچان جائیں۔ کوشش لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم چاہو گے، کوشش کرو گے تو پھر ملے گا۔ یہ خالق اور مخلوق میں فرق ہے۔ خالق "کن" کہتا ہے اور ہو جاتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں، کہتے ہیں، کوشش کرتے ہیں، پھر ہوتا ہے۔

میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ اس سوال کا جواب شعوری کوشش مانگتا ہے۔ سجدے کرنے پڑتے ہیں، کئی جگہ بھاگنا پڑتا ہے۔ آپ کا اصل چہرہ کئی حادثات سے نکلتا ہے۔ کئی جگہ آپ کے اندر کا لالچ باہر نکل آتا ہے۔ آپ اپنے اندر ہاتھ ڈالتے ہیں تو سانپ نکل آتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میرے اندر اتنا لالچ ہے۔ کبھی آپ اپنے اندر ہاتھ ڈالتے ہیں تو موتی نکل آتا ہے۔ آپ کہتے ہیں، میرے اندر اتنا خلوص ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، وہ قبول ہو جاتا ہے۔ کبھی آپ اپنے اندر ہاتھ ڈالتے ہیں تو شیر نکل آتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں اتنا بہادر ہوں۔ پتا چلا کہ ساری چیزوں کو اپنے اندر تلاش کرتے کرتے آخرکار وہ اصل چیز مل جاتی ہے۔ اگر آپ اس سوال کے سفر میں بول پڑیں تو آپ کے منہ سے نکلتا ہے،" بولھا! کیہ جاناں میں کون؟" جب آدمی بن جاتا ہے تو پھر اسے سمجھ آ جاتی ہے کہ "نہ میں اور نہ وہ" سفر میں اسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ "میں موسیٰ ہوں کہ فرعون ہوں۔" اگر کنارے کے قریب پہنچ جائیں تو پتا لگتا ہے کہ اصل میں، میں کون ہوں۔ پھر آپ اسی نام کے ساتھ انجام کی طرف چل پڑتے ہیں۔ اسی شناخت کے ساتھ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

سمت

ہم زمانہ طالب علمی سے ہی موٹیویشن کے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ جو آدمی بغیر کسی ذرائع کے موٹیویشن لے رہا ہے، یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو زیادہ ذہانت دیتا ہے، اسی طرح بعض کو موٹیویشن بہت زیادہ دے دیتا ہے۔ پھر ان کی موٹیویشن زمانے کو ملتی ہے۔ کئی لوگوں کو افکار زیادہ ملتے ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر بہت اچھی ہوتی ہے جیسے حضرت علامہ اقبالؒ جن کی فکر سے زمانہ فیض یاب ہو رہا ہے۔ اسی طرح حضرت واصف علی واصفؒ کے نازل ہوئے جملے جن سے زمانے کو فیض مل رہا ہے۔ ایسے لوگ معاشرے کیلئے ذہنی آکسیجن کا کام کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنی سمت کا تعین کر لیا تھا۔

جب زندگی میں حکم بھی ہو کہ چلنا ہے اور کہیں پہنچنا ہے اور ساتھ یہ المیہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کیلئے ہم اردگرد کے لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہر جگہ سمت بتانے والے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ ہم اپنی مرضی نہیں چلا سکتے۔ ان سمت بتانے والے لوگوں میں ہمارے والدین، ہمارے عزیز رشتے دار ہوتے ہیں۔ شروع میں ہمارے والدین اس سکول میں داخل کرائیں گے جن کے بارے میں ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس کا معیار اچھا ہے۔ ہماری زندگی میں ہم کپڑے بھی اپنی مرضی کے نہیں پہنتے۔ ہمیں ایک عرصے تک لباس دوسرے لوگوں سے ملتا ہے۔

یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم میں ایک چیز نہیں ہوتی جس کا نام شعور ہے۔ شعور کی آنکھ ہمیں اس وقت ملتی ہے جب ہم محتاج نہیں رہتے۔ ہم آزاد ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ زندگی میں ہم آزاد بھی ایک دم سے نہیں ہوتے۔ ہم آہستہ آہستہ آزاد ہوتے ہیں۔ پھر خوش قسمتی یہ ہوتی ہے کہ ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ ہم مکمل آزاد ہو جاتے ہیں۔ کئی لوگ تو بڑی عمر میں بھی آزاد نہیں ہوتے۔ جب شعور کی آنکھ کھلنے لگے تو سب سے پہلا کام یہ کیجیے کہ باقاعدہ بیٹھ کر

غوروخوض کر کے زندگی کو کوئی سمت ضرور دیجیے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس جتنی زیادہ توانائی ہوتی ہے، اتنی توانائی کے ساتھ جو کام ہو سکتے ہیں، اگر وہ نہ کیے جائیں تو پچھتاوا رہ جاتا ہے۔قدرت جتنے منٹس میری جیب میں ڈالتی ہے، اتنے ہی منٹس ہر ایک کی جیب میں ڈالتی ہے۔وہ آدمی ترقی کر جاتا یا آگے بڑھ جاتا ہے جو ان منٹس کو استعمال کرتا ہے۔جو توانائی آپ کے پاس ہے، جب آپ رات کو سونے لگیں تو اپنے آپ سے یہ سوال کیجیے کہ کیا میں نے ان منٹوں کو بھرپور استعمال کیا ہے؟

آپ غلط گاڑی پر پندرہ منٹ بیٹھنا برداشت نہیں کر سکتے اور دس منٹ غلط راستے پر سفر نہیں کر سکتے۔بالفرض، اگر آپ غلط سمت سفر بھی کر لیں تو پھر بھی دوسری گاڑی پکڑ کر اصل جگہ پر جایا جا سکتا ہے۔اگر زندگی کے سفر میں کہیں غلط پہنچ گئے تو کیا وقت واپس آجائے گا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بٹن دبایا جائے اور وقت واپس آجائے؟ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔آپ کی عمر چاہے جتنی زیادہ کیوں نہ ہو، مگر آج آپ کی سمت ٹھیک ہو جاتی ہے، آپ کو شعور آجاتا ہے تو پھر کیا بات ہے۔شیخ سعدیؒ سے کسی نے پوچھا، آپ کی عمر کتنی ہے؟ آپؒ نے فرمایا، "چار سال۔" اس نے کہا کہ آپؒ کے تو بال سفید ہو گئے ہیں۔فرمانے لگے کہ "مجھے شعور چار سال پہلے ملا ہے۔"

اگر شعور مل جائے تو پھر ایک ایسی زندگی جس میں سمت نہیں ہے، سمت آجاتی ہے۔اگر یہ کہا کہ آپ کی سو سال کی بے سمت زندگی سے ایک دن کی سمت والی زندگی زیادہ بہتر ہے تو غلط نہیں ہوگا۔یہ جملہ اس جملے سے مماثلت رکھتا ہے کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" آپ کی سو سال کی زندگی ہو اور اس میں سمت نہ ہو تو اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ صرف ایک دن کا جینا ہو جس میں سمت ہو، شوق ہو، جذبہ ہو، جس میں آپ کو کم از کم یہ یقین ہو کہ میرا دل میرے ساتھ ہے، میری روح میرے ساتھ ہے، میرے کام میں میری روح پوری طرح شامل ہے۔

آپ نے جس سمت کا انتخاب کر لیا ہے، خاموش ہو کر سر نیچا کر کے چلتے جائیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ سر اٹھائیں گے اور زمانہ ساتھ چل رہا ہو گا۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں تو اکیلا چلا تھا، اتنا بڑا کارواں کیسے بن گیا۔ سچا اکیلا بھی چلے تو زمانہ ساتھ چل پڑتا ہے اور جھوٹا زمانے کو لے کر بھی چلے تو ایک دن سب اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اکیلا ہوتا اور ساتھ اس کے اس کا وہم ہوتا ہے۔ آپ نوکری کر رہے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، کاروبار کر رہے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، پڑھائی کر رہے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، لیکن خدارا سب کاموں کی سمت ایک ہو۔ سب چیزیں جڑ کر ایک دریا میں گریں۔ یہ نہ ہو کہ آپ کی نالیوں کی سمت مختلف ہو اور آپ کی زندگی کا دریا سوکھا ہو۔

زندگی کی صحیح سمت

سارے کام ہی ٹھیک ہیں، مگر کاموں کے درمیان ایک ایسی نیت ہے، جس سے سب چیزیں جڑتی ہیں۔ وہ نیت یہ ہے کہ میرے مالک جی رہا ہوں تو تیرے لیے جی رہا ہوں۔ دکان ہے تو تیرے لیے ہے، بچے ہیں تو تیرا حکم ہے تو پال رہا ہوں، پڑھ اس لیے رہا ہوں کہ تجھے علم والا مسلمان پسند ہے، کاروبار اس لیے چلا رہا ہوں کہ تو نے کہا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، جذبہ اس لیے ہے کہ تیری نظر میں سب سے پہلے وہ آتا ہے جو تڑپتا ہے، جو روتا ہے۔ اگر آپ کے ہر کام کے پیچھے نیت مالک ہے تو ہر کام کی سمت ایک ہوگی۔ پھر سونا بھی عبادت ہو گا، پہننا بھی عبادت ہو گا، چلنا بھی عبادت ہو گا، کھانا بھی عبادت ہو گا۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں پتا ہے کہ نوکری لگی ہوئی ہے، پیسے تو آنے ہی ہیں۔ یقین کیجیے کہ جذبے سے کام کر کے دیکھیں، پیسہ پیچھے پیچھے آئے گا۔ آپ ڈبا نہ بنیں، انجن بنیں۔ ڈبے کی نشانی یہ ہے کہ وہ محتاج ہے۔ انجن محتاج نہیں ہوتا۔ قدرت نے انسان کو جو سب سے بڑی آگ دی ہے، آپ جذبے کو انجن بنائیں۔ شہرت کا ڈبا، عزت کا ڈبا، پیسے کا ڈبا،

آسانیوں کا ڈبا، لوگوں سے میل جول کا ڈبا۔ یہ خود بہ خود آپ کے پیچھے چلتے آئیں گے۔

صرف ایک خوبی کو ہی اگر پکڑ لیا جائے تو وہ بہت بڑا نتیجہ دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اخلاق والے کی زندگی میں نہ مواقع کم ہوتے ہیں، نہ لوگ کم ہوتے ہیں۔ ہر فرد اس کیلئے خوش بختی بن جاتا ہے۔ ہر حادثہ اس کیلئے خوش قسمتی بن جاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس اخلاق ہے تو پھر دنیا آپ کے سامنے سرنگوں ہوگی۔ اچھے خواب پالیں۔ جب دینا اللہ تعالیٰ نے ہے تو پھر مانگنے میں شرم کس بات کی۔ اگر رینگ رینگ کر ہی زندگی گزارنی ہے تو پھر زندگی کا کوئی مزا نہیں ہے۔ ہم اپنی عقل و شعور کو اس قابل بنائیں کہ ہم ذمے داریاں اٹھا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بچے جن پر ذمہ داریاں پڑ جاتی ہیں، جلد سمجھ دار ہو جاتے ہیں، بہ نسبت ان کے جو بیٹھے رہتے ہیں، جو انتظار کرتے رہتے ہیں، جو گرم ہوا سے بچنا چاہتے ہیں۔

زندگی میں یہ ضرور کیجیے کہ اپنی زندگی کے مقصد کے متعلق لائن لگائیں۔ جو جو چیزیں اس سے جڑتی ہیں، وہ کرتے جائیں اور ان چیزوں کو چھوڑ دیں جو نہیں جڑتیں۔ اگر آپ نے یہ کام کر لیا تو آپ کے کام کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ لوگوں کی رفتار اسی وجہ سے تیز نہیں ہوتی کہ انہیں پتا ہی نہیں ہے کہ کرنا کیا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ ہم گھر سے بڑے کام کیلئے نکلتے ہیں اور محلے کی لڑائی دیکھ کر واپس آ جاتے ہیں۔ ہمیں پتا ہی نہیں ہے کہ جو چیزیں ہم سے جڑی ہوئی ہیں، ان کا اس سے تعلق ہی کوئی نہیں ہے۔ کسی نے دانشور سے کہا، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ اس نے کہا ٹھہر جاؤ، پہلے مجھے ٹیسٹ کراؤ کہ میں یہ بات سنوں یا نہ سنوں۔ دانشور نے پوچھا، "بات مجھ سے متعلق ہے؟" اس نے جواب دیا نہیں۔ دانشور نے پوچھا، "بات تجھ سے متعلق ہے؟" اس نے کہا نہیں۔ دانشور نے کہا، "بات نہ تیرے فائدے کی ہے اور نہ میرے فائدے کی ہے، تو اس بات کا فائدہ کیا؟" ہم زندگی میں بے شمار چیزیں سن رہے ہیں، سمجھ رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں، وہ ہماری سمت سے نہیں ملتیں۔ ان کاموں کو کرنے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں۔ جو آدمی یہ طے کر لیتا ہے کہ میں نے سننا کیا

ہے، دیکھنا کیا ہے، اس کے پاس اس بات کی گرفت آجاتی ہے کہ میں نے سوچنا کیا ہے۔ زندگی میں اپنی سمت پر کام کیجیے۔ اگر سمت پر کام نہیں کریں گے تو پھر دن گزریں گے۔ یہ ہفتوں میں بدلیں گے، یہ مہینوں میں بدلیں گے، یہ برسوں میں بدلیں گے اور یہ برس زندگی میں بدلیں گے اور زندگی ختم ہو جائے گی۔ آپ کولھو کے بیل کی طرح کہیں نہیں پہنچیں گے، حالانکہ آپ ساری زندگی سفر کرتے رہے ہوں گے۔

اپنی تلاش

دنیا کی تاریخ میں یہ سوال ہمیشہ سنجیدہ شخص کو ملا ہے۔ آج تک اللہ تعالیٰ نے یہ سوال غیر سنجیدہ شخص کو دیا ہی نہیں ہے۔ کیا میں نے صرف والدین کے کہہ دینے پر داخلہ لیا ہے؟ کیا صرف میرا میرٹ لسٹ میں نام آگیا ہے، اس لیے داخل ہوا ہوں؟ آپ دیکھیں کہ آپ کو خدا نے کس کام کیلئے پیدا کیا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے سوال کیا کہ سر، کیسے پتا لگتا ہے اپنے آپ کا؟ انہوں نے جواب دیا کہ چند دن بعد یہ سوال کرنا۔ ہفتے بعد آپؒ نے اس سے پوچھا کہ تمہارا سوال کیا تھا؟ اس نے کہا، میں سوال بھول چکا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا کہ جس سوال کو تم ایک ہفتے بھی اپنے پاس سنبھال کے نہیں رکھ سکے، قدرت تمہیں اس کا جواب نہیں دے گی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر ایک خوبی، ایک صلاحیت بلا کی رکھی ہے۔ آپ نے کبھی اس کو دیکھا ہی نہیں۔ ممکن ہے، کوئی بہت اچھا استاد ہو، کوئی بہت اچھا محقق ہو، ممکن ہے کوئی بہت بڑا کاروباری آدمی ہو۔

اخلاقیات آپ میں آجائیں گی، لیکن آپ یہ ضرور دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کون سی خاص صلاحیت سے نوازا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے کہ آپ ڈگری لینے کے بعد اپنی لائن تبدیل کرلیں۔ لیکن جس کام کیلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہے، کہیں وہ کام رہ نہ جائے۔ اگر آپ اس سارے نظام کو دیکھ کر اسی ڈگر پر چل رہے ہیں تو پھر آپ کو کامیابی نہیں ملے گی۔ جب آپ اپنے شوق کو ڈھونڈ لیتے ہیں تو آپ کو اپنا کام کام نہیں لگتا، کام اس کو کام

لگتا ہے جو کام کو کام سمجھ رہا ہے۔ جس کیلئے کام فن ہے، عبادت ہے، شوق ہے، وہ کبھی نہیں تھکے گا۔ حضرت بابا بلھے شاہ جیسے صوفیا کرام نے فرمایا کہ اپنے اندر دیکھو۔ جب آپ اپنے آپ کو تلاش کر لیتے ہیں تو سب پہلا تحفہ جو قدرت آپ کو دیتی ہے، وہ آپ کا اپنی ذات پر اعتماد ہوتا ہے۔ قدرت کی ہر چیز کو پتا ہے کہ میں کس لیے ہوں جیسے سورج روشنی دینے کیلئے ہے، پھول خوشبو دینے کیلئے ہے، دریا پانی کے بہاؤ کیلئے ہے۔ یہ آپ کی چھوٹی سی زندگی ہے۔ دوبارہ اس دنیا میں آپ کو نہیں آنا۔ آپ کو ایک بار موقع ملا ہے، لہٰذا آپ اپنے اندر یہ سنجیدہ سوال پیدا کیجیے۔

پہلے اپنے آپ سے لڑو

کتاب The 7 Habits of Highly Effective People نے دنیا پہ راج کیا ہے۔ اس کی ڈیڑھ کروڑ سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ چالیس سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس کے مصنف اسٹیفن آر کوی کو دنیا اس وقت کا سب سے بڑا لائف کوچ تسلیم کرتی ہے۔ اس کتاب میں ایک جملہ ہے جس میں مصنف کہتا ہے کہ ”جتنے بھی ذہین لوگ ہوتے ہیں، انہیں بڑی جلدی اپنی خاصیت کا پتا چل جاتا ہے۔“ آپ بھی ذہین بننا چاہتے ہیں تو اپنی اس خاصیت کا پتا لگائیں جس پر آپ کو کام کرنا ہے۔ جو طالب علم ابھی مخصوص سوالات کے گرد گھوم رہا ہے وہ بڑا انسان نہیں بن سکتا۔ جو شخص ذہین ہوتا ہے وہ فوری طور پر اپنی خاصیت کو دیکھتا ہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو بدلتا ہے۔ وہ پہلی جنگ اپنے آپ سے لڑتا ہے۔ یہی جملہ اپنے وقت کے درویش دیو جانس کلبی نے سکندر اعظم سے کہا تھا۔ جب سکندر اعظم دنیا فتح کر کے آیا اور اس درویش سے کہنے لگا کہ میں نے کیا کمال کیا تو درویش نے مسکرا کر سوکھی روٹی کو پانی میں بھگویا اور کھاتے ہوئے ایک بات کہی کہ ”تو نے کچھ فتح نہیں کیا۔“ سکندر نے پوچھا، کیوں؟ درویش نے جواب دیا، ”اس دنیا کی فتح سے بڑا کام اپنی فتح ہے اور وہ تو نے ابھی

نہیں کی۔" سکندر اعظم نے کہا، ثبوت؟ درویش نے جواب دیا، "تو میرے غلام کا بھی غلام ہے۔" سکندر اعظم نے کہا، غلام کا غلام کیسے ہو گیا؟ درویش نے کہا، عرصے سے نفس میرا غلام ہے اور تو نفس کا غلام ہے۔"

جو آدمی اپنے آپ کو فتح نہیں کر سکتا، وہ دنیا کے ساتھ بھی نہیں لڑ سکتا۔ انسان خود اپنا دشمن بنا ہوتا ہے اور دوسروں کو کوستا رہتا ہے۔ آپ کی اپنے ساتھ اصلاح کی جنگ ہے۔ اپنے آپ کو مارنے کی جنگ نہیں ہوتی۔ جب بھی آپ اپنی بہتری کی طرف آتے ہیں تو اس لڑائی میں آپ ہر بار خود کو بہتر کرتے ہیں۔ بعض اوقات استاد کی ڈانٹ آپ کو بہتر کرنے کیلئے ہوتی ہے۔ اسی طرح، آپ کا اپنے ساتھ رویہ، اپنے ساتھ آپ کا برتاؤ، آپ کی اپنی بہتری کیلئے ہونا چاہیے، نہ کہ اپنی تذلیل کیلئے ہے۔

ریڈ سگنل

ریڈ سگنل کا مطلب ہے کہ زندگی میں بے شمار مشکلات، مسائل تنقیدیں وغیرہ آپ کے سامنے آتی ہیں۔ آپ کو اپنی زندگی میں ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جنہیں خود تو کچھ نہیں کرنا ہوتا، دوسروں کو بھی نہیں کرنے دیتے۔ سب سے پہلا کام آپ یہ کیجیے کہ آپ ان کی فہرست بنائیے۔ ہر فرد کے ریڈ سگنل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ ذہن میں رہے کہ ریڈ سگنل ہمیشہ نہیں رہتا۔ اسے گرین ہو جانا ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم چل رہے ہوتے ہیں اور ایک جگہ جا کر رک جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں پر کوئی ریڈ سگنل نہیں ہے، نہ کوئی ایسا فرد اور حالات ہیں کہ جس کی وجہ سے ہم رک جائیں۔ جب رکنے کی وجہ تلاش کی جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ رکنے کی وجہ ہم خود ہیں۔ بعض اوقات انسان خود ہی اپنا ریڈ سگنل ہو جاتا ہے۔ اس کے اپنے خیالات، اپنی نالائقی، اپنی سمجھ، خود تنقیصی، اپنی ذات... راستے میں آ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں آگے نہیں جانے دوں گی۔ یہ صورت حال اس لحاظ سے بڑی خطرناک ہوتی ہے کہ اس وقت آپ کو دنیا کا سب سے بڑا کام کرنا پڑتا ہے، یعنی آپ کو

اپنے ساتھ جنگ کرنا پڑتی ہے۔ آپ کے اندر جو "میں" بیٹھا ہے، اسے مارنا ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے انقلاب کسی کے اندر آئے ہیں تو اس کے ساتھ جنگ کے بعد ہی آئے ہیں۔ اگر کسی کے اندر انقلاب نہ آئے تو باہر انقلاب نہیں آ سکتا۔ اگر کسی کے اندر تبدیلی نہ آئے تو اس کے باہر تبدیلی نہیں آ سکتی۔ آپ کا بڑا سفر اور بڑے سفر کا آغاز آپ کے اندر سے شروع ہوتا ہے۔ اور جب آپ اپنے اس سفر کا آغاز کرتے ہیں جس میں آپ یہ مانتے ہیں کہ میں باہر کی چیزوں کو تبدیل نہیں کر سکتا، لیکن میں اپنے اندر کی تبدیلی کر سکتا ہوں تو آپ سب سے بڑی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں... اپنی تبدیلی!

انسان جسمانی کام کرنے سے نہیں تھکتا۔ سوچ یا خیال بہ ذات خود ایک کام ہے۔ اگر آپ وہ باتیں سوچ رہے ہیں جو کام کی نہیں ہیں تو پھر آپ جلدی تھک جائیں گے، جلدی بوڑھے ہو جائیں گے۔ کسی جگہ پہنچ نہیں سکیں گے۔ اس لیے جو سوچ کوئی نتیجہ نہ دے سکے، اس کو آپ چھوڑ دیں۔ یہ ریڈ سگنل ہے۔ یہ سوچ آپ کو آگے بڑھنے نہیں دے گی۔ ایک خیال یا عام سوچ بیج کی طرح ہے۔ سوچ کو پانی دیں تو وہ پودا بن جاتی ہے، پھر درخت بنتی ہے، پھر پھل دیتی ہے۔ پانی کا مطلب ہے، اہمیت دینا۔ جب آپ کے اندر کوئی منفی خیال چل رہا ہو تو آپ فوراً رک جائیں اور اسے اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کیجیے۔ دیکھیے کہ یہ خیال کہاں سے آیا۔ وہ کون سے خیالات ہیں جن کی وجہ سے یہ سوچ آئی۔ جائزہ لیجیے کہ کہیں یہ خیالات میری عادت تو نہیں ہے۔ کہیں یہ ریڈ سگنل تو نہیں ہے۔ جب آپ کو پتا لگ گیا کہ یہ ریڈ سگنل ہے تو پھر آپ اپنے آپ سے کہیں کہ میں کسی ایسی چیز کو اجازت نہیں دے سکتا جو میرے راستے کا ریڈ سگنل بن جائے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں کہ پریشانی میں سب سے پہلے جو چیز آپ سے چھن جاتی ہے، وہ پریشانی حل کرنے کی صلاحیت ہے، کیونکہ جب بھی آپ کم پریشان ہوتے ہیں تو آپ حل تلاش کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ انتہائی غم کی حالت میں اور انتہائی خوشی حالت میں

فیصلہ نہ کیجیے، کیونکہ جب آپ انتہائی خوشی یا غم کی حالت میں فیصلہ کرتے ہیں تو آپ کی فیصلہ کرنے کی صلاحیت کمزور ہوتی ہے اور اس کمزوری کی وجہ سے آپ جو فیصلہ کرتے ہیں، وہ گلے پڑ جاتا ہے۔ اس لیے کبھی شدتِ جذبات کی کیفیت میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ خیالات جو آپ کو جذباتی کر دیں، آپ کے ریڈ سگنل ہیں، انہیں کنٹرول کریں۔ جو لوگ آپ کا ریڈ سگنل نہیں بنتے، ان سے ملیں۔ ان کے ساتھ وقت گزاریں کیونکہ یہ لوگ آپ کیلئے زندگی میں گرین سگنل ہیں۔ اگر انسان کے اندر طاقت زیادہ ہو، جذبات زیادہ ہوں، جذبہ ہو تو پھر سامنے آنے والی رکاوٹ چھوٹی ہو جاتی ہے۔

ایک شخص درخت کے نیچے سویا ہوا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ ایک بچھو اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا، لیکن بچھو اس کے پاس سے ایسے گزرا جیسے وہ کسی کام پر جا رہا ہو۔ اس نے سوچا کہ عجیب بات ہے کہ مجھے کچھ کہے بغیر یہ آگے چلا گیا۔ اس نے بچھو کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے آگے دریا آ گیا۔ بچھو دریا کے کنارے ایسے کھڑا ہو گیا جیسے کسی کشتی کا انتظار کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد ایک پتا پانی میں تیرتا ہوا آیا اور اس کے پاس آ کر رک گیا۔ بچھو اس پر سوار ہوا اور پتا آگے چل پڑا۔ اس شخص نے پانی میں چھلانگ لگائی اور اس بچھو کے پیچھے پیچھے تیرنے لگا۔ بچھو دریا کے دوسرے کنارے چلا گیا۔ جب بچھو دریا کے دوسرے پار پہنچا تو پتا پھر رکا، بچھو اتر گیا۔ وہ شخص بھی کنارے پر آ گیا۔ بچھو چلتا چلتا دور ایک ٹیلے کے پاس ایک آدمی کے پاس پہنچا جو سویا ہوا تھا۔ اس کے قریب جا کر رک گیا۔ دوسری طرف سے سانپ آ رہا تھا۔ جیسے ہی سانپ اس سوئے ہوئے کو ڈسنے لگا تو بچھو نے سانپ کو ڈس لیا۔ یوں، سانپ مر گیا۔ بچھو آگے چلا گیا۔ وہ شخص جو بچھو کے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچا تھا، اس سوئے ہوئے کے پاؤں پڑ گیا۔ وہ جاگ گیا تو وہ اسے کہنے لگا کہ آپ تو بڑے بزرگ ہیں۔ اس نے پوچھا، کیوں کیا ہوا؟ پھر اس نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ واقعہ سننے کے بعد اس نے کہا، میں تو ایک یہودی ہوں۔ اس شخص نے یہودی کو چھوڑا اور سر سجدے میں رکھ

دیا اور کہا کہ اے میرے مالک، تو ایک بندے کو بچانے کیلئے اتنا بڑا کارخانہ چلاتا ہے تو پھر میرے بارے میں اس سے بھی بہتر کر رہا ہوگا۔

اگر کبھی ہماری آنکھ کھل جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیا معاملات کر رہا ہے، وہ کہاں کہاں سے ہماری مدد کرتا ہے تو ہم کبھی سجدے سے سر ہی نہ اٹھائیں۔ ہم کسی وجہ سے رو رہے ہوتے ہیں اور اچانک ایک اللہ کا بندہ آتا ہے اور ہم جس وجہ سے رو رہے ہیں، وہ اسی کے متعلق باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ہم حیران ہوتے ہیں کہ یہ میرے ساتھ میری باتیں کیوں کر رہا ہے۔ اصل میں اللہ تعالیٰ ہماری مدد کر رہا ہوتا ہے۔

فیض والوں کی زندگی میں بھی ریڈ سگنل آتے ہیں، لیکن وہ جلد ہی گرین ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ریڈ سگنل آنے کے بعد سمجھتے ہیں کہ راستہ بند ہو گیا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس ریڈ سگنل نے گرین بھی ہونا ہے۔ مثال کے طور پر، آپ نے پانی کی بالٹی پکڑی ہوئی ہے۔ اس میں ایک سوراخ ہے۔ آپ جا رہے ہیں۔ آگے ریڈ سگنل آ گیا۔ آپ جتنی دیر رکیں گے، پانی رستا جائے گا۔ لیکن آپ کو پتا ہے کہ سگنل نے گرین ہو جانا ہے تو آپ اپنی منزل تک پانی پہنچا لیں گے۔ بہت سے لوگوں کی زندگی میں تین چار ریڈ سگنل آتے ہیں۔ ان کا پانی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ پانی امید کا پانی ہوتا ہے۔ یہ پانی ختم ہونے کے بعد وہ اتنے ناامید ہو جاتے ہیں کہ پھر وہ ہر ایک کو ناامیدی بانٹنے لگتے ہیں۔

جو لوگ چور ڈکیت بن جاتے ہیں، ان کی امید چھن چکی ہوتی ہے۔ ان کو صرف ایک ہی راستہ ملتا ہے کہ وہ اپنی جان کو تکلیف میں ڈال کر چوری کرنا شروع کر دیں۔ ان کی امید اس وجہ سے چھن جاتی ہے کہ انہوں کوئی ایسا اسکول نہیں ملا ہوتا جو انہیں راستہ دکھاتا، جو ان کے اندر تبدیلی لے کر آتا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ استاد وہ ہوتا ہے جو شاگرد کے اندر بیج بوتا ہے اور اندر کی تبدیلی بیج بونے کے ذریعے ہی آتی ہے۔ جب لیڈر شپ چور ہوگی تو پھر اس کی ساری ٹیم چور ہو جائے گی۔ صحیح سسٹم میں غلط آدمی نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ کے گھر کا نظام

ٹھیک ہے تو پھر اس میں کوئی غلط نہیں رہ سکے گا، کیونکہ جو فرد سسٹم کیلئے ریڈ سگنل بننے کی کوشش کرتا ہے، سسٹم اسے اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے۔ اس سسٹم میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ اس کو باہر نکال دیتی ہے یا اس کا فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ سب کے سامنے اس کا اصل چہرہ آجاتا ہے۔

استاد کو عزت اس لیے نہیں مل رہی کہ استاد خود مثال نہیں ہوتا۔ شاگرد کو پتا ہے کہ یہ ہمیں دیکھ نہیں سکتا۔ یہ سویا ہوا انسان ہے۔ جو استاد خود قابل نہ ہو، وہ اپنے شاگردوں کو کیسے قابل بنائے گا۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''قدرت آگہی تب دیتی ہے جب آپ میں ظرف اور برداشت بھی ہو۔'' اگر آپ میں برداشت نہ ہو اور آگہی آجائے تو آپ پاگل ہو جائیں گے۔ وزڈم یا دانش برداشت سے آتا ہے۔ حوصلہ جب تک نہ آئے، وزڈم نہیں آتا۔ عقل آتی ہی تب ہے کہ جب آدمی اندر سے مرجاتا ہے۔ اگر آپ نے اپنے اندر کے ریڈ سگنل کو ختم کر دیا ہے تو پھر آپ کے اندر وزڈم آنے لگے گا۔ اس لیے پہلے وہ کام تلاش کیجیے جو آپ کو قیمتی بنائے، پھر وہ جگہ تلاش کیجیے جہاں قیمتی لوگ کی قدر کی جاتی ہے۔

ہر نبی کی زندگی میں ابوجہل آتے ہیں، فرعون آتے ہیں، شداد آتے ہیں، نمرود آتے ہیں۔ وہ اس لیے آتے ہیں کہ جب کبھی آپ کی زندگی میں اس طرح کے لوگ آئیں تو آپ انہیں کبھی ریڈ سگنل نہ بنائیں۔ کبھی اپنے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک بندے کے پاس اتنی طاقت ہو کہ وہ آپ کا نصیب لکھ دے۔ وہ کبھی بھی نہیں لکھ سکتا۔ آپ نے اپنی کامیاب کہانی خود لکھنا ہے۔ جب آپ مضبوط ہوتے ہیں تو پھر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر آپ خود کمزور ہیں تو پھر آپ کا نصیب دوسروں لوگوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ نصیب تب آپ کے اپنے ہاتھ میں آتا ہے کہ جب آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت میرے آگے ریڈ سگنل نہیں بنے گی۔ قدرت تو مجھے روک سکتی ہے، لیکن انسان، واقعات و حالات مجھے نہیں روک سکتے۔ انسان کو اشرف المخلوقات کہا ہی اس لیے گیا ہے کہ

اس کو کسی بھی طرح کے حالات روک نہیں سکتے۔ جب انسان ارادہ کر لیتا ہے تو پھر اس ارادے کے آگے ساری کائنات سرنگوں ہو جاتی ہے۔

بیدار انسان لوگوں کے نصیب کو بدل دیتا ہے، اس لیے بڑے انسانوں کے ہاتھ پر زمانوں کا نصیب لکھا ہوتا ہے جبکہ چھوٹے انسان کا اپنا نصیب دوسرے کے ہاتھ پر لکھا ہوتا ہے۔ استاد وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ پر اپنے شاگردوں کا نصیب لکھا ہوتا ہے۔ ایک سوچنے والے زندہ انسان کے خیالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نہیں بدلتا تو پتھر نہیں بدلتا۔ وہ لوگ جو بدلتے نہیں ہیں، پتھر ہیں، جن کی سوچ نہیں بدلتی وہ جانوروں سے بدتر ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے ایک شعر کا مفہوم ہے کہ آپ کا نصیب اس وقت بدل جاتا ہے جس لمحے آپ کے خیالات بدل جاتے ہیں۔ اگر آپ کے خیال بدلنے شروع ہو گئے ہیں تو پھر آپ یقین کر لیجیے کہ آپ کا نصیب بدلنا شروع ہو گیا ہے۔ دنیا میں خوش بختیاں بہ ظاہر بدبختیوں کی شکل میں آتی ہیں۔ ہمیں ان کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ ہم جس چیز کو بہت برا سمجھ رہے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسی میں انعام رکھا ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے قیمتی چیزیں سخت حالات میں ملتی ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ بندہ اس کو سنبھالنے کے قابل ہو جائے۔ جو پائلٹ طیارہ اڑا رہا ہوتا ہے، اسے کہا جاتا ہے کہ جب بھی طیارہ تباہ ہونے لگے تو تم نے طیارہ تباہ کر دینا ہے، مگر خود کو بچا لینا ہے کیونکہ تم طیارے سے زیادہ قیمتی ہو۔ اس لیے قدرت آپ کو قیمتی چیز تب دیتی ہے کہ جب آپ اسے سنبھالنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کامیابی چاہتے ہیں تو پھر اپنے اندر اہلیت پیدا کیجیے، محنت کیجیے۔

اسلام میں تزکیہ اپنی بہتری کا نام ہے۔ ہم صرف نمازیں پڑھنے، عبادتیں کرنے کو تزکیہ سمجھتے ہیں جبکہ عبادت کا مطلب ہے کہ ہم میں بہتری آجائے، ہم اپنی زندگی کو سمجھ جائیں۔ ہم یہ سمجھ جائیں کہ میری زندگی کو "وہ" چلا رہا ہے جو تمام جہانوں کا مالک ہے۔ اس نے مجھے بھی طاقت دی ہے کہ میں اپنا نصیب خود لکھ سکوں۔ وہ کہتا ہے کہ میرے ساتھ وعدہ

کرو کہ تو اچھے کام کرے گا تو اس کے عوض میں تجھے اتنی طاقت دوں گا کہ تو اپنا نصیب خود لکھ سکے گا۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ "دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا۔۔سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا" وہ کہتا ہے کہ تم منافقت چھوڑ دو، موم بن جاؤ یا پتھر بن جاؤ۔ ایک چیز کا فیصلہ کرو کہ تم چاہتے کیا ہو۔ جو تم چاہتے ہو، اس کے مطابق اپنے میں بہتری لاؤ۔

زندگی میں جتنے بھی ریڈ سگنل آتے ہیں، وہ نارمل ہے۔ یہ تو کبھی عظیم ہستیوں کو آئیں ہیں۔ انہوں نے ان ریڈ سگنلوں کو اہمیت نہیں دی۔ اگر آپ کے دماغ کوئی خیال ایسا آ گیا ہے جو ریڈ سگنل بن رہا ہے، اس کو آپ فوراً نکال دیں کیونکہ بعض اوقات خیال اتنی طاقت پکڑ جاتا ہے کہ وہ ہمیں زیر کر دیتا ہے۔ ہمیں زیر نہیں، زبر ہونا ہے۔ حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں، "اپنے دل کے دروازے پر دربان بن کر بیٹھو، سوچو کہ کیا آ رہا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ دل میں رکھنے کے قابل ہے تو اس کو رکھو، اگر نہیں ہے تو اس کو نکال دو۔"

ترجیحات کا تعین

ننانوے فیصد لوگ ایسے ہیں جو اپنی ترجیحات طے نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ درست فیصلہ نہیں کر پاتے۔ فیصلہ سازی اس کیلئے بہت آسان ہوتی ہے جس نے اپنی ترجیحات طے کی ہوتی ہیں۔ "ہاں" اور "ناں" کرنا تب بہت آسان ہوتا ہے کہ جب ترجیحات کا تعین ہوتا ہے۔ زندگی گزارنا اہم نہیں ہے، ترجیحات کے ساتھ گزارنا بہت اہم ہے۔ پروفیسر احمد رفیق اختر فرماتے ہیں، "دنیا میں خوش بخت انسان وہ ہے جو مناسب وقت میں اپنی ترجیحات کا تعین کر لے۔" دنیا میں کوئی وقت مناسب نہیں ہوتا۔ وہی وقت بہترین ہوتا ہے کہ جس وقت یہ احساس پیدا ہو جائے کہ میں نے ترجیحات والی زندگی گزارنی ہے۔

اشوک کا دور تھا۔ دہلی، ملتان اور لاہور کے درمیانی علاقے کو "کلنگ" کہا جاتا تھا۔ اشوک نے اپنی بادشاہت قائم کرنے کیلئے اپنے ننانوے بھائی قتل کر دیئے۔ انہیں قتل کرنے

کے بعد جب وہ سپر پاور بن کر نکلا تو اس وقت کے پنڈت نے اس کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکا لگایا۔ جیسے ہی اس کو ٹیکا لگایا گیا، اسے ایک لمحے کیلئے احساس ہوا کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ صرف ایک ٹیکا لگوانے کیلئے میں نے ننانوے بھائی قتل کر دیئے۔ اس نے اپنے کلنگ کے ٹیکے کو مٹا دیا اور اسی وقت اس نے اپنی تلوار گرائی اور اپنی باقی زندگی خدمت میں گزار دی۔ عام طور پر جب بھی بندہ اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہے، وہ اپنا ماتھا صاف کرتا ہے، یعنی وہ اپنے کلنگ کے ٹیکے کو صاف کرتا ہے۔

جو آدمی کسی بھی وقت ترجیحات کے تعین کی طرف چلا جاتا ہے، پھر وہ عام نہیں رہتا۔ وہ بہتر زندگی گزارنے والا بن جاتا ہے۔ ترجیحات کے تعین کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں کیا، کتنا اور کیوں اہم ہے۔ ممکن ہے، کسی کیلئے فیملی اہم نہ ہو، مگر ایک لمحے کیلئے سوچیں کہ فیملی کتنی اہم ہوتی ہے۔ ممکن ہے، کسی کیلئے صحت اہم نہ ہو، مگر غور کیجیے کہ صحت ہے تو زندگی کا لطف ہے۔ ترجیحات کا تعین بتاتا ہے کہ صحت کتنی ضروری ہے۔ ممکن ہے، کسی کیلئے سوسائٹی، دوست، محبت، اخلاص اہم نہ ہوں مگر جو ترجیحات کا تعین کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ میرے لیے بہت ضروری ہیں۔ ممکن ہے، کسی کی زندگی میں سب کچھ ہو، مگر مالک کے ساتھ تعلق کا احساس نہ ہو۔ ممکن ہے، آپ کی زندگی میں شہرت ہو، مگر امن نہ ہو۔

جاوید چوہدری کہتے ہیں، ''جو انسان چائے کا کپ انجوائے نہیں کر سکتا، اسے امن نہیں مل سکتا۔'' ہم کتنے ہی مہنگے کھانے کھاتے ہیں، مگر انہیں محسوس نہیں کرتے۔ ہم بھی اپنے بچے کی معصومیت کو محسوس نہیں کرتے۔ کئی لوگوں کو گیلے گھاس پر چلنا بھول چکا ہوتا ہے، کیونکہ انہوں نے گیلے گھاس پر چلنا محسوس نہیں کیا ہوتا۔ ہمارے احساس میں یہ چیز آتی ہی نہیں کہ ہمارے پاؤں کے تلووں پر کبھی گیلا گھاس بھی لگا تھا۔ ہم زندگی میں اپنے بچپن کی چھوٹی چھوٹی یادوں کو بھول جاتے ہیں اور یونہی ترجیحات کے بغیر زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔

☆ دو نفل ایک گھنٹہ لگا کر اپنی ترجیحات کا تعین شروع کیجیے اور یہ عمل 21 دن جاری رکھیں۔

قابلیت

قابلیت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ یہ تین انعام دیتی ہے:

1 شناخت

قابلیت آپ کو شناخت دیتی ہے۔ اگر ابھی تک قابلیت کی وجہ سے آپ کی شناخت نہیں بنی تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ آپ میں قابلیت نہیں ہے، صرف قابلیت کا واہمہ ہے۔ فرض کیجیے، وسیم بھائی کہتے ہیں کہ میرے پاس ٹیم بنانے کی صلاحیت ہے۔ لیکن اگر ایک عرصے تک اس کی ٹیم نہیں بنی اور اسے کسی نے مانا نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وسیم میں قابلیت نہیں ہے۔ ٹیلنٹ شرارتی بچے کی طرح ہوتا ہے۔ اگر اس کو بند کمرے میں رکھ دیں تب بھی دستک دیتا رہتا ہے۔ آپ میں جو بھی قابلیت ہے، وہ آپ کو دستک ضرور دے گی اور یہ دستک دوسروں کو سنائی دے گی۔ وہ باہر کی دنیا کو بتائے گی کہ میں ہوں۔ مجھے باہر نکالو۔ آکسیجن کی طرح شناخت بھی ہماری ضرورت ہے۔

2 تعریف

آپ کی قابلیت کی وجہ سے آپ کو تعریف ملنے لگتی ہے، آپ چاہیں یا نہ چاہیں، لوگ آپ کو دل سے چاہنے لگتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ آپ کے مخالفین کو بھی آپ کی قابلیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

3 شہرت

اگر آپ نے اپنی قابلیت کا پروفیشنل اظہار کیا ہے تو پھر وہ شہرت میں بدل جائے گی۔ کئی علاقوں میں کسی خاص چیز کی مشہوری ہوتی ہے، جیسے پورے پاکستان میں قصور کا فالودہ بڑا مشہور ہے۔ یاد رکھیے، جب بھی کسی چیز کی قابلیت ہوگی، وہ مشہور ہو جائے گی۔ اگر آپ کو

اپنی قابلیت پر واقعی یقین ہے تو پھر آپ شہرت کی پروا چھوڑ دیں۔ شہرت کو جوتی کی نوک پر رکھیں، وہ آکر ہی رہے گی۔ اگر قابلیت نہیں ہے تو پھر مشہور ہونے سے ڈریں۔ اللہ تعالیٰ ایسی شہرت سے بچائے جو قابلیت و صلاحیت کے بغیر ہو، کیوں کہ وہ جلد طنز میں تبدیل ہوتی ہے۔ دنیا میں ایسے کئی لوگ ہیں جو صلاحیت کے بغیر مشہور ہونے کی وجہ سے نفسیاتی مریض بن گئے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ اے میرے مالک، مجھے قابلیت کے بغیر نام نہ دینا، پہلے مجھے قابل بنا۔

اس حوالے سے ایک مشق کر لیجیے۔ درج ذیل سوال کا جواب لکھیے اور اسے پڑھیے:

سوال: پانچ سال بعد آپ کس شناخت سے جینا چاہتے ہیں؟

جواب:

آپ کو بھی پہچانا جانا ہے، اس لیے بڑی سوچ سمجھ کے ساتھ اس سوال کا جواب لکھیں۔ جب بھی اس سوال کا جواب اللہ تعالیٰ سے مانگیں تو کبھی بھی اپنی اوقات دیکھ کر نہ مانگیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق مانگیں کیونکہ جو دینے والا ہے اس کے خزانے میں کمی نہیں آئے گی۔ اگر اس سے نہ مانگو تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ جب وہ دینے والا ہی مالک ہے تو پھر حوصلے کے ساتھ اپنی شناخت مانگیں۔ پیسہ آپ کے کام کی دُم ہوتی ہے۔ عموماً لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ دُم کو ٹارگٹ بنا لیتے ہیں، کام کو ٹارگٹ نہیں بناتے۔ اس لیے شناخت کو ٹارگٹ بنائیے۔ جو آدمی اپنی شناخت پر کام کرتا ہے، وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے اپنے آپ کو منوا لیتا ہے۔ فرض کیجیے، اگر آپ لکھاری ہیں تو لکھ لیجیے کہ پانچ سال بعد لکھنا آپ کی شناخت ہوگی۔

آخری سیب

روبن شرما کچھ لوگوں کو ٹریننگ دے رہا تھا۔ اس نے تمام شرکا میں ایک ایک سیب تقسیم کیا اور کہا کہ اسے کھائیں۔ وہ سب سیب کھانے لگے۔ ان میں سے کوئی جلدی سیب

کھا گیا، کوئی ایک منٹ میں، کوئی دو منٹ میں، کوئی دوسروں کو دیکھتا رہا۔ غرض ہر کوئی اپنے حساب سے سیب کھاتا رہا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ مشق ختم ہوئی۔ پھر نئے سیب دیئے گئے۔ ایک ایک سیب دینے کے بعد اس نے کہا کہ اب اس سیب کو کھانا ہے، لیکن یہ یاد رہے کہ یہ سیب آپ کی زندگی کا آخری سیب ہے۔ یہ سننے کے بعد سارے لوگ اپنے اپنے سیبوں کو مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔ جب انسان کو یقین ہوتا ہے کہ یہ میرا آخری سیب ہے تو وہ اس سے مزا لینے لگتا ہے۔ روبن شرما کہتا ہے کہ یہ جو لمحہ آپ گزار رہے ہیں، یہ بھی آخری سیب ہی ہے۔ یہ جو آپ دن گزار رہے ہیں، یہ بھی آخری سیب کی طرح ہے۔ یہ جو وقت آپ گزار رہے ہیں، یہ بھی آخری لمحہ ہے۔ مگر ہمیں واہمہ ہوتا ہے کہ شائد یہ آخری نہیں ہے، ابھی تو زندگی بہت باقی ہے۔

جب آدمی کو یہ ادراک ہو جاتا ہے کہ وہ جو لمحہ گزار رہا ہے، وہ آخری ہے تو وہ اسے شان دار بناتا ہے۔ تب وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ ایک آدمی اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے تو وہ شان دار ہے۔ شان دار کی سطح، ہر فرد کیلئے مختلف ہوتی ہے۔ ہم ساری زندگی انتظار کرتے ہیں کہ اگلے وقت میں بہتر کریں گے، مگر وہ وقت نہیں آتا۔ آپ کیلئے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کرنا شروع کر دیں۔ یہ اظہار ایک وقت کا، ایک زمانے کا، ایک صورتحال کا، ایک دن کا اور ایک لمحے کا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، آج آپ کی بہترین صلاحیت کچھ اور ہے، دس سال پہلے کچھ اور تھی... اسی طرح، آنے والے وقتوں میں بہترین صلاحیت کے اظہار کا تصور بدل جائے گا، کیونکہ آپ میں بہتری آرہی ہے۔

ہم دنیا کے کیلنڈر پر لاکھ جادو کر لیں ممکن نہیں ہے کہ آج کا دن آپ کی زندگی میں دوبارہ آئے اس لیے آج کے دن کو سلام کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو انعام کے طور پر دیا ہے اس کا بہترین استعمال کریں کبھی بھی زندگی میں کوئی چیز ضائع کرنے لگیں تو آخری

جیب کو ضرور یاد کیا کریں اس تصوری سے یہ فائدہ ہوگا کہ آپ کے جذبات بدل جائیں گے۔ کسی کو بھی یقین نہیں ہوتا کہ وہ آنے والے کل میں زندہ ہوگا یقین صرف یہی ہے کہ اس وقت سانس چل رہی ہے جب کل کا یقین ہی نہیں ہے تو پھر آج کا دن دنیا کا سب سے قیمتی دن ہے کیونکہ اس نے دوبارہ نہیں آنا۔ آج سے سو سال بعد ایک تاریخ لکھی جائے گی جس میں لکھا جائے گا کہ فلاں جگہ کچھ نہیں ہوتا تھا صرف کھیت ہی کھیت ہوتے تھے مگر وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا شہر بن گیا جبکہ بندہ ملکیت بنا کر بیٹھا ہوا ہے ایک لمحے کے لیے سوچیں کہ سو سال پہلے والا بھی یہی سوچتا تھا کہ میں نے یہی رہنا ہے اور شائد وقت بھی ختم نہیں ہونا۔

آپ سو سال پیچھے چلے جائیں اور ایک لمحے کیلئے سوچنے کہ سو سال پہلے تو ہمارے والدین بھی نہیں تھے، ہمارے وجود کی تو دور کی بات ہے۔ پتا ہی نہیں ہے کہ اس نام کے کسی انسان کو دنیا میں آنا ہے۔ اسی طرح، آپ سو سال آگے چلے جائیں اور غور کیجیے کہ ہم نہیں ہوں گے۔ اور شائد ہمارا نام اور وجود بھی نہ ہو۔ جب سو سال بعد ہمارے وجود نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی، ہم کائنات میں کسی اور جگہ ہوں گے تو ہم محسوس کریں گے کہ ہم تو جی کر ہی نہیں آئے۔ مجھے تو صرف ایک ہی سیب ملا تھا اور میں اس واہمے کے ساتھ اس سیب کو کھا گیا کہ اور سیب بھی ملیں گے۔ زندگی تو ایک بار ملی ہے اور ہم نے ایک بار کی زندگی کو ایک دم سے ہڑپ کر کے ضائع کر دیا۔ یوں ہماری پوری زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔



علم

"علم، عمل کے بغیر پاگل پن، اور عمل، علم کے بغیر جہالت ہے۔"

امام غزالیؒ

طلب صادق

اہل علم کی تلاش وہ کر سکتا ہے جس کے پاس طلب صادق ہے۔ طلب صادق وہ پہلا قدم ہے جو اس سفر میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایسے بے شمار ناموں کو جانتے ہیں جو علم والے ہیں، مگر کبھی ان سے ملاقات نہیں کی۔ اہل علم کے حوالے سے لاہور بڑا زرخیز ہے۔ یہاں بے شمار اہل علم، اسکالرز، ادیب اور قلم کار موجود ہیں۔ مگر اس کے باوجود لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو ان کے نام سے واقف تو ہیں، مگر ان سے آگاہ نہیں ہیں۔ ایک ایسا شخص جس کو شہد لگا ہو، لوگ مکھیوں کی طرح اس کی تلاش میں ہوں اور پاس بیٹھا ہوا شخص آگاہ نہ ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ پاس بیٹھا شخص چاہے بہت ہی قریب کیوں نہ بیٹھا ہو، اس کا ظاہری فاصلہ چند میٹر ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر اس کے پاس طلب صادق نہیں ہے تو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اسے کوئی صاحب علم مل جائے اور وہ علم دے دے جس سے نصیب بدل جائے۔ مگر یہ فارمولا نہیں ہے۔ عموی طور پر علم حاصل کرنے کیلئے بہت سارے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں پہلا مرحلہ طلب صادق ہے۔

فاصلے ان کیلئے ہوتے ہیں جن کے پاس شوق نہیں ہوتا۔ اگر انسان صاحب شوق ہو تو پھر وہ صاحب منزل بن جاتا ہے اور منزل بھی مل جاتی ہے۔ اگر آپ شوق اور طلب صادق

سے چلتے ہیں تو پھر فرد کے ساتھ فرد جڑیں گے۔ انسان کے ساتھ انسان جڑے گا، علم والے کے ساتھ علم والا جڑے گا اور چلتے چلتے آپ حیران ہوں گے کہ آپ کیا تھے اور کیا سے کیا ہو گئے۔ پتا چلا کہ کیا سے کیا بنانے والے لوگ آپ کی زندگی میں آ گئے۔ ایک شخص درویش کے پاس چلا گیا۔ کئی دن اس کی خدمت کرتا رہا۔ اس کو گمان تھا کہ یہ درویش تانبے کو سونا بنانا جانتا ہے۔ کئی دنوں کی ریاضت اور خدمت کے بعد بھی وہ راز سامنے نہیں آیا اور اس دوران درویش کو اس کے ارادے کی خبر ہو گئی کہ یہ کس خاص مقصد کیلئے میرے پاس آیا ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ درویش نے اس سے پوچھ لیا کہ کئی دن سے تم یہاں موجود ہو، بڑے چکر کاٹ رہے ہو، سچ سچ بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو؟ اس نے کہا کہ میں تانبے سے سونا بنانے کی کیمیا گری چاہتا ہوں۔ درویش نے پاس پڑا صندوق کھولا۔ اس میں سے مٹی کا ڈلا نکالا۔ پاس ایک دیگچی موجود تھی۔ اس میں وہ ڈلا ڈالا۔ نیچے آگ جلائی اور اس کو پگھلا دیا۔ چمکتی ہوئی حالت میں سونا تیار ہو گیا۔ پھر اس دیگچی کو پکڑا۔ پاس ہی گندی نالی تھی۔ اس میں بہا دیا اور کہنے لگا، یہ مٹی سے سونا بنانے کا فن تھا۔ شاید اس پہ میں فخر نہ کر سکوں، لیکن میں اللہ تعالیٰ کا وہ بندہ ہوں جو اس بات پر فخر کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عام سے انسان کو ہیرا بنانے کا فن ضرور دیا ہے۔ یہ صاحب علم کا کمال ہے کہ عام سا انسان جو کسی قابل نہیں ہوتا، چند ہی سال میں وہ کہتا ہے کہ میں کیسے شکر ادا کروں کہ میں کون تھا اور کہاں پہنچ گیا۔

علم اور علم والا آپ میں سنجیدگی لے کر آتا ہے۔ اگر علم بھی آ گیا ہے اور علم والا بھی زندگی میں آ گیا ہے لیکن زندگی میں سنجیدگی نہیں آئی تو پھر نہ علم آیا ہے اور نہ علم والا آیا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا برسات کی بارش ہو اور آپ نہ بھیگیں۔ یہ قدرت کے قوانین کے خلاف ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کو یہ چیزیں میسر آئیں اور اس کے نتیجے میں زندگی میں سنجیدگی نہ آئے۔ اہل علم کی صحبت کا پہلا انعام یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں سنجیدگی آ جاتی ہے۔ اس سے پہلے آپ کی زندگی ایسے ہی گزر رہی ہوتی ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے اور زندگی

یوں ہی تمام ہوتی ہے۔ جب بھی آپ میں سمجھ کی آتی ہے تو پھر آپ کو کوئی بھی مسئلہ آتا ہے تو آپ کو اس مسئلے سے ڈر نہیں لگتا۔ ڈر اس بات سے لگتا ہے کہ کہیں میرا وقت ضائع نہ ہو جائے۔ یہاں لوگوں کا انعام ہوتا ہے جو زندگی کی قدر رکھاتے ہیں۔

اپنے علاقے، اپنے قصبے، اپنے شہر میں تلاش کیجیے کہ علم والے لوگ کہاں ہیں۔ اگر یہ آپ کی طلب نہیں ہے تو پھر آپ بڑے بدقسمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دور میں پیدا کیا ہے کہ جب سفر کرنا بہت آسان ہے، کسی تک پہنچنا بہت آسان ہے، کسی کی کتاب پڑھنا اور خریدنا بڑا آسان ہے، انٹرنیٹ ہے، سرچ کرنا بڑا آسان ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے زمانے کے اہل علم تک نہیں پہنچے تو پھر بدقسمتی ہے۔

سیکھنا

انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جس میں بچہ پانچ سال تک اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ ماں اسے وقت دیتی ہے جس کی وجہ سے ماں کی شخصیت بچے میں نظر آتی ہے۔ باپ اس کو شفقت دیتا ہے۔ ہم زندگی کا ایک بڑا عرصہ اپنے والدین کے بغیر نہیں گزار سکتے جبکہ باقی تمام مخلوقات تھوڑا ہی عرصہ اپنے والدین کے ساتھ گزارنے کے بعد انہیں چھوڑ دیتی ہیں۔ کئی جانور ایسے ہیں جو پیدا ہوتے ہی اپنے والدین کو نہیں دیکھتے، چلے جاتے ہیں اور خود سے اپنی زندگی گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔

انسان جس کے ساتھ بھی وقت گزارتا ہے اس سے سیکھتا ہے۔ اور وہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ اس سیکھے ہوئے سے خود کو اور دوسروں کو جانچتا ہے۔ ہم لوگ پیدا ہوتے ہیں تو ہمارے کان میں اذان دی جاتی ہے۔ ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ مسلمان کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان ہوتا ہے۔ ہمیں مذہب کا علم ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ہمیں اسلامیات کی کتاب، قاری صاحبان، علمائے کرام سے ملتا ہے۔ جب ہم بڑے ہوتے ہیں تو ہم کو پتا ہے جمعہ کا خطبہ سنتے ہیں، مذہبی لیکچر سنتے ہیں، مذہبی تقریریں سنتے

ہیں۔ مجالس سنتے ہیں، ہم ان تمام جگہوں پر بیٹھتے ہیں جہاں ہمیں مذہبی علم ملتا ہے۔ جب ہم بار بار مذہبی علم لیتے ہیں اور اس علم کی بنیاد پر خود کو اور دوسروں کو جانچتے ہیں تو ہم مزید سیکھتے ہیں۔ علم جب بھی ملے گا کہ جب یہ ہمارے لیے پیمانہ بن جائے گا۔ ہم چونکہ معاشرے میں رہتے ہیں اور معاشرے کے کچھ رسم و رواج ہوتے ہیں، اس لیے ہم معاشرے سے بھی علم لیتے ہیں۔ اس علم کے ذریعے بھی خود کو جانچتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ معاشرے کا ایک علم ایک معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے تو وہی دوسرے معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے۔ میڈیا یا اشتہارات بھی ایک ذریعہ ہیں جن سے ہم علم لیتے ہیں۔

ہمارے علم لینے کے پانچ ذرائع ہیں۔ ہم علم کان سے لیتے ہیں، آنکھوں سے لیتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، سوچتے ہیں اور سونگھتے ہیں۔ علم ہمارے پاس براہ راست نہیں آتا۔ ہمارے پاس آنے سے پہلے چھلنیاں لگی ہوتی ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ ہم نے کیا قبول کرنا ہے اور کیا قبول نہیں کرنا۔ یہ شروع میں مضبوط نہیں ہوتیں، کمزور ہوتی ہیں۔ ہم جب تک پختہ نہ ہو جائیں، جب تک صحیح ضابطے اور اصول نہ پتا لگ جائیں، یہ کمزور ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے بچپن میں اگر غلط علم ملتا رہے تو یہی علم یقین بن جاتا ہے۔

علم یا تو فائدہ دیتا ہے یا نقصان دیتا ہے۔ اگر فائدہ دیتا ہے تو ہمیں خوشی ملتی ہے اور ہم اس علم کو بار بار استعمال کرتے ہیں۔ علم اگر نقصان دے تو وہ شرمندگی کا باعث بنتا ہے۔ ہمیں زندگی میں کئی بار شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ شرمندگی ہمیں یاد رہتی ہے۔ پھر یہ ساری شرمندگی اکٹھی ہو کر جرم کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ ہم لوگ کبھی نہیں سوچتے کہ ہم جس علم کے ذریعے خود کو جانچ رہے ہیں، وہ صحیح ہے یا نہیں ہے۔

علم و دانش

علم کا آغاز انسان سے ہوتا ہے۔ اصل علم تو نصابی کتابوں سے ہٹ کر ہے۔ جو شخص علم کی بات کرتا ہے، ان علمی باتوں سے علمی عضلات فعال ہوتے ہیں جس کی وجہ سے علم

رہتا ہو تو علم نہیں ملتا۔ فائدہ ہمیشہ وہ شخص اٹھاتا ہے جس نے پیاس محسوس کی ہو۔ آپ طلب لے کر نکلیں، راستے خود بنیں گے۔ علم والے کے ساتھ علم والا جڑا ہوتا ہے۔ انسان کے ساتھ انسان جڑا ہوتا ہے۔ خدا کو منظور ہوتا ہے کہ آپ کی اندر کی بہتری ہو، آپ دنیا میں جیسے آئے ہیں، اسی طرح دنیا سے نہ جائیں، بہتری کے ساتھ جائیں۔ جانور کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ صرف ایک وقت پر اتنا قابل ہوتا کہ وہ نئی زندگی کو جنم دے سکے، مگر اس کی زندگی میں سیکھنا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر انسان کو دیکھیں تو وہ سیکھتا ہے۔ اس کی زندگی میں صاحبانِ علم، درویش، فقیر ہوتے ہیں۔ اگر آپ آج کے دور میں رہتے ہوئے اپنے زمانے کے بہترین لوگوں تک نہیں پہنچے تو ضرور ان تک پہنچیں۔

جب آپ اپنے بارے میں جاننے لگتے ہیں تو خود آشنائی آسان ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے ایک کمرے میں اندھیرا ہو اور ایک دم سے روشنی ہو جائے تو جو چیزیں جہاں پر پڑیں تھیں، وہیں پر نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ علم روشنی ہے۔ علم کا کمال ہے کہ یہ جیسے ہی زندگی میں آتا ہے، انسان اپنے آپ کو دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کو نظر آتا ہے کہ راستہ کہاں ہے، دروازہ کہاں ہے، کھڑکی کہاں ہے اور میں کہاں ہوں۔ علم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ خود سے آگاہ ہونے لگتے ہیں۔ علم والے کی سب سے بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ انسان سوالات کے راستے پر آجاتا ہے۔ اس سے پہلے سوالات نہیں ہوتے، صرف رٹے ہوتے ہیں۔ یہ سوالات جگاتے ہیں۔ سوالوں کا اٹھنا جوابوں کی پکار ہے۔ یہ جیسے ہی اٹھتے ہیں، ویسے ہی جواب ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔

اپنی زندگی میں ایک کام ضرور کیجیے۔ آج ہی پورے شہر کی فہرست بنائیے کہ کون کون سے ایسے لوگ ہیں جن کی فکری مجالس ہوتی ہیں اور وہ کہاں ہوتی ہیں۔ ان کو تلاش کیجیے۔ جو آج کے زمانے میں رہتے ہوئے پرانی ٹیکنالوجی کے ساتھ رہ رہا ہے، وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ مرا ہوا ہے۔ آج کے زمانے کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ آج کے زمانے کی ٹیکنالوجی کو

استعمال کیا جائے۔ اگر آپ اسے استعمال کر رہے ہیں تو آج کے زمانے میں جتنے صاحبان علم ہیں ان تک ضرور پہنچیں۔ کیا پتا، آپ کا حصہ آپ کا انتظار کر رہا ہو۔

علم کی تلاش

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ دنیا میں مزاج کے لحاظ سے 17 قسم کے لوگ ہیں، پروفیشن کے لحاظ سے 13 قسم کے لوگ ہیں اور جذبات کے لحاظ سے 27 طرح کے لوگ ہیں۔ اسی طرح، ذہن کے لحاظ سے بھی لوگ تقسیم ہیں، کیونکہ قدرت کو پتا ہے کہ اگر سب لوگ آئن سٹائن بن جائیں گے تو یہ نظام نہیں چل سکتا۔ ہمارے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ ہم نے وہی روایتی سوچ اپنائی ہوئی ہے کہ ڈاکٹر بن جاؤ، پائلٹ بن جاؤ، انجینئر بن جاؤ وغیرہ وغیرہ۔ صرف ڈاکٹر یا انجینئر بن جانا کمال نہیں ہے۔ اپنے مزاج کو دیکھیے کہ قدرت نے آپ کے اندر کیا ٹیلنٹ رکھا ہوا ہے۔ اگر آپ اس کو لے کر آگے چلتے ہیں تو اس میں ترقی کر جاتے ہیں۔ یاد رکھیں، کسی فیلڈ میں اسکوپ نہیں ہوتا، صلاحیت کا اسکوپ ہوتا ہے۔ اگر آپ میں صلاحیت ہے تو پھر اسکوپ ہے۔ دنیا میں بہت سے ڈاکٹر کامیاب ہیں اور بہت سے ناکام ہیں، کیونکہ جس میں صلاحیت ہوتی ہے وہ آگے نکل جاتا ہے۔ بغیر صلاحیت والا رک جاتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اپنے آپ کو تلاش کیجیے، پھر فیلڈ کا انتخاب کیجیے۔

اپنی تلاش کے متعلق حضرت بابا بلھے شاہؒ فرماتے ہیں، ''اپنے اندر جھاتی مار'' اسی کو حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی!'' اسی کو حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں، ''تیرے اندر آب حیاتی ہو۔'' ہمیں چلانے والی چیز تو ہمارے اندر ہوتی ہے جبکہ ہم اسے باہر تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم زمانے کو دیکھ کر ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں، جبکہ قدرت ہمیں اچھا پروفیسر بنانا چاہتی ہے۔ جس پروفیشن کیلئے انسان بنا ہوتا ہے،

اس میں عزت اور پیسہ لازمی طور پر آتے ہیں جبکہ جو آدمی شوق کے ساتھ کام نہیں کرتا وہ صرف پیسے کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اسے پیسہ تو مل جاتا ہے، مگر عزت نہیں ملتی۔ عزت تب ہی ملتی ہے کہ جب شوق اور پروفیشن ایک ہوتے ہیں۔

ہر کسی کے پاس مختلف علم ہوتا ہے۔ وہ جن ذرائع سے اس کے تک پہنچتا ہے، وہ ذرائع پانچ ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ہماری آنکھیں آتی ہیں۔ ہم جو کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ علم ہماری یادداشت کا حصہ بن جاتا ہے۔ دوسرا، ہمارے کان ہیں۔ ہم جو کچھ کانوں سے سنتے ہیں وہ علم بھی ہماری یادداشت کا حصہ بنتا ہے۔ تیسرا، ہم چیزوں کا ذائقہ چکھتے ہیں۔ ان سے جو ہمیں علم ملتا ہے وہ بھی ہماری یادداشت کا حصہ بن جاتا ہے۔ چوتھا، محسوس کرنا۔ ہم جہاں بیٹھتے ہیں، کسی چیز کو چھوتے ہیں، کپڑے پہنتے ہیں وغیرہ وغیرہ ان سب سے محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ علم بھی ہماری یادداشت کا حصہ بنتا ہے۔ پانچواں، سونگھنا، کسی بھی چیز کو جب ہم سونگھتے ہیں۔ اس سے بھی ہمیں علم ملتا ہے۔ وہ علم بھی ہماری یادداشت کا حصہ بنتا ہے۔

ان پانچ ذرائع کے علاوہ ایک چھٹا ذریعہ بھی ہے جسے "چھٹی حس" کہا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ چھٹی حس گفٹ کر دیتا ہے۔ دنیا کے جتنے نبی اور پیغمبر، بڑے دانشور، بڑے مفکر، صوفی گزرے ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ چھٹی حس گفٹ کرتا ہے۔ وہ اس حس کے ذریعے آنے والے زمانے کا پتا چلا لیتے ہیں۔

دنیا میں ہر شعور والے کے پاس پانچ حواس موجود ہوتے ہیں، لیکن ان حواسوں کے باوجود تمام انسانوں کا علم برابر نہیں ہوتا۔ کسی کا زیادہ ہوتا ہے تو کسی کا کم ہوتا ہے۔ علم برابر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں علم کی پیاس کا فرق ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس علم کی پیاس زیادہ ہے تو وہ اس کے ذریعے علم حاصل کر کے بڑا انسان بن جاتا ہے۔ علم کی پیاس نہ ہو تو سامنے سمندر بھی پڑے ہوں تو انسان ان سے ایک قطرہ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ علم کی پیاس

توجہ سے بنتی ہے۔

پیاس کے درجے ہیں اور اسی وجہ سے علم کے بھی درجے ہیں۔ جو جتنا پیاسا ہے وہ اتنا بڑا مفکر بن کر دنیا کے سامنے آتا ہے۔ جو علم کا پیاسا نہیں، وہ علم والوں کے پاس رہ کر بھی ابوجہل بن جاتا ہے۔ وہ شخص کیا ہوگا جو رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں ہدایت کی طلب نہیں رکھتا اور وہ مرنے سے پہلے کہتا ہے کہ اگر میری گردن کاٹنی ہے تو ٹھوڑی کے نیچے سے کاٹنا، کیونکہ سرداروں کے سر اونچے ہوتے ہیں۔ علم کے ہوتے ہوئے بھی اگر طلب اور تلاش نہیں ہے تو پھر کبھی آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ اگر آپ کے اندر ارادہ ہے، تلاش ہے، جستجو ہے کہ یہ زندگی مجھے ایک بار ملی ہے اور اللہ تعالیٰ کے بڑے انعاموں میں سے ایک انعام علم ہے، وہ مجھے حاصل کرنا ہے تو یہ علم کی پیاس کی علامت ہے اور اللہ کا بہت بڑا انعام۔

تاریخ کے عظیم استاد حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ ان کے شاگرد حضرت علامہ اقبالؒ آٹھ سو سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔ آپؒ اپنے استاد کے بارے میں فرماتے ہیں، "میں علامہ اقبال نہ ہوتا اگر میرا استاد جلال الدین رومی نہ ہوتا۔" انہوں نے آٹھ سو سال کا فاصلہ حائل ہونے کے باوجود بھی ان کے علم سے اکتساب فیض کیا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے استاد ہمارے سامنے ہوتے ہیں، لیکن ہم پھر بھی نہیں سیکھتے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، "اگر آپ کا علم آپ کی زندگی میں بہتری نہیں لا رہا تو پھر اس علم پر سوال ضرور اٹھائیں کہ یہ کون سا علم ہے۔" زندگی میں وہ علم حاصل کیجیے جس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، "علم نافع سیکھو!" علم نافع وہ ہے جو نفع دے۔ جو ہمارے ساتھ جڑے ہوئے لوگوں کو نفع دے۔ جو ہمیں ہمارے زمانے اور بعد کے زمانے میں بھی زندہ کر دے۔ جب ہم دنیوی زندگی میں رہیں تو فائدہ پہنچاتے رہیں اور جب چلے جائیں تو لوگ سلام کریں۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر...

جس نے اپنے مرشد کے علم کا رٹا لگایا ہے، وہ مصنوعی پھول کی طرح ہے۔ یہ پھول صدیوں بھی پڑا رہے تو یہ پھلتا پھولتا نہیں ہے۔ اس پر کوئی ایک نئی کونپل نہیں نکلتی۔ لیکن جو حقیقی پھول ہوتا ہے، وہ روز تبدیل ہوتا ہے۔ اس کی نئی کونپلیں نکلتی ہیں۔ انسان کا فکری ارتقا بھی قدرتی ہے۔ اس کو حافظے میں نہیں رکھنا پڑتا۔ یہ ساتھ چلنے والی چیز ہے۔ اہل علم آپ کو صاحب علم بناتے ہیں۔ صاحب علم وہ ہوتا ہے جو علم کی طلب کے راستے پر چلے۔ کہاں طلب کہ صرف ڈگری ہو، نمبر ہوں، نوکری ہو، روپیہ پیسہ ہو، اپنی بہتری ہو اور کہاں ایک نئی طلب آجائے کہ اپنی فکری نشوونما ہونے لگے۔ آپ کی زندگی میں ایک ایسا شخص آیا کہ اس نے آپ کو سوچنے پر مجبور کیا۔ نئے نئے افکار دیئے، نئے نئے خیالات دیئے۔ ان نئے افکار اور خیالات کا کمال یہ ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، اگر کوئی شعیب آئے میسر...شبانی سے کلیمی دو قدم ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی بڑی عطا یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کرتا ہے۔ اس کے بعد انسان اس کائنات کے سربستہ رازوں پر غور کرتا ہے۔ اس کے بعد انسان اپنے اور کائنات کے مابین تعلق کو استوار کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد انسان اپنے اور کائنات کے بنانے والے پر غور و فکر کرتا ہے۔ دنیا کی کسی مخلوق نے خداشناسی اور خودشناسی کی بات نہیں کی۔ آج تک کسی مخلوق کے دل میں یہ سوال نہیں اٹھا کہ بلھیا تو کون؟ یہ سوال صرف انسان کے دل میں اٹھا ہے کہ میں کون ہوں؟ میں نے جانا کدھر ہے؟ میری تلاش کیا ہے؟ میں کیا چاہتا ہوں؟ میری منزل کیا ہے؟ میرا مقصد کیا ہے؟ میرے آنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا میں نے اس کو تلاش کیا ہے یا میں ابھی ادھورا ہوں۔

ذرا سوچیے، گڈریے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، وہ پانچ سو بکریوں کا مالک ہوتا ہے، مگر شکل سے وہ گڈریا ہی لگتا ہے۔ وہ آدمی جو بھیڑوں کے ساتھ بھیڑ ہوا ہے، اگر اس کی زندگی

میں بھی کوئی شعیب آجائے، کوئی استاد آجائے، اہلِ دانش آجائیں، اہلِ فکر آجائیں، اہلِ عقل آجائے یا اہلِ سمجھ آجائے تو شبانی سے کلیمی پھر دو ہی قدم رہ جاتی ہے۔ کہاں گڈریا اور کہاں خدا سے ہم کلام ہونے والا شخص۔ وجہ یہ ہے کہ علم والا آپ کی آنکھ کو آپ پر کھول دیتا ہے۔ جب تکبیر ہوتی ہے تو ہم سب اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ علم اگر زندگی میں آجائے تو پھر آپ کے اندر ایک تکبیر ہوتی ہے، چاہتے نہ چاہتے یہ سوال کھڑے ہو جاتے ہیں کہ میں کون ہوں، میں کدھر جا رہا ہوں، میری زندگی میں کوئی مقصد ہے بھی یا نہیں ہے، کیا شب و روز گزارنا زندگی ہے، کیا دن تمام ہونا زندگی ہے، کیا ہفتے مہینوں کا بڑھ جانا زندگی ہے، کیا چند سال کا نام زندگی ہے یا کسی مقصد کا نام زندگی ہے؟ ایمرسن سے کسی نے پوچھا کہ تمہاری زندگی کتنی ہے؟ اس نے جواب دیا، تین سو ساٹھ سال۔ ہنس کر کسی نے کہا کہ تمہاری عمر تو ساٹھ سال لگتی ہے۔ اس نے کہا، ہے تو ساٹھ سال مگر میں فکری طور پر تین سو ساٹھ سال کا ہوں۔ جو آدمی اپنی جسمانی نمو پر بیٹھا ہوا ہے، وہ ذہنی طور پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جسمانی نمو قدرتی طور پر ہو جاتی ہے، ذہنی نمو (Mental Growth) کیلئے کاوش کرنی پڑتی ہے۔ ڈھونڈنا پڑتا ہے، سفر کرنا پڑتا ہے۔ آپ ایک سوال لے کر چلتے ہیں کہ آج کے دن میری نوکری میں کیا نئی بات آئی ہے، آج کے دن میں کون نے کون سا نیا یقین لیا ہے۔ آج کے دن میں نے علم کا کون سا نیا پھول چنا ہے۔ آج میرے ایمان اور یقین کے درجے کتنے آگے بڑھے ہیں، آج میری فکر کتنی بہتر ہوئی ہے۔

ایک دانشور مچھلی کو پانی سے نکال کر ہاتھ میں لے کر ہوا میں رکھتا۔ جب مچھلی تڑپنے لگتی تو وہ اس کو پانی میں دوبارہ چھوڑ کر کہتا کہ یہ پڑھی لکھی مچھلی ہے۔ لوگ کہتے، یہ کیسے پڑھی لکھی ہو گئی؟ وہ کہتا کہ پانی میں اسے احساس نہیں تھا کہ پانی زندگی ہے۔ جب اس کو باہر نکالا گیا تو اس کو پتا چلا کہ پانی کے بغیر اس کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ اب اسے پانی کی قدر آچکی ہے۔ یاد رکھیے، اس زندگی میں اگر کوئی آپ کو زندگی کی قدر دے، پھر وہ علم والا ہے، وہ فہم والا

ہے، وہ عقل والا ہے... پھر شانی سے کلیسی دو قدم ہے۔

علم اور عمل

گدھے پر ہزار کتابیں لاد دی جائیں تو وہ گدھا رہتا ہے۔ عمل کے بغیر علم بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ عمل کی اتنی اہمیت ہے کہ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ "عملوں کا دارومدار نیت پر ہے۔" ایسا ممکن ہے کہ علم کی کمی ہو، عمل اتنا طاقتور ہو کہ پاکستان بن جائے۔ جنہوں نے پاکستان بنایا ہے، وہ سارے لٹے پٹے آئے تھے۔ پاکستان بنانے کیلئے تعلیم نہیں چاہئے تھی، عمل چاہیے تھا۔ وہ انتہائی عمل اُن لوگوں نے کر کے دکھا دیا۔

دنیا کا گیارہ سال امیر ترین شخص رہنے والا بل گیٹس ہے جس کی تعلیم معاشرے کے حساب سے میٹرک ہے۔ اس کے پاس صرف عمل تھا جس کی وجہ سے وہ اتنا امیر ہو گیا۔ یہ ایکشن ہوتا ہے جس میں آپ چاند پر جانے کا علم نہیں حاصل کرتے بلکہ چاند پر پہنچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، آپ کسی سے پوچھیں کہ بلب بنانے کا طریقہ کیا ہے اور وہ بلب پر تقریر شروع کر دے۔ آپ پھر پوچھیں، بلب بناتے کیسے ہیں؟ وہ پھر تقریر شروع کر دے۔ آپ پھر پوچھیں، بلب ہوتا کیا ہے؟ وہ پھر تقریر شروع کر دے۔ آپ اسے بٹھا دیں گے اور اسے کہیں گے کہ آپ نے تقریر بہت اچھی کی ہے۔ بلب بنانا ایک کام ہے۔ بلب بنا کر دکھاؤ تو میں مانوں۔

لی آیا کوکا 1944ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین بہت غریب تھے۔ وہ معاش کی تلاش میں اٹلی سے امریکا چلے گئے۔ وہاں پر لی آیا نے محنت سے تعلیم حاصل کی اور انجینئرنگ میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے بعد اسے فورڈ کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ ترقی کرتے کرتے وہ کمپنی کا پریذیڈنٹ بن گیا۔ لیکن 1978ء میں کسی اختلاف کی وجہ سے اس نے کمپنی چھوڑ دی۔ اس کے بعد اس نے کرسلر کارپوریشن جوائن کر لی۔ اس وقت کمپنی بالکل

دیوالیہ ہو چکی تھی۔ لی آیا کوکا نے تین سال غیر معمولی محنت سے کمپنی کو کامیابی کے ساتھ چلایا۔ لی آیا نے اپنی خودنوشت لکھی جس میں اس نے اپنے تجربات لکھے ہیں۔ اس میں وہ کہتا ہے، ''کامیابی کی کنجی معلومات اور ڈگریاں نہیں ہیں۔ یہ دراصل افراد ہیں۔ اور میں کمپنی کے بڑے عہدوں کیلئے جس قسم کے افراد کی تلاش میں رہتا ہوں، وہ عمل کے شائق لوگ ہیں۔ یہ وہ آدمی ہیں جو اس سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں جتنی ان سے کرنے کی امید کی گئی ہو۔''

امید سے زیادہ کام کرنا سنجیدہ اور باعمل آدمی کی قطعی پہچان ہے۔ جو لوگ زیادہ کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہی لوگ اپنی زندگی میں امید سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ لوگ غیر معمولی نتائج دیتے ہیں اور غیر معمولی زندگی گزارتے ہیں۔

علم بڑھانا

اگر آپ اپنا علم بڑھانا چاہتے ہیں تو تین باتوں پر عمل کیجیے۔

1 عظیم لوگوں کی سوانح عمری پڑھیں، کیونکہ سوانح عمری پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ کتنے ایسے لوگ تھے جو ہماری طرح ہی تھے۔ انہوں نے کیا کچھ ایسا کیا کہ آخرکار ایک دن وہ کامیاب ہو گئے۔

2 ایسے ناول پڑھیں جس سے آپ کو معاشرے اور تاریخ کی باتیں مل سکیں۔ تاریخ سبق سکھاتی ہے۔ وہ ایک دن تاریخ بن بھی سکتا ہے۔ تاریخ پڑھنا اور چیز ہے جبکہ تاریخ بننا اور بات ہے۔ مثال دینے والے بے شمار ہوتے ہیں، مثال بننا بہت بڑا کام ہوتا ہے۔

3 وہ لوگ جو مشاہدہ کرتے ہیں، ان کا علم صرف کتابیں پڑھنے والوں سے بہتر ہوتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے مشاہدے اور تجربے اور غور و فکر سے نتیجہ اخذ کیا ہوتا ہے۔ غور و فکر اتنی اہم چیز ہے کہ فرمایا گیا ہے، ایک لمحے کا غور و فکر ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ یہ کیوں بہتر

ہے؟ شاید ستر سال کی عبادت کے بعد آپ کی شخصیت اتنی بہتر نہ ہو جتنا غور و فکر کرنے سے بہتر ہوگی۔ انسان جیسا پیدا ہوتا ہے، ویسا فوت نہیں ہوتا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی شخصیت کو بہتر بناتے ہوئے اس دنیا سے جائے۔

غلطی ختم کرنے کا طریقہ

ہمارا سارا علم ضروری نہیں کہ درست ہو۔ ممکن ہے، ہمارے ساتھی کے پاس وہ علم نہ ہو، اس کے والدین نے اور طرح تربیت کی ہو، اس کا مذہب اور طرح کا ہو، اس کا معاشرہ اور طرح کا ہو، اس نے اور طرح کا اشتہار دیکھا ہو۔ ہمیں جو علم ملتا ہے اسے ہم کبھی چیک نہیں کرتے کیونکہ ہمارے اندر کی چھنیاں کمزور ہوتی ہیں۔ چھننیوں نے ایک عمر کے بعد شعور کی زندگی میں پختہ ہونا ہوتا ہے۔

بچے کو نہیں پتا ہوتا کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے۔ جن گھروں میں زیادہ گالیاں دی جاتی ہیں ان کے بچے آرام سے گالی دیتے ہیں اور پھر ہنستے بھی ہیں۔ ان کے اندر یہ چھننی نہیں ہوتی۔ چھننی نہ ہونے کی وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ گالی دینا بہت اچھا کام ہے۔ چھننی نہ ہونے کی وجہ سے جو علم ہمارے پاس آتا ہے، وہ علم اکثر اوقات صحیح نہیں ہوتا کیونکہ وہ علم ذاتی تجربے اور حالات کی وجہ سے ہمارے پاس آتا ہے۔ جب ہم اپنے علم کی عینک سے خود کو دیکھتے ہیں تو بسا اوقات کالے نظر آتے ہیں۔ اصل میں ہم کالے نہیں ہوتے، ہمارا علم کالا ہوتا ہے۔

زندگی میں کبھی بھی جب اپنا آپ برا لگے، نفرت محسوس ہونے لگے، اپنے ساتھ رہنا پسند نہ آئے، شدید تنہائی محسوس ہو، خودکشی کو دل کرے تو پھر فوری طور پر آپ اپنے علم کو دیکھیں کیونکہ آپ کا علم صحیح نہیں ہے۔ آپ کا اپنے متعلق علم کم ہے۔ جو بچے بچپن سے علم اور جذبات کے اختیار سے پختہ ہوتے ہیں، وہ زندگی میں بہت کم دباؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں رونا دھونا کم ہوتا ہے۔

اہل علم

ہمیں اپنے زمانے کا بہترین علم حاصل کرنا چاہیے اور اپنے زمانے کی بہترین ٹیکنالوجی سے ضرور مستفید ہونا چاہیے۔ ہم کبھی نہیں چاہیں گے کہ آج کے جدید دور میں ابلاغ کیلئے ایک کبوتر استعمال کریں۔ ہم کبھی نہیں چاہیں گے کہ اپنے پیغام کو پہنچانے کیلئے پرانے قاصد کا طریقہ کو اختیار کریں، کیونکہ ٹیکنالوجی کی وجہ سے زمانے کی رفتار بہت زیادہ تیز ہوگئی ہے۔ اسی طرح، ہر زمانے میں اس کے لحاظ سے اس وقت کی بہترین ٹیکنالوجی ہوتی ہے۔ اسے استعمال کرنا ایک بڑی ذہانت ہے۔

ٹیکنالوجی کا استعمال انسان کے مزاج میں شامل ہے۔ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ وہ پرانی ٹیکنالوجی کی طرف جائے۔ اسی طرح، ہر زمانے کے اہل علم ہوتے ہیں۔ سمجھداری اور عقل مندی یہ ہے کہ اپنے زمانے کے اہل علم، صاحب عقل وشعور افراد تک ضرور پہنچا جائے۔ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اور بالخصوص ہم جس سماج میں رہتے ہیں، اس میں یہ بہت بڑا المیہ پایا جاتا ہے کہ سیکھنے کا رجحان بہت کم ہے۔ ساتھ ہی ان میں ایک وہم پایا جاتا ہے کہ ہمیں سب کچھ پتا ہے، ہمیں پہلے سے علم ہے۔ یہ واہمہ جب تک ساتھ رہتا ہے، ہم اپنی زندگی میں کسی عالم دین کو، کسی عقل والے کو، کسی علم والے کو اور کسی بہترین کتاب کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرسکتے۔

اپنی زندگی میں بہترین چیزیں شامل کرنے کیلئے پہلے ہمیں پہلے سے موجود اپنی چیز پر اعتراض اٹھانا پڑے گا اور اپنی صلاحیت اور علم کو بڑھانے کیلئے کسی صاحب علم کے پاس جانا پڑے گا۔ جب تک یہ خیال نہیں آتا، علم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں انسان کی عمر سے کئی گنا زیادہ اس کے خیال کی عمر ہے، فلسفے کی عمر ہے۔ اسی طرح نظریات کی زندگی انسانوں کی زندگی سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو عام طور پر انسان کی زندگی ساٹھ ستر

سال ہوتی ہے۔لیکن اگر تحقیق کریں کہ اس کی زندگی کے علاوہ اس کے نظریات کی زندگی کئی ہزار سال بھی ہو سکتی ہے۔آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے دنیا میں بہت بڑا فلسفی آیا۔اس کا نام سقراط تھا۔اس کا نام آج بھی زندہ ہے۔اس کی شکل کا کسی کو اندازہ نہیں۔علاقے کے بارے میں بھی اختلاف ہے،لیکن علم ودانش کی جو باتیں وہ کرتا تھا،وہ آج بھی زندہ ہیں۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ایم اے فلسفہ کرنے کیلئے سقراط کو پڑھایا جاتا ہے۔اس کے بغیر ایم اے نہیں ہوتا۔یہ وہ سقراط ہے جو زہر کا پیالہ سامنے رکھ کر مسکرانے لگا۔اسے کسی نے کہا کہ تم مرنے لگے ہو اور مسکرا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا،''میں مرنے لگا ہوں مگر میرے افکار نہیں مریں گے۔'' یہ بات سچ ہے۔آج تین ہزار سال بعد بھی دنیا میں جہاں بھی فلسفہ پڑھایا جاتا ہے،سقراط کے ذکر کے بغیر فلسفہ نہیں ہے۔سقراط کو فادر آف فلاسفی کہا جاتا ہے۔

سقراط کے پاس ایک طالب علم گیا اور اسے کہا کہ تمہارے پاس تقریباً ہر سوال کا جواب ہے۔اتنا علم تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ اس نے کہا کہ میں صبح کے وقت دریا میں اشنان کرتا ہوں۔تم وہاں آجانا۔تمہیں اس سوال کا جواب وہاں ملے گا۔صبح وہ نوجوان دریا پر چلا گیا۔اس نے دیکھا کہ سقراط دریا میں کھڑا ہے اور اس کی گردن تک پانی ہے۔اس نے دور سے اسے اشارہ کر کے کہا،میرے سوال کا جواب۔سقراط اس نے کہا،اس کے لیے تمہیں پانی میں آنا پڑے گا۔نوجوان پانی میں اتر کر سقراط کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔سقراط نے ایک دم اس کا سر پکڑا اور اسے پانی میں ڈبو دیا۔کچھ ہی دیر میں جب اس نوجوان کا دم گھٹنا شروع ہوا تو سانس لینا مشکل ہو گیا۔وہ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر کنارے پر آیا۔نوجوان کے اوسان ذرا بحال ہوئے تو اس نے کہا،میری توبہ... آئندہ میں سوال نہیں کروں گا۔ سقراط نے کہا،سوال کو چھوڑو،میں نے تمہیں جواب دے دیا ہے۔نوجوان نے کہا،کیا جواب دیا ہے؟ سقراط نے کہا،مجھے ایک سوال کا جواب دو کہ جب تم پانی میں ڈوبے ہوئے تھے تو تمہیں کیا خواہش تھی؟ نوجوان نے کہا،میرے پاس کوئی خواہش نہیں تھی،بس صرف

ایک خواہش تھی اور وہ یہ کہ کسی طرح سانس واپس آ جائے۔ سقراط نے وہاں ایک تاریخی جملہ کہا: ''جس طرح مرنے والے کو سانس کی طلب ہوتی ہے، بالکل اسی طرح علم والے کو علم کی ویسی ہی طلب ہوتی ہے۔''

متعلقہ کام کا علم

آپ جو کام کر رہے ہیں، چاہے نوکری ہو یا اپنا کوئی کام ہو، اس کام کے متعلق علم ہونا چاہیے۔ مولانا رومؒ اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں کہ ''ایک مولوی صاحب دریا پار جانے کیلئے کشتی میں سوار ہوئے۔ اس کشتی میں انیس سال کا ملاح بیٹھا تھا۔ مولوی صاحب نے اس بچے سے سوال کیا، ''آپ کو حدیث، فقہ، نحو وغیرہ کچھ آتا ہے؟'' بچے نے جواب دیا، ''میں اَن پڑھ ہوں، مجھے تو یہ سب نہیں آتا۔'' مولوی صاحب نے ملاح کی یہ بات سنی تو کہا، ''آہ، تم نے اپنی آدھی زندگی ضائع کر دی۔'' کشتی کچھ آگے پانی میں گئی تو وہاں بھنور آ گیا اور کشتی ہچکولے کھانے لگی۔ ملاح نے چپو چھوڑا اور دریا میں چھلانگ لگانے سے پہلے مولوی صاحب سے پوچھا، ''آپ کو تیرنا آتا ہے؟'' مولوی صاحب نے نفی میں جواب دیا تو ملاح نے کہا، ''آپ نے اپنی پوری زندگی ضائع کر دی۔''

آپ کا جو بھی کام ہے، اپنے اس ہنر کو اتنا اچھا سیکھیں کہ پھر اس فیلڈ میں آپ جیسا کوئی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کیجیے کہ اللہ محتاجی والی زندگی نہ دے۔ اللہ پاک ہمیں آسانیوں والی زندگی دے اور اللہ پاک ہمیں آسانیاں بانٹنے کا شعور عطا کرے، کیونکہ شعور آ جائے تو انسان خود بانٹتا ہے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اللہ پاک ہمارے فیصلوں میں برکت ڈال دے۔ یہ بھی دعا اکثر کیا کیجیے کہ اے میرے اللہ، تو راضی رہ۔ دنیا والوں کی نگاہ میں اونچا اور میری اپنی نگاہ میں نیچا رکھ۔ میں عاجز رہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے پردہ رکھا ہوا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے عاجزی مانگیے، علم مانگیے، علم بھی وہ جو نافع ہو۔



کامیابی

"اگر آپ جلد نتائج کے خواہاں رہتے ہیں تو میں آپ کو بتادوں کہ کامیابی میں بڑا وقت لگتا ہے!"

اسٹیو جوبس

جذبہ

ایک شخص روزانہ صبح قصور سے دودھ خریدتا تھا اور لاہور لاکر بیچتا تھا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ وہ پڑھتا رہا، محنت کرتا رہا اور مشقت کرتا ہوا آخر کار وہ اس ملک کا وزیر اعظم بن گیا۔ اس عظیم شخص کا نام ملک معراج خالد تھا۔ دنیا میں آئن سٹائن کو بھی آسانی نہیں ملی۔ لوگوں نے اسے پاگل کہا، اس دنیا نے کسی نبی پیغمبر کو بھی نہیں چھوڑا۔ انہیں بھی نہیں مانا۔ یہ آدمی کا اپنا جذبہ ہوتا ہے جو اس کو آگے لے جاتا ہے۔

ایک اسکول کے باہر غبارے بک رہے تھے۔ غباروں کے اندر گیس بھری تھی۔ غبارے بیچنے والا غبارے کی سیل بڑھانے کیلئے وقفے وقفے سے دو تین غبارے ہوا میں چھوڑ دیتا تھا تاکہ بچے اُڑتے ہوئے غبارے دیکھیں اور خریدنے آئیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک بچہ جس کا رنگ بہت سیاہ ہے، دیوار سے لگا خاصی دیر سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے بچے کو اپنے پاس بلا لیا اور کہا کہ بیٹا، اگر تمہیں غبارہ چاہیے تو تم ایک کام کرو۔ یہ لے لو۔ میں پیسے نہیں لوں گا۔ اس بچے نے کہا، نہیں انکل... میں تو یہ دیکھنا چاہ رہا ہوں کہ کیا کالے رنگ کا غبارہ اُڑ سکتا ہے یا نہیں؟ غبارے والے نے جواب دیا، "نہ کالا غبارہ اڑتا ہے، نہ نیلا غبارہ اڑتا ہے۔ اصل میں تو غبارے کے اندر موجود گیس ہے جو اسے اُڑنے کے قابل بناتی ہے۔"

آدمی کے اندر کچھ ہوگا تو وہ اُڑان کے قابل بنے گا۔

آپ سب سے پہلے اپنی معاش کا بندوبست کیجیے اور آپ کا شوق اگر معاشرے یا آپ کے معاش کے مطابق نہیں ہے تو اسے ساتھ ساتھ چلاتے رہیے۔ ابتدا میں، اسے ذریعہ معاش نہ بنایئے۔ فرض کیجیے، ٹریننگ ایک شوق ہے اور اس سے کمایا بھی جا سکتا ہے۔ مگر آپ اس شوق کو فری شروع کر دیجیے۔ ہمیں بچپن سے سکھایا جاتا ہے کہ بیٹا سارا کھانا تم نے خود کھانا ہے، کسی ساتھ والے بچے کو نہیں دینا۔ جب اتنی تنگ دلی ہوگی تو پھر آدمی کا ویژن دوسروں کو فائدہ دینے کیلیے، ملک کی نفع رسانی کیلیے اور معاشرے کو بدلنے کیلیے نہیں ہوگا۔

تجزیہ یہ ہے کہ ہر فیلڈ میں اوسطاً 80 فیصد لوگ ناکام ہوتے ہیں اور 20 فیصد کامیاب ہوتے ہیں۔ کامیاب ہونے والے کیوں کامیاب ہوتے ہیں؟ کیوں کہ انھوں نے کامیاب ہونے کا فیصلہ کیا ہوتا ہے، ورنہ اسی فیصد کبھی بھی نہیں چاہتے کہ وہ کامیاب ہوں۔ انسان جب سے دنیا میں آیا ہے ساری مزاحمت اسی کیلیے ہے۔ جو انسان یہ ثابت کرتا ہے کہ میں اس مزاحمت کو نہیں مانتا، مجھے اس مزاحمت کی رکاوٹ کو توڑ کر آگے بڑھنا ہے وہ کامیابی پاتا ہے۔

قدرتی صلاحیتوں کی علامات

جس کام کیلیے خدا انسان پیدا کرتا ہے، اگر انسان وہی کام کرے تو اسے اس کام میں اطمینان ہوتا ہے۔ انسان ہمیشہ فیصلہ اس نکتے پر کرتا ہے کہ مجھے اطمینان یا خوشی کہاں سے ملے گا۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی رحمت "بوریت" یا بیزاری ہے۔ بوریت ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ جس کام کیلیے ہم پیدا نہیں کیے گئے، وہی کام کریں تو اس کام میں ہمیں بوریت ہونے لگتی ہے۔ اندر سے جواب آتا ہے کہ یہ کام میرا نہیں ہے۔ جس کام کو کرتے ہوئے معاوضے کی پروا ختم ہو جائے، یہ علامت ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے آپ کو اسی کام کیلئے پیدا کیا ہے۔ تھری ایڈیٹس فلم کے آخر میں ایک کردار کا یہ جملہ بہت اہم ہے کہ "میں تھوڑے پیسے کماؤں گا پاپا، لیکن مجھے اطمینان تو ہوگا۔"

جب آپ اپنی فطرت کے مطابق کام شروع کرتے ہیں تو چاہے نہ چاہے، آپ کا دشمن بھی آپ کے کام کی تعریف کر دیتا ہے۔ انسان دنیا میں واحد مخلوق ہے جس کی کھانے کی ڈشوں کے ساتھ ساتھ ایک اور ڈش بھی ضروری ہوتی ہے، اور وہ ہے، تعریف۔ ہمیں آگے جانے کیلئے تعریف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ میں کوئی صلاحیت ہے تو آپ اسے لاکھ چھپائیں، تعریف آنے لگتی ہے۔

جس کام کیلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیدا کیا ہے، اس کام کو کرتے ہوئے آپ وقت کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اس میں آپ کو تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ جو صلاحیت آپ کے پاس ہوتی ہے، اس کی معلومات چاہے اَن چاہے، اکٹھی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ آپ کا دل کرتا ہے کہ میں اس کا پتا کروں۔ اللہ انسانوں سے کام لیتا ہے، انھیں آگے بڑھاتا ہے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے کہ آپ یہ جانیں کہ آپ کو اللہ نے کس کام کیلئے پیدا کیا ہے۔

کہانی بن جایئے

ہمارے بڑے ہماری شروع کی زندگی میں یہ سوال ہی نہیں اٹھاتے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جس میں کوئی تڑپ ہے، لگن ہے، آنسو ہیں، اضطراب ہے، وہ زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ یہ ساری علامتیں ظاہر کرتی ہیں کہ قدرت نے اس سے کوئی کام لینا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کام کرنا کیا ہے؟ اگر آپ دل سے یہ سوال کرتے ہیں تو قدرت یقیناً آپ کو اس کا جواب دیتی ہے۔ آپ ناول "الکیمسٹ" پڑھیں، کتاب "دی ہیرو" پڑھیں تو آپ کو ان کتابوں میں ان خاص علامات کا پتا چلے گا کہ دنیا میں جتنے عظیم لوگ ہیں، وقت سے پہلے قدرت نے انھیں اشارے دینے شروع کر دیے تھے کہ تم یہ کرو، تم وہ کر جاؤ گے۔

ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں قدرت کہہ رہی ہوتی ہے، مگر ہم سنتے نہیں۔ ہم دنیا کو سن رہے ہوتے ہیں اور دنیا کو کیا پتا کہ ہمیں خدا نے کس کام کیلئے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا، ہم اپنے بارے میں درست فیصلہ نہیں کر پاتے، پھر وہ چیز ہمارا پچھتاوا بن جاتی ہے۔

NetSol کے سربراہ جناب سلیم غوری کا کہنا ہے کہ میں آسٹریلیا میں سٹی بینک میں بہت اچھی نوکری کر رہا تھا اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا ذاتی کام چل رہا تھا۔ ایک دن میرے باس نے مجھے کہا کہ تم یہ نوکری کرو گے یا اپنا کام تو میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ایک کامیاب کہانی بننا ہے، لہٰذا میں نے بینک کی نوکری چھوڑ دی۔ آج میں ایک ادارہ چلا رہا ہوں۔

آدمی جب جرأت کا مظاہرہ کرتا ہے تو پھر وہ آگے نکل جاتا ہے۔ کبھی یہ مت بتایئے کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ کر کے دکھایئے تا کہ دنیا کو پتا لگ جائے کہ آپ کیا ہیں۔ اپنے آپ کو اس جگہ پر لے کر جایئے جہاں زمین ختم ہوتی ہے۔ آپ وہاں سے اڑنا شروع کیجیے۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا طیارہ ایئرپورٹ ہی نہیں چھوڑتا، وہ فضاؤں میں کہاں جائے گا۔

جو لوگ انٹرن شپ کر رہے ہیں، وہ اس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سیکھیں۔ ہمیں پندرہ سولہ سال کتابیں پڑھنے کی اتنی عادت پڑ جاتی ہے جس کی وجہ سے کام کرنا مشکل لگتا ہے۔ اس وقت جتنی بھی اعلیٰ کمپنیاں ہیں، گورنمنٹ ادارے ہیں، ہر جگہ پیشہ وارانہ کردار بڑھایا جا رہا ہے۔ یہ اس وجہ سے بڑھایا جا رہا ہے کہ آفیسرز کو کام لینا نہیں آتا۔ اداروں میں لیڈر شپ کی کمی ہے۔ ٹیم بنا کر کام کرانا نہیں آتا۔ اہداف کو پورا کرنا نہیں آتا۔ عملی طور پر انسانوں کے ساتھ ڈیل کرنا نہیں آتا۔ اگر آپ انجینئر ہیں تو صرف انجینئر ہونا کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کے ساتھ درست انداز سے برتاؤ کی مہارت بھی ضروری ہے۔ اگر وہ بہتر ہو جاتی ہے تو آپ تیزی سے ترقی کریں گے۔

بہادر بنئے۔ دل سے والدین کا ادب ضرور کیجیے، مگر کام وہ کیجیے جس کی طرف آپ کا

اپنا رجحان ہو۔ وہ کام کرنے کو جی چاہتا ہو۔ ممکن ہے، آپ کے والدین اس کام کے بارے میں زیادہ نہ جانتے ہوں۔ بلکہ اکثر جانتے ہی نہیں ہیں۔ آپ نے نئے زمانے میں آنکھ کھولی ہے۔ لہٰذا آپ کو کامیابی حاصل کرنے کیلئے نئے زمانے کے انداز کے مطابق کام کرنا پڑے گا۔ سمت کا تعین آپ کو خود کرنا ہے۔ اس کیلئے آپ اپنے اندر بہادری پیدا کیجیے اور جرأت کے ساتھ والدین سے معذرت کر لیجیے کہ وہ جو چاہتے ہیں، آپ نہیں کریں گے، بلکہ آپ کو اللہ نے جس کام کیلئے پیدا کیا ہے، وہ کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ جو کام آپ کر رہے ہیں، وہ غلط ہوگا۔ کوئی بھی کام پہلی مرتبہ درست نہیں ہوتا۔ اسی کا نام تجربہ ہے۔ اگر آپ طالب علمی کے دور ہی سے کمانا شروع کر دیں تو بہت ہی اچھا رہے گا تاکہ آپ کے والدین کو پتا چلے کہ میرا بیٹا اب خود کمانے لگا ہے۔ بچے والدین کی مان کر اگر کوئی کام کر بھی لیں گزارہ تو چلتا رہتا ہے، نہ اس کام سے تشفی ہوتی ہے اور نہ زندگی غیر معمولی بنتی ہے۔

اچھی عہدے پر جانے کیلئے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ سلیم غوری صاحب کہتے ہیں، ''جو لوگ نوکری کرتے ہیں دولت مند وہ بھی ہو جاتے ہیں، لیکن ان کی زندگی میں کہانی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔'' کامیاب کہانی قربانیوں سے بنتی ہے۔ جو آدمی پچھلی ٹرین نہیں چھوڑ سکتا، وہ اگلی نہیں پکڑ سکتا۔ ہم میں حوصلہ ہی نہیں ہوتا کہ اگر ہم نے یہ ٹرین چھوڑ دی تو اگلی بھی نہ چھوٹ جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہے۔ جب خود پر اعتماد نہیں ہوگا تو آپ فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ پھر آپ محتاج ہو جائیں گے کہ ابا جی، میں کیا کروں؟ آپ ان کا ادب ضرور کیجیے، خوب ادب کیجیے کہ وہ آپ کے والدین ہیں۔ ان کے سارے لوازمات پورے کیجیے جو آپ کر سکتے ہیں۔ لیکن کیریئر آپ کا اپنا ہے، زندگی آپ کی اپنی ہے۔ آپ اپنے اندر خود دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ یہ انعام اللہ تعالیٰ نے صرف آپ کو دیا ہے۔ دنیا میں ترقی کر کے جب بھی کوئی بڑا انسان بنتا ہے وہ جو کام کر رہا ہوتا ہے وہ اس کے

بارے میں نہیں بتاتا۔ لیکن، وقت بتاتا ہے کہ وہ کیا کر گیا۔ وہ تاریخ رقم کرتا ہے۔

نک وائے چیچ کی کہانی میں سب سے اہم نکتہ تبدیلی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں دو قسم کی تبدیلیاں ہیں۔ ایک تبدیلی جو باہر سے آتی ہے تاکہ آپ خود کو بدلیں۔ مثال کے طور پر، آپ کسی ایسی تنگ گلی میں جاتے ہیں جہاں پر آسانی کے ساتھ بازو کھول کر نہیں چلا جا سکتا۔ باہر کی تبدیلی آپ کو بتائے گی کہ آپ سمٹ کر چلیں۔ دوسری تبدیلی اپنے آپ کو اندر سے بدلنا ہے، کیونکہ آپ حالات کو تو نہیں بدل سکتے، اس سے بہتر ہے کہ آپ خود کو بدل لیں۔

نک کے پیدا ہونے کے بعد اس کی ماں پھوٹ کر روئی۔ اس نے کہا کہ یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا ہے۔ میرا بچہ ہی اس بیماری کا شکار کیوں ہوا۔ اسے پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسے مر جانا چاہیے تھا۔ بغیر بازو، بغیر ٹانگوں بغیر پاؤں والا انسان جس کی زندگی میں آنسو ہیں، تکلیفیں ہیں، اپنی زندگی کو ختم کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کرتا ہے۔ آخر کار، وہ ان سب چیزوں پر قابو پا کر سوچتا ہے کہ مجھے کچھ کرنا ہے۔ مجھے محتاجی کی بجائے کچھ دینے کے مقام پر آنا ہے۔ مجھے رکنا نہیں ہے۔ دنیا مجھے اگر اپاہج کہتی ہے تو مجھے ثابت کرنا ہے کہ میں ایک صحیح سلامت انسان سے زیادہ کامیاب ہوں۔

اور آج پوری دنیا اس کو جانتی ہے، کیونکہ اس کی ایک کہانی ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ اگر انسان کرنا چاہے تو کوئی خامی، کوئی رکاوٹ آڑے نہیں آ سکتی۔ آدمی چاہے تو صحت مند، باوسائل اور ہٹے کٹے انسانوں سے بہتر کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔ اور اگر انسان نہ کرنا چاہے تو پھر ٹانگیں، بازو ہونے کے باوجود بھی آدمی کچھ نہیں کرتا۔

توانائی کا صحیح استعمال

قدرت بعض لوگوں کو بہت پُرکشش شخصیت دے کر بھیجتی ہے، جیسے قطب الدین ایبک جنھیں "یوسفِ ثانی" کہا جاتا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں حضرت یوسف علیہ السلام بہت ہی

زیادہ خوبصورت تھے۔ اس کے بعد اگر کسی کو خوبصورت کہا گیا ہے تو وہ قطب الدین ایبک کو کہا گیا ہے۔ یہ قدرت کا انعام ہے۔ بعض دفعہ قدرت کئی لوگوں کو بہت زیادہ توانائی دے دیتی ہے۔ ان میں اتنی زیادہ توانائی ہوتی ہے کہ ان کے آگے کام چھوٹے رہ جاتے ہیں۔

زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب آپ منتخب کرتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ آپ اپنی ساری توانائی اس پر لگا دیتے ہیں اور باقی لوگوں سے کئی گنا آگے نکل جاتے ہیں۔ کوشش کر کے اپنا وہ کام تلاش کیجیے جس کیلئے آپ پیدا کیے گئے ہیں۔ اگر نہ ملے تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں۔ جس کے پاس توانائی زیادہ ہوتی ہے، اسے زیادہ ٹکریں مارنی پڑتی ہیں۔ چلتی چیز کا زیادہ ڈر ہوتا ہے کہ وہ کہیں ٹکرا سکتی ہے۔ اگر سمت ہو، منصوبہ بندی ہو تو توانائی والا فرد دوسروں سے آگے نکل جاتا ہے۔ ڈفر کو کبھی ٹینشن نہیں ہوتی۔ وہ تو زندہ رہتے ہوئے بھی موت کے انتظار میں رہتا ہے۔ عقل و فہم اور توانائی رکھنے والا بہت بے چین رہتا ہے، کیوں کہ اسے یہ احساس، یہ ادراک ہوتا ہے کہ مجھے زندگی ایک بار ملی ہے، اس میں بہت کچھ کیسے کر جاؤں؟

ہم ہر دم سازگار حالات کے انتظار میں رہتے ہیں۔ سازگار حالات تو نبیوں کو بھی نہیں ملے۔ دنیا میں سازگار حالات نہیں ہیں۔ اس دنیا میں پودے کو زمین سے نکلنے کیلئے زمین کا سینہ چاک کرنا پڑتا ہے۔ جب بھی آپ آگے نکلنے کی کوشش کریں گے، ساری دنیا آپ کو پاگل کہے گی۔ آپ کا کام یہ ہے کہ دنیا کی پروا کیے بغیر آگے نکل جائیں۔ یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ جب آپ اپنے مقصد پر اپنی توانائی استعمال کریں گے تو سکون میں چلے جائیں گے اور اگر اس کو روک کر رکھیں گے تو یہ آپ کو تنگ کرتی رہے گی۔

قیمت ادا کیجیے

ایک صورت حال کو لوگ قبول نہیں کرتے جبکہ ایک صورت حال میں آپ وقت کی ضرورت بن جاتے ہیں۔ جو لگا رہتا ہے، اس کیلئے ساری "ناں" "ہاں" میں بدل جاتی

ہے۔ آپ سر جھکائے، اپنی منزل کی طرف چلتے چلے جایئے۔ اس چیز کی پروا چھوڑ دیجیے کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں یا کہیں گے۔ صرف اپنی منزل کا فوکس رکھیے۔ ایک دن آپ سر اٹھائیں گے تو زمانہ آپ کے ساتھ ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ آپ لگے رہیں۔ ہمارے ساتھ اکثر مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم میں کوئی یہ قیمت ادا کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔ ہم دوسروں کی باتیں سنتے ہیں اور ناامید ہوکر بیٹھ رہتے ہیں۔ یہ ناکام لوگوں کا وطیرہ ہے۔

تین مینڈک اکٹھے جا رہے تھے کہ کنوئیں میں گر گئے۔ انھوں نے کنویں سے نکلنے کی کوشش شروع کر دی۔ دوسرے مینڈک کنوئیں کے اردگرد آ کر کھڑے ہو گئے۔ تمام مینڈک یہ بات کر رہے تھے کہ کنواں بہت گہرا ہے، ان کا اس میں سے نکلنا ممکن نہیں۔ کچھ دیر کی محنت کے بعد دو مینڈک تو تھک ہار گئے اور نیچے رہ گئے۔ ایک مینڈک مسلسل کوشش میں لگا رہا۔ آخر کار وہ باہر آ گیا۔ باہر موجود مینڈکوں نے اس سے پوچھا، تم کیسے باہر آ گئے؟ تو وہ ان سے کہنے لگا کیا کہہ رہے ہو، یعنی اسے باہر موجود مینڈکوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

زندگی میں جو سب کی سنتا ہے، اور انھیں خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسے منافق کہا جاتا ہے۔ آپ اس منافقت سے بچیں اور اپنے مقصد، اپنے کام میں جتے رہیں۔

معاون لوگ ہی جنت بناتے ہیں۔ پاکستان اس دن جنت بنے گا جب ہم ایک دوسرے کو دینا شروع کریں گے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ مالک میری کاوشوں کو قبول فرما۔ جبکہ اکثریت دال روٹی کے چکر میں لگی ہوئی ہے، لہٰذا آپ ان چھوٹے جھگڑوں سے نکل کر کسی مقصد کے تحت زندگی گزاریے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، "بڑی منزلوں کے مسافر چھوٹے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔"

محنت

عظیم پریم جی نے کہا، "دنیا میں شاید ہر چیز کا نعم البدل ہو سکتا ہے، لیکن محنت کا نعم البدل نہیں ہے۔" ہر چیز کا متبادل ہو سکتا ہے، مگر محنت کا متبادل نہیں ہے۔ ہم اپنی ساری زندگی محنت سے بچتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کام نہ کرنا پڑے۔ کوئی شارٹ کٹ مل جائے۔ ایک شخص کسی دانشور سے اپنے مسئلے کے سلسلے میں ملنے گیا۔ دانشور نے پوچھا: "تم کیا کرتے ہو؟" اس نے جواب دیا، "مجھ پر اللہ کا بڑا کرم ہے۔" دانشور نے پوچھا، "کیا کرم ہے؟" اس نے جواب دیا، "میرا پروڈکٹ ایسا ہے کہ وہ میری کوشش کیے بغیر ہی بک جاتا ہے۔ مجھے کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔" دانشور نے کہا، "تم تو گئے۔" اس نے کہا، "وہ کیسے؟" دانشور نے جواب دیا، "تمھیں خدا نے ایک موقع دیا تھا اپنی قابلیت بڑھانے کا۔ تم نے پروڈکٹ ہی ایسا پکڑ لیا جو خود بہ خود بک رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کام نہیں کرنا پڑ رہا اور تم پالش نہیں ہو رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہی کام کرتے کرتے تم زنگ آلود ہو جاؤ گے اور جب زندگی میں کبھی کوئی امتحان آئے گا تو تم کہو گے، اوہ ہو... میں نے تو کچھ سیکھا ہی نہیں۔"

قدرت کو پتا ہے کہ اگر اسے اس وقت انعام دیا تو یہ انعام تھوڑا ہوگا۔ ہمیں لگ رہا ہوتا ہے کہ ہم نے بڑا کام کیا۔ قدرت کے سارے نظام میں دیکھیں تو وہ کام شاید کچھ بھی نہیں ہوتا۔ قدرت اس انعام کو جمع کر لیتی ہے اور انتظار کرتی ہے کہ اسے انعام اس وقت دیا جائے کہ جب اسے حقیقت میں ضرورت ہوگی۔ اتنی دیر میں وہ انعام ضرب ہوتے ہوتے بہت بڑا ہو چکا ہوتا ہے۔

فرض کیجیے، آپ کو اس وقت دس روپے کی بہت ضرورت ہے۔ دینے والے کو پتا ہے کہ ابھی دیے تو شاید اتنی اہم ضرورت نہیں ہے لیکن اگر اس کو میں دس دن بعد دوں تو اس وقت اس کو زیادہ ضرورت ہوگی۔ قدرت اس محنت کو کبھی ضائع نہیں کرتی۔ یہ قدرت کو زیب

نہیں دیتا۔ قدرت کبھی بھی آپ کی محنت کا صلہ ضائع نہیں ہونے دیتی۔ کبھی یہ صلہ فوری ملتا ہے تو کبھی انتظار کے بعد... زیادہ صحیح وقت پر۔

ترقی کا راز

وہ فرد زیادہ ترقی کرتا ہے جو ایک قدم آگے چلتا ہے۔ اسے افسر یا نظام ترقی نہیں دیتے، اسے قدرت ترقی دیتی ہے۔ ہمارا ایمان ہونا چاہیے کہ ہماری محنتوں کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے۔ ہمارا ایمان ہونا چاہیے کہ قدرت بھی ہمیں ضرور نوازے گی۔ وہ محنتیں جس کے صلے بندوں سے نہیں ملتے، ان کے صلے اللہ تعالیٰ ضرور دیتا ہے۔ اس بات پر آپ کا ایسے ایمان ہونا چاہیے جیسے آپ کو اپنے بدن کے وجود کا یقین ہے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ "کبھی مانگو تو کبھی اپنی اوقات کے مطابق نہ مانگو، بلکہ اُس کی شان کے مطابق مانگو!" ممکن ہے، میری اوقات بہت چھوٹی ہو، لیکن دینے والے کی شان مجھے بادشاہ بنا دے۔ اُس کے پاس نوازنے کے لاتعداد طریقے اور بہانے ہیں۔

حلال کی روزی؛ حرام کی روزی

جب حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے تو وہ انسان کے جینز کو متاثر کرتا ہے۔ رزق حرام سے خاص قسم کی ترتیب خراب ہو جاتی ہے جو خطرناک دواؤں سے بھی زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ ہیروشیما پر کئی سال پہلے ایٹم بم گرا تھا، لیکن آج بھی وہاں پر معذور بچے پیدا ہوتے ہیں۔ رزق حرام سے جو تبدیلی آتی ہے، اس کے باعث پیدا ہونے والے بچے لولے لنگڑے اور اندھے ہوتے ہیں۔ معذور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ناامید بھی ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ بچہ پڑھا لکھا ہو، لیکن ناامید ہو۔ امید والا انسان اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوتی ہے۔ حلال روزی کی ایک بڑی نشانی اللہ تعالیٰ سے امید ہے۔ حرام کھانے والا جسمانی لولا لنگڑا نہیں ہوتا، مگر وہ سوچ سے معذور ہو جاتا ہے۔ جینز نسل انسانی میں نسل در نسل

جب سفر کرتے ہیں تو ان جینز کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ آپ کو بڑے لوگ پاگل خانے کے باہر بھی پاگل نظر آئیں گے۔ رزق حرام سے آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔ جو قوم رزق حرام کھانا شروع کر دیتی ہے وہ قوم دیوانی بن جاتی ہے۔ حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں، "اگر تمہارے دنیا میں آنے سے فرق نہیں پڑا تو جب دنیا سے جاؤ گے تب بھی فرق نہیں پڑے گا۔" اگر فرق پڑا ہے تو یقین کر لیجیے کہ جب آپ دنیا سے جائیں گے تو دنیا کو ضرور فرق پڑے گا۔

لوگوں کو اپنے کیریئر اور زندگی میں شامل کیجیے

آدمی سوشل ہو تو اپنا ایک حلقہ آباد کر لیتا ہے اور اگر سوشل نہ ہو تو سگے بھائی بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔ تعلقات بنانا، پھر انھیں استوار کرنا، ایک مہارت ہے۔ بہت سوں کو تعلقات مضبوط کرنا نہیں آتا۔ بات کرتے وقت بعض کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اعتماد نہیں ہوتا۔ انھیں سلام کرنا تک نہیں آتا، جواب دینا نہیں آتا؛ عزت دینی نہیں آتی۔ تعلقات بنانے نہیں آتے۔ وہ آنکھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر پاتے۔

اگر ایک سال میں نئے پندرہ بیس لوگ شعوری طور پر آپ کی زندگی میں شامل نہیں ہوئے تو پھر آپ ترقی نہیں کر رہے۔ ہر سال آپ کے اثاثوں میں بینک اکاؤنٹ بڑھنے کے بعد دوسری اہم چیز یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں اس سال کتنے نئے لوگ شامل ہوئے۔ نئے مواقع کتنے آئے، کتنے غیر معمولی لوگ آئے، نئے دوست کتنے آئے۔ یہ سب آپ کی ترقی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر آپ کی زندگی میں نئے لوگ شامل نہیں ہو رہے تو پھر آپ میں وہ خصوصیات نہیں ہیں جو ایک کامیاب شخصیت میں ہونی چاہئیں۔ اگر آپ کی شخصیت میں دم ہوگا تو پھر آپ کی زندگی میں نئے لوگ آئیں گے۔ پھر وہ آپ سے بات چیت کرنا چاہیں گے، ملنا چاہیں گے۔

سب سے قیمتی چیز وقت ہے جو آپ کسی کو دیتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو وقت دیتے ہیں تو آپ کا حلقہ احباب بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب آپ کا حلقہ احباب بڑا ہونا شروع ہوگا تو پھر آپ کا نصیب بھی بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ نصیب دو حصوں میں ہوتا ہے۔ ایک مستقل اور ایک بدلتا رہتا ہے جسے ''نصیب معلق'' کہا جاتا ہے۔ جامد نصیب کو نہیں بدلا جا سکتا جبکہ معلق نصیب بدلا جا سکتا۔

آپ سے لوگ نہیں ملتے، مواقع ملتے ہیں۔ آپ کے پاس پانچ سات طرح کے لوگوں کے گروپ ضرور ہونے چاہئیں۔ تعلق دار بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ آپ ان سب کو مختلف کیٹیگریز میں رکھیے۔ ہر ملنے والا اور سلام دعا کرنے والا دوست نہیں ہوتا۔ تعلق دار اور دوست میں فرق سمجھنا ضروری ہے۔ جو لوگ یہ فرق نہیں کر پاتے، نقصان اٹھاتے ہیں۔ تمام افراد کو مکس نہ کیجیے۔ ہر فرد آپ کا ذاتی دوست نہیں ہو سکتا۔ ہر فرد جگری دوست بھی نہیں ہو سکتا۔

کوشش، کوشش اور مزید کوشش

بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ کوشش، کوشش اور مزید کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اپنی ہار کو، اپنی کوتاہیوں کو، کمزوری کو، اپنی بے بسی کو تسلیم کر لینے میں عظمت ہے۔ جب آپ کوشش، کوشش اور مزید کوشش کی طرف آتے ہیں تو یہ نمبر لینے کے حوالے سے تو بہت اچھی بات ہے مگر جہاں پر یقین ہی ختم ہو چکا ہو اور پتا ہے کہ ہار ہی ہار ہے، وہاں پر مان جانا چاہیے۔ خدانخواستہ اگر کوئی بڑا پیارا زندگی سے چلا گیا ہے تو اب کوشش کیا کرنی ہے۔ اپنی بے بسی مان جائیے کہ مالک میں تیری مرضی پر راضی ہوں، جہاں تیری مرضی ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔ سجدہ کرنے کے سوا میرے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔

عشق اور محبت کے حوالے سے بہت سے لوگ اللہ کا شکر ادا کر رہے ہوتے ہیں کہ

میرے مالک تیرا کروڑ شکر ہے کہ میں جس سے شادی کرنا چاہتا تھا اگر وہاں ہو جاتی تو میں پاگل خانے میں ہوتا۔ تو نے مجھے بچا لیا۔

زندگی میں آپ کی آنکھ جب آپ پر کھلتی ہے تو آپ کو پتا لگتا ہے کہ اصل میں حاصل کیا تھا اور محرومی کیا تھی۔ آپ کو پتا لگتا ہے کہ کہاں کہاں درد تھا، مگر کرم تھا اور کہاں کہاں بڑی راحت تھی، لیکن وہ نارافض تھا۔ جب آپ سمجھنا شروع کرتے ہیں تو آپ پر یہ راز کھلتا ہے کہ جہاں آپ خود کو محروم سمجھ رہے تھے، وہاں کتنی رحمت تھی۔

اشوک نے اقتدار حاصل کرنے کیلئے اپنے ننانوے بھائی قتل کیے۔ جب اس کے ماتھے پر فتح کا ٹیکا لگا تو اس نے مٹا دیا۔ اس نے کہا، مجھے اپنی فتح پر شرم آرہی ہے کہ میں نے اپنی فتح کیلئے اپنے بھائیوں کو مار دیا۔ بسا اوقات آپ جب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو پتا لگتا ہے کہ کوشش، کوشش اور مزید کوشش بہت بڑی غلطی تھی۔ مجھے یہ کوشش کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔

زندگی میں جس دن آپ کو کوشش کرنے اور کوشش نہ کرنے کے درمیان حکمت کا پتا چل گیا تو آپ پر اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہو گئی ہے، کیونکہ یہ سب سے اہم چیز ہے۔

وقت ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر آپ نے اسے سنبھالنا شروع کر دیا ہے تو پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کے انعام کی قدر کی۔ اور جس نے بھی اللہ تعالیٰ کے انعام کی قدر کی ہے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ سو لوگوں جتنا کام کر جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے، اگر انھیں پانچ سو زندگیاں بھی مل جائیں تو وہ کچھ نہیں کر سکتے۔

کوشش، کوشش اور مزید کوشش آپ ضرور کیجیے مگر آپ ذہن میں یہ ضرور رکھیے کہ کہیں کوشش، کوشش کے چکر میں اتنا تھک نہ جائیں کہ اصل کام کیلئے آپ کے پاس توانائی نہ بچے۔ یہ تب ممکن ہے کہ آپ کا مقصد اور ہدف آپ پر واضح ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ آپ

کہاں جانا چاہتے ہیں، کیا کرنا چاہتے ہیں اور کیا بننا چاہتے ہیں۔ کوشش اگر فوکسڈ ہے تو کم محنت سے بھی زیادہ نتائج ملتے ہیں۔ کوشش اور محنت اگر منتشر ہو تو بے کار ہے۔

بعض اوقات کچھ غلطیاں کسی اور جگہ کیلئے ہوتی ہیں۔ آپ وہاں سے سیکھتے ہیں اور استعمال کہیں اور کرتے ہیں۔ چاند پر جانے کیلئے کوششیں جاری تھیں۔ وہ صحیح تھیں۔ لیکن، اس کی وجہ سے امریکی معیشت نیچے آگئی تھی۔ صرف ایک کامیابی تھی جس دن چاند پر پاؤں رکھا گیا تھا۔ انسان نے چاند پر پاؤں رکھا، امریکا نے نہیں رکھا تھا۔ جب ایک انسان نے بھی چاند پر پاؤں رکھ دیا تو گویا پوری انسانیت کیلئے فخر کی بات ہوگئی۔ چاند فتح ہو گیا۔

اچھے خاندان اپنے ایک بچے کی کامیابی کو سب کی کامیابی سمجھتے ہیں۔ انسانیت کے لحاظ سے اگر ہم سوچیں تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ انسان نے چاند پر قدم رکھا۔ یہ علامت ہے کہ ایک نے بھی رکھا تھا تو سارے انسانوں کیلئے قابل فخر ہے۔

شناخت بنائیں

بڑا کام کرنے کیلئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا تو آپ سب چیزوں سے آزاد ہو جائیں یا پھر اتنا کچھ حاصل لیں کہ پرواہی ختم ہو جائے۔ امیر تیمور دنیا کا وہ بادشاہ تھا جس نے کھوپڑیوں کے مینار بنانے کا آغاز کیا۔ یہ اس کی فتح کا نشان تھا۔ وہ جس علاقے کو فتح کرتا، اس علاقے کے جتنے بھی قابل لوگ ہوتے تھے، وہ اُن کے سر اتروا دیتا تھا۔ پھر وہ سر سارے اکٹھے کر کے مینار بناتا۔ پھر اس پر جسموں کی چربی پر ڈال دیتا تھا۔ اس کے بعد آگ لگا دیتا اور وہ آگ کئی کئی مہینے جلتی رہتی۔ جب وہ شیراز پہنچا تو اس نے اعلان کیا کہ پورے شہر کو امان دے دو۔ اس کے جرنیل نے کہا کہ بادشاہ سلامت آپ تو کسی کو نہیں چھوڑتے، یہ کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا، یہاں میرا استاد دفن ہے۔ جرنیل نے کہا، آپ تو یہاں کبھی آئے ہی نہیں ہیں، آپ کو کیسے پتا کہ یہاں پر آپ کا استاد دفن ہے؟ تیمور نے

جواب دیا، یہاں حضرت شیخ سعدیؒ دفن ہیں۔ جرنیل نے کہا، آپ تو کبھی ان سے ملے ہی نہیں ہیں۔ انہیں تو دنیا سے گئے عرصہ ہو چلا ہے۔ امیر تیمور نے جواب دیا، میں نے ان کی کتاب ''بوستان'' اور ''گلستان'' پڑھی ہیں۔ میں نے ان کتابوں میں ایک جملہ پڑھا تھا اور اس ایک جملے نے مجھے ایک سپاہی سے اتنا بڑا بادشاہ بنایا ہے۔ اور وہ جملہ یہ تھا کہ ''زندگی میں علم اور پیسہ خوب حاصل کرو، کیونکہ میں نے بڑے پیسے والوں کو بھی رلتے دیکھا ہے اور بڑے علم والوں کو بھی پیسے والوں کا محتاج دیکھا ہے۔''

جب یہ دشواریاں ختم ہو جاتی ہیں تو پھر دماغ سوچنا شروع کرتا ہے۔ جب تک زندگی کی تلخیاں آپ کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں، تب تک آپ بڑا سوچ نہیں سکتے۔ اس کیلئے صرف ایک چیز ضروری ہے کہ سوچ کے تالوں کو کھولا جائے۔ پرانے زمانے میں تعلیم اور تربیت بھی ایک کام ہوا کرتی تھی۔ استاد پڑھاتا بھی تھا اور ساتھ ہی تربیت بھی دیتا تھا۔ جب سے ڈگری کلچر آیا ہے، اس نے ایک نئی فوج تیار کردی ہے جو صرف سلائیڈوں کا سہارا لیتی ہے۔ اس نے تربیت ختم کردی ہے۔ جو کردار قوم کو چاہیے، وہ کردار اگر استاد کا نہیں ہے تو پھر وہ کردار طالب علم کا نہیں بن سکتا۔ یہاں خوف ختم کرنے والے استاد، سوچ کو بڑا کرنے والے استاد نہیں ملتے۔ فزکس، کیمسٹری اور میتھ کے ماہر بہت زیادہ ملیں گے۔ امتحان ٹاپ کرنے کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ پیپروں میں تو نمبر خوب ہوں، مگر زندگی میں نمبر ہی نہ ہوں۔

آج سائنس ای کیو (EQ= Emotional Quotient) پر چلی گئی ہے اور ہم ''آئی کیو'' پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمارا سارا سسٹم رٹنے پر ہے۔ ہمارے بچے میں پڑھنے کے بعد بھی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ نوے فیصد اسٹیج پر آکر بات نہیں کر سکتے۔ وہ کلاس میں تو بڑے شرارتی ہوتے ہیں، لیکن جیسے ہی انٹرویو دینے آتے ہیں تو ان کے ہاتھ پیر کانپ رہے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہم نے ڈگری ہی کو زندگی کی سب سے اہم شے سمجھ لیا ہے۔

زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے خود کو نکالیے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''بڑی منزلوں کے مسافر چھوٹے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔'' جب تک زندگی میں چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر سے توجہ ختم نہیں ہوگی، تب تک کوئی بڑا کام نہیں کیا جاسکتا۔ بڑے کام کیلئے ضروری ہے کہ آپ کی سوچ بڑی ہو۔ آپ کو سمجھ آجائے کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ آپ کو شعور ہو کہ ایک چھوٹی سی زندگی میں مجھے کوئی بڑا کام کرنا ہے، کچھ دے کر جانا ہے۔

ایک آدمی کے بارے میں یہ غلط خبر چھپ گئی کہ وہ مرگیا ہے۔ خبر کی سرخی تھی، ''موت کا سوداگر مرگیا ہے۔'' اس نے جب یہ پڑھا تو سوچا کہ میرے نام کے ساتھ تو موت کا سوداگر لکھا جائے گا۔ وہ اس لیے لکھا گیا کہ اس نے بم بنایا تھا۔ اس نے سوچا اور اپنے کاروبار کا تمام پیسہ ''نوبل پرائز'' پر لگا دیا۔ آج اس کا نام ''نوبل پرائز'' کی وجہ سے زیادہ ہے۔ آپ سوچئے کہ آپ کی بھی تو کوئی شناخت ہو، جو آپ کو زمین سے اٹھائے۔ کب تک طیارہ ایئرپورٹ پر پھرتا رہے گا۔ کب تک وہ اڑنے کا فیصلہ نہیں کرے گا۔ تعلیم مکمل ہوگئی، ڈگری مل گئی اور اب بھی پلان یہی ہے کہ غلام ابن غلام!

ناکامی بہت بڑا انعام ہے

زندگی میں آپ کا امتحان نہیں ہوتا، آپ کے ارادوں کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کچھ کریں اور رکاوٹیں نہ آئیں۔ رکاوٹیں تو آنی ہی ہیں، کیونکہ یہ ساری رکاوٹیں کہانی بنتی ہیں۔ جب بھی آپ کی مخالفت ہو اور آپ کامیاب ہو جائیں تب کامیابی کی کہانی بنتی ہے۔ سیدھا راستہ کبھی کہانی نہیں بناتا۔ آپ کو صرف یقین کی معاونت ہوتی ہے جو آپ کو آگے لے کر جاتا ہے۔ جب آدمی کہیں پہنچ جاتا ہے تو اسے پتا لگتا ہے کہ رکاوٹیں تو کچھ بھی نہیں تھیں۔ رکاوٹ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا کوئی ہدف ہے۔ رکاوٹ کا

مطلب ہے کہ کوئی ارادہ ہے۔ رکاوٹ کا مطلب ہے کہ سیکھنے کو کچھ نیا مل رہا ہے۔ آپ غلطیاں کریں گے، مگر انہی غلطیوں سے تو سیکھیں گے۔

ذہین کی تعریف یہ ہے کہ اس کا تجربہ ہے اور اس نے تجربے سے سیکھا ہے۔ اعتماد تجربوں اور غلطیوں سے آتا ہے۔ جتنی غلطیاں کر کے آپ سیکھتے ہیں، اتنا زیادہ آپ پُر اعتماد ہوتے ہیں۔ جو فرد اپنی زندگی کی ذمے داری کو خود نہیں سنبھالتا، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ لیکن، جب آپ کامیابی پاتے ہیں تو آپ کے سارے سفر کی قیمت ادا ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کا شوق ہے تو پھر آپ اپنے آپ کو تھکا سکیں گے۔ آدمی کام سے تھکتا ہے، محبت سے نہیں تھکتا۔ لہٰذا، جس کام سے محبت ہوتی ہے اسے کرنے سے آپ کو کبھی تھکاوٹ نہیں ہوگی۔ جو آدمی زندگی میں نو سے پانچ بجے تک کام کر رہا ہے، وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ ترقی کرنے والے گھڑی دیکھ کر کام نہیں کرتے، گھڑی کو اپنے اہداف کے مطابق چلاتے ہیں۔

آپ جب کوشش کرتے ہیں اور مطلوبہ نتائج نہیں ملتے تو اسے ناکامی سمجھتے ہیں۔ یہ ناکامی ہمیشہ دو نتیجے دیتی ہے۔

1) جو ناکامی آئی تھی، اس کے نتیجے میں آپ نے کیا کوئی سبق حاصل کیا؟ آپ کو پتا لگ گیا کہ جو غلطی میں نے کی تھی، آئندہ میں نہیں کروں گا، کیونکہ آپ نے اس کی قیمت ادا کی ہے۔ وہ قیمت کیا ہے؟ آپ نے ناکامی کا سامنا کیا ہے۔ قیمت قدرت کی طرف سے جواب ہوتا ہے کہ یہ سبق یاد رکھنا، کیونکہ تم نے یہ قیمت ادا کی تھی۔

2) ناکامی کا مطلب یہ بھی ہے کہ یہ راستہ ہمارا نہیں ہے۔ قدرت ہمیں یہ بتانا چاہ رہی ہوتی ہے کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو، یہ تمھارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ تم اس مقصد کیلئے پیدا نہیں کیے گئے۔ یہ نہ کرو، وہ کرو جو تمھارے لیے ہے۔ بوریت یا بیزاری ایک انعام ہے۔ بوریت کو آپ کسی جگہ پر تجربہ کر لیں تو وہ کام نہ کریں۔ آپ کسی کو دیکھ کر جو کام کرتے ہیں یا والدین یا رشتے داروں کی خواہش کے مطابق کام کرتے ہیں تو وہ آپ کی زندگی میں

بیزاری اور بیزاری پیدا کرتا ہے۔

بلاعنوان

اگر آپ زندگی کے کسی ایک حصے کو دیکھیں تو زندگی آپ کو ٹھہری ہوئی لگے گی۔ زندگی میں ہر ایک کو مختلف امتحانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امتحانات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ آپ کو ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ کو ثابت کرنا پڑے گا کہ مسئلہ بڑا ہے یا آپ مسئلے سے بڑے ہیں۔ فیصلہ آپ پر ہے۔

ہم دنیا کی واحد امت ہیں جنہیں یہ اعزاز ہے کہ اگر آپ نے روشن دان اس نیت سے لگایا کہ اس سے آذان کی آواز آئے گی تو آپ کو اذان کا ثواب ملے گا.... آواز تو آنی ہی آنی ہے، ثواب بھی مل جاتا ہے۔ جس کا کام اس کی عبادت نہیں ہے، اس کی مسجد میں عبادت سوالیہ نشان ہے۔ حضرت سری سقطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، "میں نے کعبے کی دیوار سے لپٹے ہوئے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ رو رہا تھا، آنسو بہا رہا تھا۔ اور جب اس کے باطن میں دیکھا تو دنیا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جبکہ بغداد کے بازار میں ایک شخص کو معمول کے مطابق کاروبار میں مشغول دیکھا۔ جب اس کے باطن میں جھانکا تو رب کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔"

ہمارا المیہ یہ ہے کہ آج ہم نے دین اور دنیا کو علیحدہ کر دیا ہے۔ دین نہ تو فقط عبادات کا نام ہے اور نہ دنیا کاروبارِ حیات کا نام ہے۔ آپ کی نیت آپ کا دین بھی ہے اور دنیا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار آپ کو دیا ہے۔ اسی لیے ہم سے سوال کیا جائے گا۔ اور سوال اسی سے کیا جاتا ہے جس کے پاس چوائس ہوتی ہے، جس کے پاس اختیار ہوتا ہے۔



خود اعتمادی

"خود اعتمادی میں کمی درحقیقت، خود شناسی میں کمی کا مسئلہ ہے۔ جب ایک بار آپ اپنے بارے میں جان جاتے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ جو کچھ ہیں، وہ کیوں ہیں۔ تب آپ خود کو بہتر سے بہتر کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں!"

روبرٹ اینتھونی

خود اعتمادی کے ذرائع

- خود اعتمادی کا پہلا ذریعہ علم ہے، لہٰذا اپنا علم بڑھایئے۔ علم میں نصابی علم بھی شامل ہے اور غیر نصابی علم بھی۔ آپ تمام علم حاصل نہیں کر سکتے، مگر آپ اپنی فیلڈ میں جب تک نہایت علم حاصل نہیں کریں گے، آپ کے اندر خود اعتمادی نہیں آئے گی۔
- اپنے کردار کو اچھا بنایئے۔ انسان جتنا اچھا اور سچا ہوتا ہے، اس میں اعتماد اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ ڈر اس میں ہوتا ہے جو چور ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔ اس کا مطلب ہے، چور کے دل میں ڈر ہوتا ہے۔
- ہم جتنا خود کو سمجھیں گے، اتنا ہی اعتماد زیادہ آئے گا۔ سقراط کو کسی نے گالی دی۔ وہ مسکرانے لگا۔ کسی نے کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ کوئی تمہیں گالی دیتا ہے اور تم مسکراتے ہو؟ سقراط نے جواب دیا، یہ جو کہہ رہا ہے، غلط ہے۔ میں وہ نہیں ہوں۔ جس کو اپنا پتا ہوتا ہے اس میں کنٹرول ہوتا ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ میں کسی کے برا کہنے سے برا نہیں ہو جاؤں گا۔

- اللہ تعالیٰ پر جس کا ایمان زیادہ ہوتا ہے، اس میں اعتماد زیادہ ہوتا ہے۔ اس کو کوئی خوف اور ڈر نہیں ہوتا۔ اسے پتا ہے کہ "وہ" محافظ ہے۔ اس سے بڑا محافظ کون ہو سکتا ہے۔
- پریکٹس بھی اعتماد بڑھاتی ہے۔ ہر وہ چیز جس کو بہتر کیا جا سکتا ہے، اس کی پریکٹس ضرور کیجیے۔ جب ہم کسی چیز کے بارے میں بہت زیادہ سنجیدہ ہوتے ہیں تو اس کی بہت زیادہ پریکٹس کرتے ہیں جس کی وجہ سے نکھار آ جاتا ہے۔ زیادہ مشق والا جب امتحانات میں بیٹھتا ہے تو اس میں زیادہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ اپنا پیپر اچھی طرح کرے گا۔
- بعض اوقات گھر کا ماحول اتنا اچھا ہوتا اور مثبت ہوتا ہے کہ اس ماحول کی وجہ سے خود اعتمادی آ جاتی ہے۔
- اعتماد حاصل کرنے کیلئے چھوٹی چھوٹی کامیابیاں حاصل کیجیے۔ وہ لوگ جنہوں نے کچھ میڈلز لیے ہوتے ہیں، جنہیں آگے بڑھنے کے زیادہ مواقع ملے ہوتے ہیں، ان میں زیادہ اعتماد ہوتا ہے۔
- اپنی عزت کرنا سیکھیے۔ جو لوگ اپنی قدر کرتے ہیں، اپنی عزت کرتے ہیں ان میں زیادہ اعتماد ہوتا ہے۔ جب آپ اپنے آپ کو مان جاتے ہیں تو پھر ایک دن دنیا بھی آپ کو مان جاتی ہے۔ اگر آپ خود سے عزت نہیں کرتے تو یہ ممکن نہیں کہ دوسرے آپ کی عزت کریں۔ ڈاکٹر وین ڈبلیو ڈائر اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ پہلی محبت جو انسان کو کسی سے کرنی چاہیے، وہ خود اپنی ذات ہے۔ اگر آپ اپنے آپ سے محبت نہیں کرتے تو آپ دوسروں سے محبت نہیں کر سکتے۔

لیڈر شپ

"خود سے کام لینے کیلئے اپنا دماغ استعمال کرو!

دوسروں سے کام لینے کیلئے اپنا دل استعمال کرو!"

ایلینر روزویلٹ

قیادت

قدرت ہر نبی کو قیادت ودیعت کرتی ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ ان کے معاشرے پر ان کے اثرات پڑنے ہیں۔ انہوں نے انسانیت کو دینا ہوتا ہے، اور دینے کیلئے قیادت بہت ضروری ہے۔ دنیا میں تین طرح کے قائد ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے قائد پیدائشی قائد ہوتے ہیں۔ اس میں نبی، پیغمبر، اور رسول شامل ہیں۔ دوسرے قائد وہ ہوتے ہیں جو حالات و واقعات سے قائد بنتے ہیں۔ اور تیسرے وہ ہوتے ہیں جو سیکھنے یا کسی سے متاثر ہو کر قائد بنتے ہیں۔

لیڈر شپ میں چار الفاظ ہیں۔ پہلا لفظ لیڈ ہے۔ دوسرا، لیڈر۔ تیسرا، لیڈر شپ۔ اور چوتھا، شپ۔ اگر ہم ان کے معانی دیکھیں تو لیڈ (Lead) کرنے کا مطلب ہے، رہنمائی کرنا۔ دوسرا لیڈر (Leader) جو رہنما ہوتا ہے۔ تیسرا لیڈر شپ (Leadership)، کوئی ایسا آلہ ہے جو سمندر میں تیرتا اور چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتا ہے۔ چوتھا لیڈر شپ (Leadership) کا مطلب ہے کہ وہ طریقہ کار جس میں کوئی لیڈر لوگوں کو کسی مقام تک پہنچا دے۔

جان میکسویل نے لیڈر شپ پر دنیا میں سب سے زیادہ تحقیق کی ہے۔ وہ کہتا ہے، "اگر آپ کو ترقی کرنی ہے اور آپ سے کہا جائے کہ صرف اپنے اندر ایک صفت پیدا کر لو تو ترقی ممکن ہو جائے گی تو اس صفت کا نام ہے، لیڈر شپ۔" دنیا کے تمام بڑے لوگ لیڈر ہوتے ہیں۔ جب لیڈر شپ کی بات کی جائے تو یہ ذہن میں رہے کہ لیڈر وہ فرد ہوتا ہے جو دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ ہر انسان لیڈ نہیں کر سکتا۔ حضرت پیر مہر علی شاہؒ کے ایک بیٹے کا نام "باؤجی" تھا۔ ان کی عمر نو یا دس سال تھی۔ انگریز نے گولڑہ شریف سے نئی نئی ٹرین چلائی تو باؤجی روزانہ ٹرین دیکھنے ریل کی پٹڑی کے پاس چلے جاتے۔ ان کے مریدوں نے باؤجی سے پوچھا، آپ یہاں کیوں آتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا، مجھے ٹرین سے محبت ہو گئی ہے۔ مریدوں نے پوچھا، کیوں محبت ہو گئی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کی پانچ وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ، ٹرین کا انجن ٹرین کو منزل تک لے کر جاتا ہے؛ دوسری وجہ، آخری ڈبے کو بھی ساتھ لے کر جاتا ہے؛ تیسری وجہ، آگ خود کھاتا ہے، ڈبوں نہیں کھانی پڑتی؛ چوتھی وجہ، صراط مستقیم پر چلتا ہے؛ اور پانچویں وجہ، یہ ڈبوں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ ڈبے اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ آپ فیصلہ کیجیے کہ زندگی انجن کی طرح گزارنی ہے یا ڈبے کی طرح گزارنی ہے۔

پاکستان میں سب سے مشکل ٹیسٹ لڑاکا طیارے کے پائلٹ کا ہوتا ہے۔ اس میں پائلٹ کو ایک کیبن میں ڈال کر ہوا کا دباؤ کم کر کے گھمایا جاتا ہے۔ اس میں کئی لوگوں کے کان تک پھٹ جاتے ہیں۔ جو فرد اس ٹیسٹ میں کامیاب ہوتا ہے، اسے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے جس کے ہاتھ میں کروڑوں روپے کا طیارہ دینا ہے، وہ اتنا قابل ہو کہ وہ اس طیارے کو اڑا سکے۔ پائلٹ کو کہا جاتا ہے کہ اگر کبھی آپشن آئے کہ طیارہ تباہ کرنا ہے یا خود کو بچانا ہے تو تم طیارہ تباہ کر دینا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اس سے کئی گنا مہنگے ہو۔۔۔ کیونکہ تم لیڈر ہو۔ ہمارے معاشرے کو ڈاکٹر بہت ملے، انجینئر بہت

ملے، سائنس داں بہت ملے، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بہت ملے، آفیسرز بہت ملے، مگر لیڈر نہیں ملے۔ تربیت ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے اور وہیں سے لیڈر پیدا ہوتے ہیں، مگر یہاں بچے پیدا ہوتے ہیں، لیڈر نہیں۔ جس گھر میں، نظام میں اور جس ادارے میں لیڈر موجود ہوتا ہے، وہ خوب ترقی کرتا ہے۔

رنجیت سنگھ گوجرانوالہ کا کسان تھا، مگر وہ لیڈر تھا۔ اس میں یہ کوالٹی تھی کہ وہ آدمی سے کام لینا جانتا تھا۔ اس نے ایک فرنچ جرنیل ونچورا کو رکھا۔ وہ بہت ذہین تھا۔ جب رنجیت سنگھ مر گیا تو ونچورا حکومت چھوڑ کر واپس فرانس چلا گیا۔ وہاں کے لوگوں نے اسے کہا کہ تم کیوں آ گئے ہو؟ اس نے جواب دیا، جو لیڈر تھا وہ مر گیا۔ جب لیڈر مر گیا تو پھر میرا کام بھی نہیں رہا۔ کارپوریٹ دنیا میں جتنے سی ای او ہوتے ہیں ان میں 73 فیصد اس لیے سیٹوں سے ہٹائے جاتے ہیں کہ وہ لیڈر نہیں ہوتے یا یوں کہہ لیں کہ دنیا میں نوکریوں سے ان لوگوں کو نکالا جاتا ہے جو ذمے دار نہیں ہوتے۔ اس 73 فیصد کو آپ خاندان، گھر اور ملک پر لاگو کریں، آپ کو نتیجہ مل جائے گا۔

حضرت قائداعظمؒ کی گاڑی پھاٹک پر گئی۔ پھاٹک بند تھا۔ پی اے نے اتر کر پھاٹک کھلوایا۔ جب وہ واپس آ کر گاڑی میں بیٹھا تو آپؒ نے اس سے کہا، تم نے کیا کیا؟ اس نے کہا، میں نے آپ کیلئے پھاٹک کھلوایا ہے۔ آپؒ نے کہا، ''اسے بند کراؤ۔ آج میرے لیے کھلا ہے، صدیوں تک دوسروں کیلئے کھلتا رہے گا۔'' ایک دفعہ 1946ء میں قائداعظمؒ کے پاس پشاور یونیورسٹی کے دس طلبہ ملنے آئے۔ اسسٹنٹ نے انہیں آپ کے پاس بٹھایا۔ آپؒ نے بچوں سے پوچھا، تم کیسے آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا، سائیکلوں پر آئے ہیں۔ آپؒ نے پوچھا، کتنوں کی سائیکلوں میں لائٹ لگی ہوئی ہے؟ انہوں نے جواب دیا، ہم نے تو کوئی لائٹ نہیں لگائی۔ آپؒ نے ان سے کہا، ''تم میں سے ایک بھی میرے ملک میں جانے کے قابل نہیں ہے۔'' اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ قانون تھا کہ سائیکل

میں لائٹ لگی ہو۔ ایک بچے نے کہا، سر! یہ گورے کا قانون ہے۔ آپؒ نے فرمایا، ''قانون تو قانون ہوتا ہے۔'' آپؒ اتنے چھوٹے قانون کا بھی احترام کرتے تھے۔ یہ تھا اُن کا ویژن۔ آج جو ملک ترقی کر رہے ہیں وہ اپنے لیڈروں کی وجہ سے ترقی کر رہے ہیں۔ آدمی اگر اپنی آخرت دیکھ لے تو اسے سمجھ آ جاتی ہے کہ یہاں بڑے بڑے آئے اور چھوڑ کر چلے گئے۔ میری کیا اوقات ہے۔ رہے نام اللہ کا!

اگر آپ کا عمل دوسرے کو بڑا خواب دیکھنے، سیکھنے اور کچھ کر گزرنے، کچھ بن جانے کیلئے متاثر کرتا ہے تو پھر آپ لیڈر ہیں۔ زندگی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے لوگ بڑے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ لیڈر ہوتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہی نوازنا ہے تو پھر آپ کیوں چھوٹا سوچتے ہیں۔ وہ ایسا مالک ہے کہ اگر آپ نہیں مانگتے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔

لیڈر شپ وقتی نہیں ہوتی کہ آدمی کہے کہ میں دو گھنٹے کیلئے لیڈر رہوں اور بائیس گھنٹے نہیں ہوں۔ یہ چوبیس گھنٹے کا کام ہے۔ یہ فل ٹائم ڈیوٹی ہے۔ لیڈر شپ سوچنے کا ایک انداز ہے، ایک زاویہ نظر ہے۔ اگر آپ کا زاویہ نظر ایسا نہیں تو پھر آپ لیڈر نہیں ہیں۔ لیڈر شپ میں منافقت نہیں ہوتی ہے۔ یہ سچا کھرا ہونے کا نام ہے۔ جو اندر ہے، وہی باہر ہے۔ اگر آپ میں کردار نہیں ہے تو آپ لیڈر نہیں ہیں۔ اگر آپ کو زندگی میں ترقی کرنی ہے تو پھر آپ اپنے کردار پر کام کیجیے۔ جتنا بڑا کردار ہوگا، اتنے بڑے آپ لیڈر بنیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جتنے بڑے لیڈر ہوتے ہیں وہ لالچی نہیں ہوتے۔

پچیس سال کی عمر میں حضرت قائداعظمؒ کے پاس برصغیر میں مہنگی ترین گاڑی تھی۔ جب آپؒ اس دنیا سے گئے تو سات شہروں میں ان کے اتنے بڑے گھر تھے کہ ایک ایک گھر میں ملازمین کی تعداد بیس سے زائد تھی اور جب اس دنیا سے گئے تو سب کچھ ملک کو دے گئے۔ سکندر اعظم جب دنیا سے گیا تو کہا کہ میرے دونوں ہاتھ کفن سے باہر کر دینا۔ کسی نے

پوچھا، کیوں؟ اس نے کہا کہ دنیا کو پتا لگ جائے کہ دنیا کو فتح کرنے والا بھی خالی ہاتھ ہی جاتا ہے۔ کردار ایک ایسی چیز ہے جو اثر ڈال دیتی ہے۔

لیڈر کا معاوضہ

ہمارے ہاں جو نام رکھے جاتے ہیں اس کے تین حوالے ہوتے ہیں۔ ایک مذہبی، اچھا معنی اور پکارنے میں آسانی۔ ہم کہتے ہیں کہ نام کے معانی کا بچے کی شخصیت پر اثر پڑتا ہے۔ سیتھ گوورڈن کہتا ہے، "دنیا کے جتنے بھی ذہین لوگ ہیں وہ اپنی بہترین صلاحیت جس ادارے یا جس کمپنی کو دے رہے ہوتے ہیں انہیں پتا ہوتا ہے کہ انہیں ادھر سے مکمل معاوضہ نہیں ملنا۔ اس معاوضے کا حصہ قدرت نے ہمیں دینا ہے۔" جیسے ہی ذہین لوگ اپنی بہترین صلاحیت کا استعمال کرتے ہیں، قدرت انہیں اتنا نوازتی ہے کہ وہ حیران ہو جاتے ہیں۔ آپ جہاں بھی کام کر رہے ہیں، وہاں اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کیجیے اور ان صلاحیتوں کے معاوضے کا تقاضا اپنے ادارے سے نہ کریں، اللہ تعالیٰ سے کریں۔

ایک تحقیق کے مطابق، یہودیوں میں ملکہ ایک مذہبی عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کے مطابق ان کے خاندان میں ایک ایسا فرد پیدا ہوتا ہے جو خوش قسمت ہوتا ہے اور وہ لیڈر بھی ہوتا ہے۔ یہ اپنے خاندان میں دیکھتے ہیں کہ وہ خوش قسمت کون ہے۔ ان میں مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر یہ خوش قسمت لیڈر ہم میں ہے تو ہم ہیں۔ یہ نہیں ہے تو ہم نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں، بعض لوگ لیڈر شپ لے کر آتے ہیں۔ ان کی وجہ سے خاندان کہیں سے کہیں چلے جاتے ہیں، کمپنیاں اور ادارے کہیں سے کہیں چلے جاتے ہیں۔ آپ جہاں پر بھی ہیں، چاہے آپ گھر میں ہیں یا کسی ادارے میں ہیں، اپنے آپ کو لیڈر بنانے کی کوشش کیجیے۔ دنیا کا ہر انسان اپنے لیے کام کرتا ہے۔ جب اپنے لیے ہی کرنا ہے تو پھر کیوں نہ اسے انجوائے کیا جائے۔ بسا اوقات انسان سیکھتا کہیں سے ہے اور فائدہ کہیں اور ہوتا ہے۔ اگر آپ لیڈر ہیں تو آپ کی کارکردگی آج سے دس سال بعد نوسو فیصد

بڑھ جانی چاہیے۔

دنیا میں پروفیشن کے لحاظ شخصیت کی 13 قسمیں ہیں اور 13 قسم کے ہی لیڈر ہیں۔ ان میں کوئی آرٹ اینڈ کلچر میں لیڈر ہوتا ہے، کوئی آئی ٹی میں لیڈر ہوتا ہے، کوئی سیاست میں لیڈر ہوتا ہے، کوئی لکھنے میں لیڈر ہوتا ہے، کوئی کھیل میں لیڈر ہوتا ہے۔ لیڈر وہ ہوتا جس میں قائدانہ خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ وہ کہیں پر بھی ہو، وہ Lead کرتا ہے۔ آپ کو بھی خاندان کے فنکشن میں اکٹھا ہونے کا موقع ملے تو آپ اپنے بچوں کو چھوڑ دیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ کو پتا چل جائے گا کہ کون لیڈر ہے۔ سارے بچے جس بچے کی بات ماننا شروع کر دیتے ہیں، وہ بچہ لیڈر ہوتا ہے۔

لیڈر ہر جگہ لیڈر ہوتا ہے۔ اس کی لیڈر شپ ہر جگہ کچھ نہ کچھ محسوس ہوتی ہے۔ لوگوں کو لگتا ہے کہ اس میں کچھ ہے۔ لیڈر شپ ایک ایسی چیز ہے جس میں حوصلہ اور ظرف چوبیس گھنٹے ہونا چاہیے۔ جیسے حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ چوبیس گھنٹے لیڈر رہتے۔ آپ کے 570 واقعات کتابوں میں درج ہیں اور ان کے ایک ایک واقعے میں لیڈر شپ نظر آتی ہے۔ جس طرح شرارتی بچے کو چین نہیں آتا، اسی طرح جس میں لیڈر شپ ہوتی ہے اسے بھی چین نہیں آتا۔ اس کے اندر کا لیڈر بار بار کہتا رہتا ہے کہ مجھ سے کام لو۔

آپ قابل بنیں، آپ کو انعام قدرت نے دینا ہے۔ کسی کمپنی نے نہیں دینا۔ قدرت تو تیار ہے۔ بس، آپ کی قابلیت اس مقام پر پہنچنی چاہیے جہاں پر انعام ملنا ہے۔ زندگی میں آپ کو ایک موقع ملا ہے۔ اس میں اپنے آپ کو ثابت کر کے جائیں کہ آپ لیڈر ہیں۔

لیڈر کی خصوصیات

ماہرین نے لیڈر یا قائد کی درج ذیل خصوصیات بیان کی ہیں:

1- ویژن

جو فرد آج میں بیٹھ کر آنے والے زمانے کو دیکھ لے، وہ لیڈر ہوتا ہے۔ سیب کو دیکھنا

بڑی بات نہیں ہے۔ سیب کے اندر درختوں کو دیکھنا بڑی بات ہوتی ہے، کیونکہ ایک سیب میں کتنے بیج ہیں اور بیجوں میں کتنے درخت ہیں اور ان درختوں میں کتنے سیب ہیں... لامحدود۔ شیخ سعدی شیرازیؒ گھر میں تشریف فرما تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ آپؒ نے دروازہ کھولا تو سامنے اسی سال کا اندھا بھکاری کھڑا ہوا تھا۔ شیخ نے پوچھا، کچھ چاہیے؟ اس نے کہا، نہیں میں ایک سوال لے کر آیا ہوں۔ کیا مجھ سے زیادہ بدقسمت اور کوئی ہوگا؟ آپؒ نے پوچھا، ''کس بات کی بدقسمتی؟'' اس نے کہا، ''میرے پاس آنکھیں نہیں ہیں، بصارت سے محروم ہوں، اسی سال میری عمر ہے۔ میں نے دنیا نہیں دیکھی۔ مجھ سے بڑا بدقسمت اور کون ہوگا؟'' شیخ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، ''تجھ سے بڑا بدقسمت وہ ہے جس کے پاس بصارت ہے، مگر بصیرت نہیں ہے۔''

مسلمان مومن کے پاس ویژن ہوتا ہے۔ اس کو اپنی منزل جنت نظر آرہی ہوتی ہے۔ دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو قدم اٹھاتے ہیں، انہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ اس کا انجام کیا ہے۔ دو چیزوں کے پہرے دار بنیں۔ ایک سوچ اور ایک عمل۔ سوچ پہلے ہے اور عمل بعد میں ہے۔ جو آدمی اپنی سوچ اور عمل کا پہرے دار ہے، وہ ویژن والا انسان ہے۔

تکبر وہ صفت ہے جو انسان کا سب کچھ بگاڑ دیتی ہے۔ جب سر سید احمد خان تیرہ سال کے تھے تو انہوں نے اپنے گھر کے ملازم کو تھپڑ مار دیا۔ ماں نے تین دن تک گھر میں داخل نہیں ہونے دیا۔ پھر تین دن کے بعد ملازم سے معافی منگوائی اور گھر میں داخل ہونے دیا۔ ایک قدم انسان کو کہاں تک پہنچا دیتا ہے۔ عبدالستار ایدھی کی والدہ انہیں اسکول جانے کیلئے دو آنے دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ایک آنہ خود کھانا اور دوسرے سے کسی کی مدد کرنا۔ اس ایک عمل سے وہ کتنا بڑا انسان بن گیا جبکہ آج ہم اپنے بچوں کو کیا سبق دے رہے ہیں؟

ویژن کیلئے تعلیم ضروری نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہوتا ہے۔ سوچ اور سنگت سے ہوتا ہے۔ جب آپ کی زندگی میں ویژن ہوتا ہے تو آپ قدم اٹھاتے ہوئے سوچتے

ہیں۔ رنجیت سنگھ کی مجلس مشاورت میں جرنیل ونچورا شامل تھا۔ رنجیت سنگھ نے ونچورا کو کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ سکھ قوم محتاج نہ ہو۔ اس نے جواب دیا، "فقط عورت کیلئے تعلیم لازم کردو اور یہ نانیوں دادیوں سے لے کر چھوٹی بچیوں تک لازم کردو۔" رنجیت سنگھ نے پوچھا، "اور مرد؟" ونچورا نے جواب دیا، "ان کی خیر ہے۔ تمہاری نسل میں محتاج پیدا ہونا بند ہو جائیں گے۔" اس کے بعد رنجیت سنگھ نے تعلیم لازم کردی اور آج اس قوم میں بھکاری نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر آپ نے اپنی نسل میں خودداری اور علم حاصل کرنے کا شوق پیدا کردیا تو پھر آپ کی نسل میں بھکاری پیدا نہیں ہوگا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں مسلمان زکوۃ لے کر بازار جاتے تھے، مگر کوئی لینے والا نہ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ خوشحالی تھی۔ اس لیے مچھلی پکڑ کے کھلانے سے بہتر ہے، آپ اسے مچھلی پکڑنا سکھائیں تاکہ محتاجی ختم ہو جائے۔ دنیا میں جتنے بھی ویژن والے انسان ہوتے ہیں، ان کا نام زندہ رہتا ہے۔

ایک بھکاری نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت نوازا تھا، مگر میری حرکتیں ایسی تھیں جس سے پیسہ اجڑتا ہے۔ میں نے ان حرکتوں کو نہ چھوڑا اور آج میری یہ حالت ہو چکی ہے کہ میں بھکاری بن گیا ہوں۔ اصل میں وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میرے پاس ویژن نہیں تھا۔ اگر ویژن نہ ہو تو کھربوں روپیہ بھی ہو تو وہ بھی اجڑ جاتا ہے۔ اگر ویژن ہو تو اس کا صحیح استعمال ہوتا ہے۔ چیتا 122 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہے، مگر وہ صرف تین منٹ بعد ہی تھک جاتا ہے۔ اسی وجہ سے چیتا سکون سے بیٹھ کر اپنے شکار کو دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کون سے ہرن کا شکار کرنا ہے۔ پھر وہ پورے ویژن کے ساتھ حملہ کرتا ہے۔ زندگی میں جو کچھ کیجیے، ویژن کے ساتھ کیجیے۔ جب آپ ویژن کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں تو پھر کسی چیز کو چھوڑنا اور پکڑنا آسان ہوتا ہے۔

2- جوڑنے والا

لوگوں نے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ہاتھ میں کبھی قینچی نہیں دیکھی۔ ہمیشہ سوئی دھاگا

ہی دیکھا تھا۔ کسی نے بابا جی سے پوچھا، آپ کے ہاتھ میں کبھی قینچی نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا، ہو کاٹتی ہے، میں اسے نہیں پکڑتا؛ جو جوڑتی ہے، میں وہ پکڑتا ہوں۔ لیڈر وہ ہوتا ہے جو جوڑتا ہے۔ اپنے اندر جوڑنے والی صفت پیدا کیجیے۔ مختار مسعود کہتے ہیں، "اگر مردم شماری کی جائے تو یہ سولہ کروڑ نکلیں گے اور اگر مردم شناسی کی جائے تو سولہ بھی نہیں نکلیں گے۔" اگر آپ میں کوئی خوبی ہے تو پھر آپ جوڑیں گے، لوگ خود بدلیں گے۔

3- رول ماڈل

لیڈر، رول ماڈل ہوتا ہے۔ اسے سچا اور کھرا ہونا چاہیے۔ وہ قابل اعتبار ہو۔ جو لوگ قابل اعتبار نہیں ہوتے، وہ لیڈر نہیں ہوتے۔ اگر آپ کی کامیابی اور علم کے شاہد آپ کے اپنے لوگ ہیں تو پھر آپ سچے انسان ہیں، آپ لیڈر ہیں۔

4- خود اعتمادی

دنیا کے تمام بڑے لوگوں کو اپنے آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔ آپ کا خود پر اعتماد آپ کے کام کو آگے لے کر جاتا ہے۔ خود اعتمادی بڑھانے کیلئے سب سے پہلے آپ اپنا علم بڑھایئے۔ خود کو جانئے۔ زمانے کو جانئے۔ علم اس کے پاس ہوتا ہے جو زمانے کے علم کو جانتا ہے۔ جس نے سب چیزوں کو پرکھا ہوا ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے زمانے کا علم نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ہم میں گھٹن ہوتی ہے۔ ہم ڈرتے ہیں کہ ہم نے قدم رکھا تو کیا ہو جائے گا، اس لیے اپنے بچوں کو زمانے کا علم ضرور دیجیے۔

جس کے پاس جتنا بہتر کردار ہوگا، اس میں اتنا ہی اعتماد ہوگا۔ کنفیوژن سے آزادی آپ میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے۔ اپنے اور اپنے بچوں میں سیدھی اور صاف بات کرنے کی عادت ڈالیے۔ اس سے خود اعتمادی ملے گی۔ جو آدمی اپنے مسئلے خود حل کر لیتا ہے، اپنے فیصلے خود کر سکتا ہے، وہ ذہین ہوتا ہے۔ ذہین آدمی میں زیادہ اعتماد ہوتا ہے۔

کیس سٹڈی

2006ء کی بات ہے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں ایم ایس سی کی کلاس تھی۔ اس میں بہت سے بچے زیر تعلیم تھے۔ ان میں چار بچوں کی کہانی:

پہلا بچہ: بہت زیادہ لائق تھا اور ہر کلاس میں فرسٹ آتا تھا۔ وہ گولڈ میڈل لیتا تھا۔

دوسرا بچہ: کلاس میں پیچھے بیٹھتا تھا۔ وہ صحیح طرح کے کپڑے بھی نہیں پہنتا تھا۔ وہ پڑھائی میں اتنا سنجیدہ نہیں تھا۔ گونگا سا تھا۔

تیسرا بچہ: کلاس کا سب سے شرارتی بچہ تھا۔ وہ ساٹھ فیصد یا اس سے کچھ زیادہ نمبر لیتا تھا۔ یہ بڑا شوخ سا تھا۔ جب کسی وجہ سے استاد کلاس نہیں پڑھاتا تو یہ کلاس پڑھا دیا کرتا تھا۔ جب یہ اپنے کلاس فیلوز کو کہیں لے کر جانا چاہتا تو سارے بچے اس کے پیچھے چل پڑتے۔

چوتھا بچہ: جب بھی کلاس میں کوئی مسئلہ ہوتا تھا آگے کھڑا ہو کر اپنی کلاس کو پیچھے لگا کر پرنسپل کے پاس چلا جاتا تھا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ سال بعد کی ان کی زندگی کچھ یوں تھی:

پہلا بچہ: تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسی اچھے ادارے میں ساٹھ ہزار سے زائد پر نوکری کر رہا تھا۔

دوسرا بچہ: عام سی زندگی گزار رہا تھا۔

تیسرا بچہ: تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسی بہت اچھے ادارے میں بارہ لاکھ روپے سے زائد نوکری کر رہا تھا۔ وہ اپنی کمپنی میں کنٹری ہیڈ تھا۔

چوتھا بچہ: تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسی تھانے میں اے آئی ایس بھرتی ہو گیا۔

پہلے بچے میں تعلیمی قابلیت تو بہت اچھی تھی، مگر اس میں اعتماد، بات چیت، دوسائل کا

استعمال اور لیڈر شپ کی کمی تھی۔ اس لیے وہ زیادہ ترقی نہیں کر سکا۔ دوسرا بچہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں سنجیدہ نہیں تھا۔ اس لیے کچھ بن نہیں سکا۔ تیسرے بچے میں اعتماد تھا اور اعتماد آگے بڑھنے کیلئے بہت ضروری ہے۔ دوسری خوبی اس میں یہ تھی کہ اسے بات چیت کرنا آتی تھی۔ اس میں تیسری خوبی یہ تھی کہ اسے اپنے وسائل میں رہتے ہوئے کام کرنا آتا تھا۔ جو آدمی اپنے وسائل میں رہتے ہوئے کام کر لیتا ہے، وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں لیڈر شپ تھی۔ کنڑی کا ہیڈ ہمیشہ لیڈر ہوتا ہے۔ کمپنی کبھی ایسے شخص کو جو گونگا ہو، کنڑی ہیڈ نہیں لگائے گی۔ جبکہ چوتھے بچے کو مسئلے مسائل حل کرنے کا بہت شوق تھا، لہٰذا اس نے زندگی میں اسی حساب سے ترقی کی۔

آپ ان چاروں میں کہاں ہیں؟



معاشی ترقی

"اگر تم اپنی زندگی بدلنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے تمہیں اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا!"

لاطینی کہاوت

امیر ہونے والے لوگوں کی سوچ

ماہرین کامیابی کا کہنا ہے کہ انسان کی امیری یا دولت مندی کا تعلق اس کے وسائل اور دستیاب پیسے سے نہیں ہوتا، بلکہ ایک فرد کی امیری کا تعلق اس کی سوچ سے ہوتا ہے۔ امیر آدمی کی سوچ میں درج ذیل خوبیاں ہونی چاہئیں:

1) جیت کی چاہت

تمام امیر ہونے والے لوگ جیتنا چاہتے ہیں، جبکہ غریب ہارنا نہیں چاہتا۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ ایک بچہ نمبر لینا چاہتا ہے، جبکہ ایک بچہ فیل نہیں ہونا چاہتا۔ بہ ظاہر دونوں باتیں ایک سی لگتی ہیں، مگر ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ جو فیل نہیں ہونا چاہتا، وہ صرف اتنی کوشش کرے گا کہ بس پاس ہو جائے۔ اور جو نمبر لینا چاہتا ہے وہ سوچتا ہے کہ میں زیادہ نمبر کیسے لے سکتا ہوں۔ جیت کی چاہت اور خواہش کچھ اور ہے، ہار سے بچنے کی خواہش کچھ اور ہے۔

تمام کے تمام امیر یا امیر ہونے والے لوگ بہت سی دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جتنے غریب لوگ ہوتے ہیں، وہ جتنا کماتے ہیں، اتنے ہی ان کے خرچے ہوتے ہیں۔ غریب پیسہ خرچ کرکے یہ سمجھتا ہے کہ کام ختم ہو گیا۔ امیر خرچ کرنے کے بعد جو پیسے بچ

جائیں، ان کو اثاثہ سمجھتا ہے۔ امیر بچت کے بعد جو بچ جائے، اس سے اخراجات پورے کرتا ہے۔ غریب خوب خرچہ کر کے اگر کچھ بچا جائے تو بچت کرتا ہے۔

امریکا میں ایک ٹڈا ہے جو گھاس پر پانچ میٹر تک جمپ کر سکتا ہے۔ اس ٹڈے کو چار میٹر کے باکس میں رکھ دیا گیا۔ کچھ دن کے بعد باہر نکالا تو اُس کی جمپ چار میٹر ہو چکی تھی۔ اسی طرح، تین میٹر کے باکس میں رکھا گیا تو کچھ عرصے بعد نکالا اس کی جمپ تین میٹر تک ہو چکی تھی۔ اسی طرح، دو میٹر کے باکس میں رکھا گیا، پھر ایک چھوٹی ڈبیا میں رکھا گیا۔ جب باہر نکالا تو وہ جمپ لگانا بھول چکا تھا۔ یہی حال انسان کا ہے۔ وہ اپنی صلاحیت کو اپنی خواہش کے مطابق کم یا زیادہ کر سکتا ہے۔ جب آپ امیر ہونے کیلئے بہت سا پیسہ کمانے کیلئے اپنا ذہن بناتے ہیں تو آپ کے اندر ویسی ہی صلاحیتیں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب آپ بل ادا کرنے کا سوچتے ہیں تو صلاحیتیں بھی بل ادا کرنے والی ہو جاتی ہیں۔

2) اپنی صلاحیتوں پر یقین

ہر کامیاب اور امیر ہونے والے آدمی کو اپنی صلاحیتوں پر پورا یقین ہوتا ہے۔ جب ایک شخص امیری کا سفر شروع کرتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ میرے اندر یہ صلاحیتیں ہیں اور میں ان صلاحیتوں کی وجہ سے امیر ہو جاؤں گا۔ اب سوال ہے کہ صلاحیتوں پر یقین کیسے آئے؟ اس کا بہت آسان جواب ہے کہ جب آپ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کریں گے تو یقین آئے گا۔ جو زیادہ محنت کرنے والے ہوتے ہیں، انھیں اپنی صلاحیتوں کا پتا چل جاتا ہے۔ وہ اپنے پر پھیلاتے ہیں تو انھیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُن کے کتنے پر ہیں۔ ایڈیسن کہتا ہے، اگر انسان کو اپنی صلاحیتوں کا پتا چل جائے تو وہ غلامی برداشت نہیں کر سکتا۔

اپنی صلاحیتوں پر یقین کی پہلی نشانی یہ ہے کہ آپ نوکری نہیں کر سکیں گے۔ آپ اپنا کاروبار کریں گے۔ نوکری کرنے والا درحقیقت اپنی صلاحیتوں کو کسی اور کو فروخت کر رہا ہوتا ہے اور کامیاب ہونے والا اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ کامیاب

آدمی اپنی صلاحیتوں کو جانتا ہے۔

ناکام ہونا مسئلہ نہیں ہے۔ صلاحیت پر یقین نہ ہونا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

انسان ''عادت'' والی مخلوق ہے۔ اگر آپ کی عادات مالکوں والی ہیں تو پھر آپ کل مالک بن جائیں گے۔ اگر عادتیں ملازموں والی ہیں تو پھر آپ ملازم بن جائیں گے۔ مثال کے طور پر، کسی نے آپ کو دو روپے دیئے۔ بدلے میں آپ نے دو روپے کا کاروبار کر لیا۔ اگر آپ نے دو روپے سے کم کا کاروبار کر کے دیا تو پھر یہ مالکوں والی عادت ہی نہیں ہے۔ مالک والی عادت یہ ہوتی ہے کہ دو روپے کے بدلے میں دو روپے سے زیادہ کا کام کر کے دیا جائے۔ انسان اچھا تب کرتا ہے کہ جب اس کی سوچ مالکوں والی ہوتی ہے۔ جو لوگ ملازم ہوتے ہیں، زیادہ تر کی سوچ بھی ملازموں والی ہو جاتی ہے۔ آپ اس وقت ملازمت کر رہے ہیں یا نہیں، اگر آپ مالک بننا چاہتے ہیں، امیر بننا چاہتے ہیں تو مالکوں والی عادات اختیار کیجیے، امیروں کی عادات اختیار کیجیے۔

ہر امیر ہونے والے شخص کو توقع ہوتی ہے کہ وہ امیر ہو جائے گا اور یہ توقع یقین کی حد تک ہوتی ہے۔ حدیث شریف ہے کہ ''اللہ تعالیٰ سے تم جیسا گمان کرتے ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہے۔'' جب آپ گمان اچھا کرتے ہیں تو آپ سے جو شعاعیں نکلتی ہیں، وہ کائنات میں جاتی ہیں اور بدلے میں ویسی ہی اچھی شعاعیں آپ کی طرف آتی ہیں۔ اگر آپ برا گمان کرتے ہیں تو بدلے میں ویسی ہی بری شعاعیں آپ کی طرف آتی ہیں۔ یہ قدرت کا قانون ہے، جسے آج سائنس ''لا آف ایٹریکشن'' کہتی ہے۔

مستقبل پر یقین دراصل خدا کی رحمت پر یقین ہے۔ جو لوگ خودکشی کرتے ہیں، انھیں اپنا مستقبل نظر نہیں آ رہا ہوتا۔ جو خواہشیں آپ کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں، یہ کائنات میں حسن پیدا کر رہی ہیں۔ انسان کی تمنا اس کو جینے پر مجبور کرتی ہے۔ خواہشیں جینے پر مجبور کرتی ہیں۔ خواب جینے پر اکساتے ہیں۔ اچھے مستقبل کا یقین خدا کی رحمت پر یقین کے مترادف ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی نا امید نہ ہو۔

3) اپنے آپ سے وعدہ

دنیا کے تمام امیر ہونے والے اپنے آپ سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ مجھے امیر ہونا ہے، مجھے کامیاب ہونا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا وعدہ اپنے ساتھ ہوتا ہے یا پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب انسان اپنے ساتھ وعدہ کرتا ہے اور وعدہ خلافی نہیں کرتا تو اللہ اسے اس وعدے کے مطابق نتیجہ دیتا ہے۔ وعدہ کی خلاف ورزی نہ کرنا، وعدہ کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اگر وعدے کے مطابق عمل نہیں کیا گیا تو یہ محض خواہش ہے۔

غریب انسان اپنے آپ سے وعدہ نہیں کر پاتا۔ وہ صرف خواہش رکھتا ہے کہ میں بھی امیر ہو جاؤں۔ لیکن، صرف خواہشوں سے امیر نہیں ہوا جاتا۔ ہر وہ شخص حقیقتاً ترقی کرنا چاہتا ہے جو واقعی اپنے آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ مجھے کچھ بننا ہے، کچھ کر کے دکھانا ہے۔ پھر اپنے ساتھ کیا ہوا وعدہ اسے دوڑاتا ہے۔

اگر وعدہ نہیں ہوگا تو پھر آپ پیچھے ہو جائیں گے۔ سچے وعدے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ کائنات کی پوشیدہ قوتیں بھی مدد کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ غائب سے مدد آنے لگتی ہے۔ یہ وعدے کی قوت ہے کہ آپ کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں بھی جاگتی ہیں اور ساتھ ہی کائنات بھی آپ کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ حضرت اقبال کا کیا ہی خوبصورت شعر ہے کہ ''خودی کو کر بلند اتنا کہ خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے؟'' اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے وعدے کا، آپ کے سچا ہونے کا معیار اتنا ہو کہ خدا بھی کہے کہ میرے بندے تیری اتنی محنت ہے، اب بتا تو کیا چاہتا ہے۔

4) بچت کی عادت

ہر ترقی کرنے والے انسان کو بچت کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ پیسہ بچا کر رکھتا

ہے۔ کئی لوگ جو کماتے ہیں، وہ سب کھا جاتے ہیں۔ بچت کی عادت بچپن سے پیدا کرنی چاہیے۔ ماؤں کو چاہیے کہ بچوں کو شروع سے بچت کی عادت ڈالیں۔ آپ اپنی کمائی میں سے بیس فیصد بچانا شروع کریں۔ وہ مستقبل میں آپ کے کام آئے گا۔ ہر کامیاب ہونے والا آدمی صحیح وقت پر بہت محنت کرتا ہے اور بعد میں زندگی سے لطف اٹھاتا ہے۔ جو جتنا کماتا ہے، اتنا ہی خرچ کرتا ہے تو وہ سفید پوش ہے۔ جو جتنا کماتا ہے، اس کے خرچے پورے نہیں ہو رہے ہوتے، وہ غریب ہے۔ جو جتنا کماتا ہے اور اس میں سے کچھ بچاتا ہے، وہ خوشحال ہے۔ اور جتنا کماتا ہے اور بہت سا بچ جاتا ہے، تھوڑا استعمال ہوتا ہے، وہ امیر ہے۔

5) پیسے سے پیسہ بنانا

پیسے سے پیسہ بنانا ایک مکمل فن ہے۔ امیر لوگوں کو پیسے سے پیسہ بنانا آتا ہے۔ وہ کاروبار میں پیسہ لگاتے ہیں اور پیسہ کماتے ہیں۔ فرض کیجیے، آپ کا جینز کا کاروبار ہے۔ پاکستان یہ جینز آپ کو چار سو روپے میں پڑتی ہے۔ اگر یہی جینز ترکی کو بیچیں تو ترکی والے یہی جینز 4800 روپے میں خریدیں گے۔ فرق کیا نکلا؟ 4400 روپے۔ چھ سو روپے آپ کے مختلف اخراجات ہیں، مثلاً کسٹم، پیکنگ وغیرہ۔ باقی آپ کی بچت ہوگئی 3800 روپے۔

اگر آپ کے پاس دس ہزار پینٹ کا آرڈر آئے تو آپ کو تین کروڑ اسی لاکھ کا فائدہ ہوگا۔ یہ آپ نے صرف ایک ہلے میں کما لیا۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، کاروبار میں 9 حصے ہیں، ملازمت میں ایک حصہ ہے۔ کاروبار میں آپ معاشی استحکام حاصل کر لیتے ہیں۔

یاد رکھیے، ہم اپنے حالات نہیں بدل سکتے مگر اپنے خیالات بدل سکتے ہیں اور خیال بدلنا مشکل نہیں ہے۔ آج ہی اپنے خیالات پہ کام کرنا شروع کیجیے... بغیر سیکھے؟ جی نہیں! کوئی بھی کام بغیر سیکھے نہیں کیا جا سکتا۔ جینا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ زندگی گزارنے کا فن سیکھے بغیر

زندگی اندھیرا ہے۔ زندگی میں اجالا آتا ہی تب ہے کہ جب ہم زندگی گزارنا سیکھتے ہیں۔ اور یہ ابھی سے سیکھنا شروع کر دیں گے تو اگلے دس سال میں زندگی کمال ہو جائے گی۔

6) نئے نئے مواقع تلاش کرنا

امیر ہونے والے لوگ نئے نئے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور نئے مواقع لوگوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ انسان کی خوش قسمتی بھی کسی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے اور انسان کی بد قسمتی بھی کسی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''تمہاری تقدیر وہ نہیں ہے جو تمہارے ہاتھ پر لکھی ہے۔ یہ آدھی تقدیر ہے۔ آدھی تقدیر اس کے ہاتھ پر لکھی ہوتی ہے جس سے تم ہاتھ ملاتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ راضی ہو تو وہ آپ کو اچھے لوگوں سے ملانا شروع کر دیتا ہے۔ آپ کو اچھے لوگوں کی تلاش دے دیتا ہے۔ آپ کے اندر اچھی طلب آجاتی ہے۔ جو اچھا آدمی آپ کو ملتا ہے اس کے ہاتھ میں آدھی تقدیر لکھی ہوتی ہے۔ آپ اس سے ہاتھ ملاتے ہیں اور وہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔ آپ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں، اگر یہ آدمی میری زندگی میں نہ آیا ہوتا تو آج میں یہاں نہ ہوتا۔ اسی طرح، ناکام آدمی کی ناکامی میں کسی فرد کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ بھی یہی کہے گا کہ اگر میری زندگی میں یہ فرد نہ آتا تو آج میں یہاں نہ ہوتا۔ البتہ یہ اس ناکام آدمی کا قصور ہے کہ اس نے فرد کا انتخاب کرتے وقت ایک کامیاب اور اچھے فرد کا انتخاب کیوں نہ کیا۔

7) اچھے لوگوں سے تعلق

امیر لوگ اپنی دوستیاں بھی امیروں سے کرتے ہیں۔ انسان پر جتنا اثر دوسرے کی سوچ کا ہوتا ہے اتنا کتاب کا بھی نہیں ہوتا۔ جب آدمی منفی سوچ رکھنے والوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے تو وہ اپنی صفات کھو بیٹھتا ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں جو آگے

بڑھنے والے ہیں، جن کے واضح مقاصد ہیں۔ ان لوگوں سے آپ کو شعاعیں ملیں گی جو آپ کے آگے بڑھنے میں معاون ہوں گی۔ بعض لوگوں سے ملیں تو پتا چلتا ہے کہ ان میں جوش بہت کم ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''نیک روحیں محفل میں لطافت پیدا کرتی ہیں، کثیف روحیں محفل میں کثافت پیدا کرتی ہیں۔''

بندہ نیک ہو تو دوسروں پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ بندہ برا ہو تو دوسروں پر برا اثر پڑتا ہے۔ اچھے آدمی کی نشانی یہ ہے کہ اگر اس کے پاس کوئی مسئلہ لے کر جائیں تو وہ آپ کا مسئلہ حل نہیں کرے گا، لیکن آپ کو ہلکا پھلکا کر دے گا۔ آپ کو درست رہنمائی فراہم کرے گا۔ آپ کو مسئلہ حل کرنے کیلئے تیار کر دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے جو شعاعیں اس سے ملتی ہیں اس سے آپ مسئلے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس لیے دوستیاں ان لوگوں کے ساتھ کیجیے جو بہتر ہیں اور جن کے مقاصد زندگی بہت واضح ہیں۔

8) ذمے داریوں کو قبول کرنا

دنیا کے تمام امیر ہونے والوں کی بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ ذمے داری قبول کرتے ہیں۔ جب آپ یہ ذمے داری قبول کرتے ہیں کہ میں اس نتیجے کا خود ذمہ دار ہوں تو پھر آپ اپنی مرضی کے نتائج تخلیق کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

ذمے داری کا مطلب اپنی غلطیوں کو تسلیم کر کے اپنی اصلاح کرنا ہے۔ اگر ایک شخص آج ناکام ہے اور ایک عرصہ گزرنے کے بعد اسے کامیابی مل گئی تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ اس نے ناکامی اور کامیابی کے درمیان کیا ایسا کیا تھا کہ وہ کامیاب بن گیا۔ جب ہم اس کی کامیابی کی وجہ دریافت کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ آدمی ذمے دار ہو چکا ہے۔ ذمے داری قبول کرنے کا مطلب ہے کہ جو کچھ اس وقت آپ کے ساتھ ہو رہا ہے، اس کی اصل وجہ آپ خود ہیں۔

اس کے برخلاف، ہر غریب انسان کی یہ سوچ ہوتی ہے کہ میری ناکامی کے ذمے دار میرے گھر والے، معاشرہ یا میرے حالات ہیں۔ یہ سارے جملے اس کی غیر ذمے داری کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ نے اکثر کو کہتے سنا ہوگا کہ اگر میرے والدین میرے ساتھ ایسا نہ کرتے تو کیا ہی اچھا ہوتا؛ اگر فلاں پارٹی حکومت آگئی تو میرے معاشی مسائل حل ہو جائیں گے؛ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بہت کچھ کر جاتا۔ یہ غیر ذمے دارانہ مزاج کے عکاس جملے ہیں۔

جو آدمی اپنی حالت کی ذمے داری خود قبول نہیں کر سکتا، وہ اپنی اصلاح کبھی نہیں کر سکتا۔ ذمے داری قبول کرنے کی پہلی نشانی یہ ہے کہ مجھے آگے جانے کی ضرورت ہے اور آگے بڑھنے کی سب سے بڑی ذمے داری میری اپنی ہے۔

جب آپ خود اپنے آپ کو کٹہرے میں کھڑا کرتے ہیں تو آپ میں بہتری آنا شروع ہو جاتی ہے۔ جیم روہن کہتا ہے کہ ''آدمی بڑا مقصد تو حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے آپ جو جدوجہد کرتے ہیں، وہ اس مقصد سے بھی اہم ہوتی ہے۔'' مثال کے طور پر ایک شخص ایک کروڑ روپیہ کماتا ہے۔ اگر اس کا ایک کروڑ روپیہ کھو گیا تو اتنا نقصان نہیں ہے، جتنا اس شخص کے چلے جانے سے ہوگا، کیونکہ اس شخص کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ وہ ایک کروڑ کما سکتا ہے۔ کروڑ کمانے میں اس نے جو سیکھا، وہ کروڑ روپے سے زیادہ اہم ہے۔ اردو کا مشہور محاورہ ہے، ''یہ منہ اور مسور کی دال''۔ اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ کرنے والے ہوتے ہیں، ان کے انداز اور اطوار ہی کچھ اور طرح کے ہوتے ہیں۔

معاوضے سے زیادہ کام

دنیا میں جتنے لوگ ترقی کر جاتے ہیں، ان میں ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے تفویض شدہ کام سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طالب علم اس راز کو جاننے کیلئے ایک جوس والے کے پاس گئے۔ وہ جوس والا دن میں ہزاروں روپے کماتا تھا۔ انہوں نے جوس والے

سے چند سوالات کیے:

سوال: آپ اتنی سیل کیسے کر لیتے ہیں؟

جواب: گلاس کے ساتھ چھوٹا گلاس مفت ہے۔

سوال: یہ تو ہم اپنی کتابوں میں پڑھ رہے ہیں کہ ہمیشہ احسان کرو، کچھ زیادہ دو۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟

جواب: چالیس برس پہلے میں چھابڑی پر کینو بیچا کرتا تھا اور ایک درجن میں تیرہ کینو دیتا تھا۔ کسی نے کہا کہ درجن تو بارہ ہوتے ہیں۔ میں جواب دیتا، میرے تیرہ ہوتے ہیں۔

جو آدمی تیرہ کینو نہیں دے سکتا، وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا کہ رات کو ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ پیسے کیسے لے کر جاتے ہیں۔

گنگا رام کہا کرتا تھا کہ جس نے بھی قدرت سے بیوپار کیا، وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

اپنے آپ سے سوال کیا کیجیے کہ میرے ملک نے مجھے کیا دیا اور میں نے اپنے ملک کو کیا دیا؟

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، "دنیا میں جس کے آنے سے فرق پڑتا ہے، اس کے جانے سے بھی فرق پڑتا ہے۔" اگر آپ کے جانے سے دنیا کو پتا چلے تو پھر آپ بڑے انسان ہیں، درویش ہیں، پھر آپ اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کے قابل ہیں۔"

سمتھ گورڈن اس وقت دنیا میں مارکیٹنگ اور تعلیم کے حوالے سے بہت بڑا تھینک ٹینک ہے۔ وہ کہتا ہے، "دنیا میں قدرت اس شخص پر ترقی لازم کر دیتی ہے جو اپنا بہترین مفت میں دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔"

ویڈیو اور لائیو لیکچر میں فرق ہوتا ہے۔ جب آپ لائیو لیکچر لیتے ہیں یا آمنے سامنے ہوتے ہیں تو آپ جس مقام پر جاتے ہیں یا ٹرینر لے کر جانا چاہتا ہے، اسے "مقامِ یقین" کہا جاتا ہے۔ مقامِ یقین علم کے مقام سے اگلا مقام ہے، یعنی جو میں جانتا ہوں اس پر میرا یقین کتنا ہے، کیونکہ اس یقین کے بعد اگلا قدم عمل کا آتا ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ جانتے

کے مقام پر کھڑے ہوتے ہیں، مگر وہ یقین کے مقام پر نہیں ہوتے۔ انھیں یقین نہیں ہوتا۔ لوگ اپنی نیکیوں پر شک میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے۔ بابا جی اشفاق احمد فرمایا کرتے تھے کہ "عین ممکن ہے کہ وائی بی جی کرنے والا ہو سکتا ہے بابا ہو۔" بہت سادہ لوگوں میں یقین ہوتا ہے۔ وہ اپنے یقین اور ایمان پر مر مٹیں گے۔ اس نقطے سے آغاز کیجیے کہ اس چھوٹے سے قدم کو جس سے آپ اپنا سفر شروع کر رہے ہیں، چھوٹا نہیں ہے۔

معیار بہتر کیجیے

آپ کام کرنا شروع کیجیے۔ بے شک آپ لائق ہیں یا نالائق ہیں، لیکن کام کے ساتھ ساتھ آپ اپنے معیار کو بہتر بناتے جائیے۔ اگر آپ اپنے معیار کو بہتر نہیں کرتے، یعنی آپ لائق انسان نہیں بنتے تو پھر آپ کا حلقہ احباب بہت کم رہے گا۔ اگر ایک شخص اسکول ٹیچر بنتا ہے اور جب اسکول جا کر دیکھتا ہے کہ وہاں تو در و دیوار نہیں ہیں، وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ زندگی کے تیس سال وہ ایک گاؤں کے بچوں کو ایک درخت کے نیچے پڑھاتے پڑھاتے ایک دن فوت ہو جاتا ہے۔ کتنا بڑا انسان ہے!

نہیں... یہ کہانی بہت چھوٹی ہے۔ اور ایک شخص ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنی ہر چیز بیچ کر علی گڑھ یونیورسٹی بنا دیتا ہے۔ یہ بہت بڑی کہانی ہے۔

جس کا کینوس بڑا ہوگا، وہ اپنے اثرات زیادہ چھوڑے گا؛ جس کا کینوس چھوٹا ہوگا، اس کا حلقہ چھوٹا ہوگا۔ آپ اپنی خدمات کا معیار ابھی سے بہتر کرنا شروع کر دیجیے۔ یہ اس لیے کہ کہیں بعد میں جا کر حوصلہ نہ رہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ میں امیر ہو کر بانٹوں گا۔ جب وہ امیر ہوتا ہے تو حوصلہ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ بچپن سے مثبت مزاج بنائیے۔ جوانی کی عمر سے اپنے اندر پودا لگائیے۔ اس بات کی پروا نہ کیجیے کہ آپ کی عمر ابھی کیا ہے۔ بس، آج سے شروع کر دیجیے۔

اگر آپ ابھی سے کام شروع کر گئے تو دس سال بعد آپ کہیں گے کہ قاسم صاحب، ہمیں پتا ہی نہیں لگا کہ ہوا کیا ہے۔ لیکن سب کچھ ہی ہو گیا۔ اس آدمی کا شکریہ ادا کیجیے جس نے آپ کو زیرو سے ہیرو بنا دیا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ کی سوچ اتنی پست ہو کہ شکریہ کے الفاظ بھی نہ ہوں، آپ کے پاس فاتحہ بھی نہ ہو، ایک عرضی بھی نہ ہو کہ مالک یہ وہ بندہ ہے جو نہیں تھا، پھر بھی تھا۔ تیرا کتنا انعام تھا کہ اس کی سوچ کو تو نے اتنی قوت دی کہ ایک زمانے کو فائدہ دے رہا ہے۔

جب آپ واضح ہوتے ہیں تو پھر آپ جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب آپ واضح ہی نہیں ہوتے تو پھر آپ کنفیوژ جواب دیتے ہیں۔ آپ لڑ پڑتے ہیں۔ اپنی خدمات ابھی سے دینی شروع کیجیے اور معیار بہتر کرتے جائیے۔ ایک وقت وہ آئے گا کہ آپ جیسا کوئی نہیں ہوگا۔ آپ مثال ہوں گے۔

پیدائشی قدرتی صلاحیتیں

ایک تحقیق کے مطابق شخصیت کی تیرہ اقسام ہیں۔ یہ تمام اقسام پروفیشن کے حوالے سے ہیں۔ آپ کبھی ایڈیسن کی زندگی کو پڑھیں، بچپن سے ہی اس کے اندر جذبہ اور جنون بہت زیادہ تھا۔ اس کی ماں کیلئے سب سے بڑا یہ مسئلہ تھا کہ ایڈیسن کو گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی دفعہ اس کو اکیلا چھوڑا تو وہ مرغیوں کے ڈربے میں جا کر انڈوں پر بیٹھ کر یہ تجربہ کرنے لگتا تھا کہ اگر مرغی کے انڈوں پر بیٹھنے سے چوزے نکل آتے ہیں تو پھر ایڈیسن کے بیٹھنے سے کیا نکلے گا۔

جو صلاحیت، جو جذبہ، جو جنون قدرت نے آپ کے اندر ڈالا ہے، اگر اسے کھنگالا اور دریافت نہ کیا جائے تو وہ ایک چبھن بن جاتا ہے۔ جذبے اور جنون کے سامنے رکاوٹیں نہیں آسکتیں۔ صلاحیتیں کبھی تنقید کو نہیں مانتیں۔ اور اگر آپ اپنے ساتھ سچے ہیں تو یقین کیجیے کہ

آپ اتنے بہادر ہوں گے کہ آپ کہہ دیں گے کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، مجھے تو وہ کام کرنا ہی ہے جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ اصل کام ہے، اس کام کو دریافت کرنا۔

ہم میں سے اکثر کو خاصی عمر گزارنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ میں جو کام کر رہا ہوں، وہ کام تو میرا ہے ہی نہیں۔ چنانچہ ہم بددلی سے کام کرتے ہیں۔ جو کام آپ کرتے ہیں، اگر اسے دل لگی اور دلچسپی سے نہیں کر پا رہے ہیں تو اسے چھوڑ دینا ہی آپ کیلئے بہتر ہے۔ لیکن یہ بددلی والا کام چھوڑ کر وہ کام ضرور کیجیے کہ جس میں پھر کوئی آپ جیسا دوسرا نہ ہو۔

قیصر عباس صاحب کہتے ہیں، ہمارے نوجوانوں میں دو بیماریاں ہیں جنھوں نے ان کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ایک ناامیدی، دوسرا ویژن کے ساتھ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی نہ کرنا۔ نوجوان یہ پلاننگ نہیں کرتے کہ آج ہم یہاں ہیں تو دس سال بعد مجھے کہاں ہونا ہے۔ وہ کہتے ہیں، بس یہ مہینہ گزر جائے، پھر دیکھا جائے گا۔ گزارے والی سوچ کبھی بڑے انسان کی سوچ نہیں ہوتی۔ خوش قسمت انسان وہ ہے جو اپنی آسانیاں، اپنی کمائی سے دوسروں کو دے سکے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' آپ ہر شعبے میں اوپر والا ہاتھ بن جایئے۔ اگر یہ کر گئے تو دیں گے، لیکن یہ نہیں ہوا تو کہاں سے دو گے؟ جب آپ کے پاس کچھ نہیں ہوگا تو آپ دوسروں کو کیسے دیں گے؟

اپنا کاروبار

جب بھی کوئی ملک مشکل حالات سے گزر رہا ہوتا ہے تو اس کا ہر شعبہ مشکل حالات میں ہوتا ہے۔ آج ہمارا ملک دہشت گردی کی جنگ کا سامنا کر رہا ہے، معاشی مشکلات کا سامنا کر رہا ہے۔ اسی طرح، اور بہت سے دوسرے معاملات میں مشکلات کا سامنا کر رہا ہے۔ جب ایسی صورت حال ہوتی ہے تو پھر ملک میں نوکریاں ملنی کم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں بے شمار ادارے ایسے ہیں جو دوسرے ملکوں سے خدمات لیتے ہیں، کیونکہ اس شعبے کے متعلق انھیں یہاں سے افرادِ کار ہی نہیں ملتے۔ باوجود اس کے کہ ہمارے ملک میں ٹیلنٹ

کی کمی نہیں، کام کرنے والوں کا قحط ہے۔ اس کی ایک ہی وجہ نظر آتی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے پاس سمت نہیں ہے۔ اسی کی دہائی میں گریجویشن یا ماسٹر کرنے کے بعد جب طالب علم مارکیٹ میں جاتا تھا تو اسے چار چار نوکریاں ملتی تھیں، جبکہ آج ایسا نہیں ہے۔ آج جو جہاں لگا ہوا ہے، وہ کام بھی کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ رو بھی رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کی نوکری وہ چاہ رہا تھا، اس طرح کی ملازمت ملی نہیں۔

کچھ لوگ ذہین ہوتے ہیں وہ ان باتوں کو بہت جلد سمجھ جاتے ہیں۔ پھر وہ نوکری کرنے کا نہیں سوچتے، بلکہ نوکریاں دینے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اگر آپ کا کام آپ کو فرسٹریشن دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے، آپ نے غلط کام کا انتخاب کیا ہے۔ صحیح کام، صحیح فرد... اچھی قسمت، صحیح کام، غلط فرد... بری قسمت۔ زندگی میں صحیح فرد کا صحیح جگہ پر ہونا ہی کامیابی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہادر بنایا ہے، آپ میں قوت ارادی ہے اور آپ میں اضطراب ہے تو پھر آپ اپنے آپ کو نوکری تک محدود نہ کیجیے۔ بڑا سوچیے۔

ایک ہے، غلامی؛ اور ایک ہے، آزادی۔ جو آدمی آزادی چاہتا ہے، وہ کہے گا کہ میں بڑی نوکری کی بجائے اپنا چھوٹا سا کام کیوں نہ کروں، کیونکہ یہ میری ملکیت ہوگی۔ میں اپنے آپ کو جواب دہ ہوں گا، کسی دوسرے کو نہیں ہوں گا۔

دنیا کے ہر کاروبار میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے... اور وہ ہے، کامیابی کی کہانی۔ یہ آپ پر ہے کہ آپ دوران تعلیم یہ طے کرتے ہیں کہ مجھے کہانی بننا ہے یا نوکری کرنی ہے۔

یہ بھی سمجھ لیجیے کہ کامیاب کاروبار کیلئے اعلیٰ تعلیم ضروری نہیں ہے۔ دنیا میں نوے فیصد کاروباری حضرات نے کبھی کاروبار کو پڑھا ہی نہیں تھا، پھر بھی وہ کامیاب ہوگئے۔ کاروبار میں کامیابی کیلئے جو مہارتیں درکار ہیں، وہ تعلیم اداروں میں فراہم نہیں کی جاتیں۔ تعلیمی اداروں میں جو اساتذہ کرام کاروبار کے متعلق مضامین پڑھاتے ہیں، انھوں نے خود بھی کاروبار نہیں کیا ہوتا تو پھر طالب علم اس کو کیسے پڑھ کر کاروبار کرے گا۔

تو پھر، کاروبار کیلئے کیا ضروری ہے؟

سب سے پہلی چیز... آپ کے اندر ایک بے چینی اور بے تابی ہو کہ مجھے نوکری نہیں کرنی۔ مجھے اپنا کام کرنا ہے۔ یہ اگر نہیں ہے تو پھر آپ لاکھ کاروبار کے متعلق مضامین پڑھ لیں، آپ کاروبار نہیں کر سکیں گے۔ جو آدمی طبیعت کا بادشاہ ہے، وہ نوکری نہیں کر سکتا۔ بہت سے لوگ طبیعت کے لحاظ سے بادشاہ ہوتے ہیں، مگر انھیں اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ انھوں نے فقیروں والا لبادہ اوڑھ رکھا ہوتا ہے۔ انھیں اپنی قابلیت کا پتا نہیں ہوتا۔ ایڈیسن کہتا ہے کہ "اگر انسان کو اپنی قابلیت کا پتا ہو تو وہ غلامی برداشت نہیں کر سکتا۔" اور غلامی کا نام ہے، نوکری!

جب آپ کبھی زندگی کے متعلق باتیں سن رہے ہوتے ہیں تو اسی لمحے کوئی بات دل میں بیٹھ جاتی ہے اور زندگی کا رُخ مڑ جاتا ہے۔ آپ اپنے اندر قوتِ ارادی پیدا کیجیے کہ مجھے نوکری کرنی نہیں ہے، نوکریاں دینی ہیں۔ اور اس کیلئے ایک کامیاب مالک بننا ہے۔ جو کوئی آگے جانے کا سوچتا ہے، اگر وہ محنتی ہے اور اُس میں قوت ارادی ہے تو پھر اس کیلئے قدرت بھی راستے بنانا شروع کر دیتی ہے۔ حدیث نبوی ﷺ کا مفہوم ہے کہ "رزق کے نو حصے کاروبار میں ہیں۔"

اس نقطے پر غور کیجیے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ یہ اپروچ تب ہی ہوگی کہ جب آپ اوپر والا ہاتھ بننے کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ کے پاس اوپر والا ہاتھ ہے تو آپ اس سے بہتر ہیں جس کا ہاتھ نیچے ہے۔

دنیا میں جتنے بھی کامیاب کاروباری لوگ ہیں، ان میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے۔ یہ لوگ پیسے کیلئے نہیں کام کرتے۔ یہ آزادی کیلئے کام کرتے ہیں۔ آگے بڑھنے میں تعلیم بہت بڑی معاونت ہے، لیکن تعلیم بسا اوقات آگے بڑھنے کے حوالے سے رکاوٹ بن جاتی ہے۔ وہ سوچ کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ ہم صرف وہی سنتے، دیکھتے اور سمجھتے ہیں جو دیکھنا، سننا اور سمجھنا

ہمارا نصاب سکھاتا ہے۔ ہم وہی چاہتے ہیں، جو ہمیں پڑھایا جاتا ہے۔

کاروبار کرنا چاہتے ہیں اور آپ کے پاس اس کا تجربہ اور معلومات نہیں تو ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ کاروباری لوگوں سے ملیں۔ جب آپ کا رابطہ کاروباری حضرات سے ہوگا تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہم نے بھی کبھی اپنا آغاز زیرو سے کیا تو آپ کا ذہن کھلے گا۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں، ''جب کبھی بھی اللہ تعالٰی سے مانگنا ہے تو تھوڑا نہیں مانگنا، کیونکہ ہماری اوقات تھوڑی ہوسکتی ہے، اللہ تعالٰی کی شان اس سے بہت بڑی ہے۔'' ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی سوچ کو تالا لگا دیتے ہیں کہ ہمیں کیسے مل سکتا ہے۔ اس لیے ہم مانگتے ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اُس ذات پر یقین نہیں ہوتا۔

معاشی آسانی کے بعد اللہ تعالٰی آپ کو سمجھ اور عقل بھی دے دے تو پھر آپ خوش قسمت ترین انسان ہیں۔ اگر آپ امیر ہونے کے باوجود عقل وخرد والے ہیں تو پھر زمانہ آپ کے پیچھے چلے گا۔ بڑا کام یہ ہے کہ تھوڑا ہو، مگر اپنا ہو۔ آپ مارکیٹ میں جائیں اور وہاں جاکر سروے کیجیے اور دیکھیے کہ کہاں کہاں خلا ہے۔ کام تو سب کو کرنا ہے تو بہتر ہے کہ آپ اپنے لیے کریں۔ باکسر محمد علی کلے مرحوم نے اپنے حریف کو ایک مکا مارا اور مقابلہ جیت گیا۔ اس زمانے میں اسے پچاس ہزار ڈالر انعام ملا۔ ایک صحافی نے اس سے پوچھا، آپ نے کیا زبردست سودا کیا کہ صرف ایک مکے کے بدلے پچاس ہزار ڈالر؟ کلے نے جواب دیا، ''یہ ایک پنچ (مکا) کو بنانے کیلیے مجھے اکیس سال پریکٹس کرنی پڑی ہے۔'' اگر آپ کا ذہن صرف نوکری کے بارے میں ہی سوچ رہا ہے تو پھر آپ لاکھ لیکچر لے لیں، کتابیں پڑھ لیں، اس کا کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ کی سوچ یہ ہے کہ مجھے اپنا کام کرنا ہے تو پھر یقین کیجیے، آنے والا زمانہ آپ کا ہوگا۔



مقصد

''زندگی کا مقصد، بامقصد زندگی ہے!''

روبرٹ برن

زندگی کا مقصد

سب سے زیادہ پوچھا جانے والا سوال ہے، ''انسان کا مقصد کیا ہے؟'' انسان ہمیشہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ اس دنیا میں کیوں آیا اور کیا کام ہے جسے وہ مکمل کرنے آیا ہے۔ جب بھی یہ سوال انسان نے سچے دل سے اٹھایا، اسے جواب بھی ضرور ملا۔ ابھی تک کے تمام دانشور، علمائے کرام، تمام فہم وفراست والے لوگ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کا مقصد دراصل اپنی ذات کی بہتری کرتے ہوئے انسانیت کیلئے اپنے وقت، اپنے وسائل، اپنی انرجی اور اپنی ذات کے ذریعے بہترین نتائج دینا ہے۔ دوسروں کی زندگی میں فرق لانا، اصل ہے۔ اگر ایک انسان اس دنیا میں آیا اور اس کی زندگی سے دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو وہ زندہ نہیں رہا۔

ہمارا ہمیشہ یہ سوال ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی جانتا ہے یا نہیں۔ ہم یہ سوال کیوں نہیں اٹھاتے کہ کیا ہم خود کو جانتے ہیں یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی کی سب سے بڑی دریافت ہماری اپنی ذات کی دریافت ہے۔ اگر ہم خود کو دریافت کرتے ہیں تو ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم ہیں کون، ہم آئے کیوں، ہمارا کام کیا ہے، ہمارا کردار کیا ہے۔ یہ دنیا ہمارے بغیر ادھوری تھی لیکن ہم اپنا کردار ادا کر کے نہیں جائیں گے تو ادھوری رہے گی۔ قدرت بھی انتظار نہیں

کرتی۔ قدرت اپنا ایک بندہ بھیجتی ہے، اسے کام دیتی ہے، وہ اس کام کو کرتا ہے اور پھر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ اکثر انسان کو اس کا کام یاد کرایا جاتا ہے۔ اسے اشارے دیئے جاتے ہیں اور اگر وہ نہ سنے تو قدرت اسے اگلا موقع نہیں دیتی۔ قدرت آرام سے ایک آواز لگاتی ہے، "Next" اور وہ فرد اپنی معیاد پوری کر کے چلا جاتا ہے اور اگلا آدمی آجاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ جیسے انسان آتے ہیں، ویسے ہی انسان چلے جاتے ہیں۔ عموماً نہ ان کی ذات میں بہتری آتی ہے نہ ان کی زندگی کارآمد بنتی ہے، نہ اس دنیا پہ فرق پڑتا ہے۔ جیسے انسان آیا ویسے ہی چلا گیا۔ یاد رکھیے گا، اس زندگی سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔

مقصد کی سمجھ

ہر کوئی محمد علی جناح نہیں بن سکتا۔ قدرت بھی نہیں چاہتی کہ آپ کسی اور جیسے ہو جائیں۔ آپ کو تو بس آپ جیسا بننا ہے۔ آپ جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ آپ کی انگلیوں کے نشانات کسی دوسرے انسان سے نہیں ملتے، آپ کی شخصیت اور مزاج بھی کسی دوسرے نہیں ملتا۔ آپ کو تو بس یہ کرنا ہے کہ آپ کو اپنے شعبے میں سب سے اچھا بننا ہے۔ کچھ بنیادی اہداف ہیں، انہیں زندگی میں فوری طور پر پورا کرنے کی کوشش کیجیے۔ خوشحال انسان بنیں تاکہ محتاجی نہ ہو اور اسی کے ساتھ اندر اور باہر سے مضبوط انسان بنیں۔ اس معاشرے میں دعووں سے کام نہیں چلتا، کچھ کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ اگر آپ نوجوان ہیں تو سب سے پہلے اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کیجیے۔ ہمارے معاشرے میں یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کہ لوگ ساری زندگی لگا دیتے ہیں، مگر بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے منصوبہ بندی ہی نہیں کی ہوتی۔

جوانی کا دور سب سے بہتر ہے، مگر اسی دور کو نوجوان عیاشیوں میں ضائع کر دیتے ہیں، فیس بک فرینڈشپ میں برباد کر دیتے ہیں۔ یہ وہ بہترین دور ہے کہ جب آپ خود کو پہچان

سکتے ہیں۔ اگر آپ نے خود کو اس دور میں پہچان لیا کہ آپ کیا ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کس منفرد مقصد کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا ہے تو آپ یقین جانئے کہ اپنی زندگی کو غیر معمولی بنا سکتے ہیں۔ کچھ ہی عرصے میں آپ کی شخصیت دنیا بھر کے سامنے غیر معمولی ہو کر سامنے آسکتی ہے۔

آپ اپنے اندر کی چبھن کو کھنگالیے، پھر اسے باہر نکالیے۔ جانچئے کہ آپ زندگی میں کیا چاہتے ہیں؟ کیا بہترین کر سکتے ہیں؟ آپ کیوں اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ لوگ ڈپریشن، اسٹریس وغیرہ کی وجہ سے نہ خودکشی کرتے ہیں اور نہ فرسٹریشن کا شکار ہوتے ہیں، بلکہ جب انہیں اپنی زندگی میں اپنا کوئی مقصد نظر نہیں آتا تو وہ مقصد نہ ملنے کی وجہ سے فرسٹریشن کا شکار ہو جاتے ہیں اور نوبت خودکشی تک پہنچ جاتی ہے۔

جب آپ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد (Ultimate Purpose) پالیتے ہیں تو اگلے مرحلے پر اس مقصد کی تکمیل کیلئے مختلف وسط مدتی اہداف طے کیجیے۔

اپنے عظیم تر مقصد میں دوسروں کو بھی شامل کیجیے۔ جو انسان اپنی خوشیوں میں دوسروں کو بھی شامل کرنا شروع کر دیتا ہے، اسے زیادہ کامیابی ملنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے کام میں برکت آجاتی ہے۔ جو اپنی خوشیوں اور کامیابیوں میں دوسروں کو شامل نہیں کرتا، وہ دباؤ میں چلا جاتا ہے۔ اس کے اندر کا امن ختم ہو جاتا ہے، سکون غارت ہو جاتا ہے۔

آپ اپنے آپ کو مضبوط کرنے کی ابتدا نوجوانی ہی سے کیجیے، کیوں کہ یہ وہ دور ہے کہ جہاں سے بنیاد پڑتی ہے۔ اگر بنیاد مضبوط ہوگی تو آپ کی شخصیت بھی مضبوط ہوگی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کو چالیس سال کی عمر تک کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس وقت سے پہلے آپؒ بن رہے تھے۔ دنیا کو بعد میں پتا چلا کہ وہ کتنے بڑے انسان ہیں۔ کس کو کب مقصد کی شناسائی ہوتی ہے، اس کا تمام تر انحصار شعور سے ہے اور یہ شعور انسان کی عمر کے کسی بھی حصے میں آسکتا ہے۔

جوازِ ہستی

ایک بابا ساری زندگی بھیک مانگتا تھا کہ "اللہ کے نام پر دے دو!" اس نے اپنے ساتھ ایک ڈبا رکھا ہوا تھا جس میں وہ پیسے ڈالتا اور اسے اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔ ایک عرصہ وہ اسی طرح پیسے اس ڈبے میں رکھتا رہا۔ ایک دن سردی کی وجہ سے مر گیا۔ جب دنیا نے اس کا ڈبا کھولا تو وہ پیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہی ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ مرتے وقت پتا لگتا ہے کہ اوہو، میں نے اتنا کچھ کیا ہے، مگر اپنے اندر جھانکا نہیں۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ فرماتے ہیں، "اپنے اندر جھاتی مار۔" حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں، "تیرے اندر آپ حیاتی ہو۔" اگر تو نے اپنے اندر کی جوازِ ہستی کو پالیا تو زندہ ہو جائے گا، پھر تو مر نہیں سکے گا۔ پھر تو حضرت بابا بلھے شاہؒ کی طرح کہے گا کہ "گور پیا کوئی ہور۔" اگر تو نے جینے کا جواز تلاش نہ کیا تو پھر زندگی میں ہی مر جائے گا۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، "جو کسی مقصد کیلئے مرتے ہیں وہ مرتے نہیں ہیں۔ اور جو بغیر مقصد کے جیتے ہیں، وہ جیتے نہیں ہیں۔"

دنیا میں زیادہ تر لوگ بغیر مقصد ہی کے زندگی گزار دیتے ہیں۔ دن ہوتا ہے، رات ہوتی ہے، ہفتہ گزرتا ہے، مہینہ ہوتا ہے، سال گزرتا ہے، یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے
زندگی یوں ہی تمام ہوتی ہے

آدمی چلا جاتا ہے۔ دنیا کو کوئی فرق پڑتا۔ خوش نصیب وہ ہے جو دنیا میں آیا اور کچھ دے کر گیا۔ اگر حضور اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ تو غریبوں کے والی تھے۔ آپ ﷺ تو مسکینوں کے سر پر ہاتھ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ تو یتیموں کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے۔ آپ ﷺ تو مشکل میں پھنسوں کی مشکل آسان

کرتے تھے۔ ذرا ایک لمحے کیلئے سوچئے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ہم پڑھ لکھ کر بھی کارآمد نہیں ہیں۔ کئی ایسے بھی ہیں جن کی تعلیم زیادہ نہیں ہے، لیکن وہ معاشرے کیلئے بہت زیادہ کارآمد ہیں۔ اگر آپ وہ کام کرتے ہیں جس سے آپ کو خوشی ملتی ہے تو پھر ترقی ضرور ملے گی۔ لیکن اگر آپ وہ کام کر رہے ہیں جس کیلئے آپ پیدا نہیں ہوئے تو پھر پیسہ تو شاید مل جائے گا، لیکن خوشی اور راحت نہیں ملے گی۔

بڑے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے فیصلے کیے ہیں۔ انہوں نے دنیا کو نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنے اندر دیکھا ہے۔ کچھ ہی سال بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں عزت بھی دے دی، نام بھی دے دیا، پیسہ بھی دے دیا۔ اگر آپ شوق کے پیچھے بھاگیں گے تو پھر چیزیں پیچھے آئیں گی۔ لیکن اگر آپ چیزوں کے پیچھے بھاگیں گے تو شاید چیزیں تو مل جائیں لیکن اطمینانِ قلب نہیں ملے گا۔ کیونکہ جو مقصد اُس ذات نے آپ کے اندر ڈال کر بھیجا ہے، آپ نے وہ تلاش کیا۔ ایک پینسل آپ کے پاس ہو۔ آپ اس سے سو طرح کے کام لیں، مگر اس سے لکھنے کا کام نہ لیں تو یہ زیادتی ہے۔ اسی طرح، آپ اپنے آپ سے سارے کام لیں، مگر وہ کام نہ لیں جس کیلئے آپ کو بھیجا گیا ہے تو آپ اپنے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ حضرت قائداعظم کاروبار کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے گئے۔ کسی پارک میں کسی لیڈر کا لیکچر سنا تو اپنے اندر جھانکا۔ پھر آپ وہاں فیصلہ کیا کہ مجھے قانون کی تعلیم حاصل کرنی ہے اور برصغیر کا سب سے بہترین وکیل اور بڑا لیڈر بننا ہے۔ کاروبار کی تعلیم چھوڑ کر لنکن اِن میں داخلہ لے لیا۔ تعلیم حاصل کر کے آئے اور برصغیر کے سب سے کم عمر کامیاب وکیل بنے پھر سب سے کامیاب لیڈر بن کر ہمیں وطن دلایا۔ ایک لمحے کیلئے سوچئے، اگر آپ کاروبار کی طرف چلے جاتے تو اتنا بڑا کام جو اُن کے ذریعے ہونا تھا... ان کے ایک فیصلے نے ان کی زندگی کی تاریخ کو بدل ڈالا۔

دوسری پیدائش

ہر سچا انسان بہادر ہوتا ہے اور وہ صحیح فیصلہ کرتا ہے۔ جبکہ جھوٹا فیصلہ نہیں کر پاتا۔ وہ کنفیوژ رہتا ہے۔ اس کے فیصلے میں جرأت نہیں ہوتی۔ جس نے فیصلہ کرنا ہوتا ہے، وہ دیر نہیں لگاتا کیونکہ وہ اندر سے صاف ہوتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور یقین ہوتا ہے۔

اس جرأت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے فیصلے میں برکت ڈال دیتا ہے۔ لوگ چھ چھ دفعہ انٹری ٹیسٹ دیتے ہیں، مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ انہیں قدرت اشارے بھی دیتی ہے کہ ادھر راستہ بند ہے، کوئی اور راستہ چنو، مگر چونکہ ضد ہوتی ہے، اس لیے قدرت کے اشاروں کو سمجھنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ضدی انسان ترقی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں لچک نہیں ہوتی۔ جب لچک نہ ہو تو زندگی نہیں گزرتی۔ جس میں لچک ہوتی ہے، وہ پکارتا ہے کہ میرے مالک جو تیری مرضی ہے وہی میری مرضی ہے۔ میں تیرے فیصلوں پر راضی ہوں۔ میں آج بھی سجدہ کرتا ہوں۔ میرے مالک، میں مشکل میں ہوں، تو آسان کر دے۔

اکبر بادشاہ نے بیربل کو بلا کر کہا، کوئی ایسا جملہ کہو جو ہر لحاظ سے پورا اترے۔ وہ بولا، ''یہ وقت بھی گزر جائے گا۔'' اس نے کہا، اس فقرے کو آپ اگر غم میں کہیں گے تو خوشی مل جائے گی اور اگر آپ خوشی میں کہیں گے تو پتا چلے گا کہ یہ سچ ہے کہ خوشی نے بھی چلے جانا ہے۔

اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ میں کیوں پیدا ہوا ہوں۔ میرا آنے کا کوئی مقصد ہے۔ سقراط کے مطابق، بھیجنے والی ذات نے آپ کو بھیجنے سے پہلے کھربوں سال اپنے خیال میں رکھا ہے اور اب آپ آ گئے اور مقصد کو پائے بغیر چلے گئے تو پھر وہ جملہ صحیح ہے کہ آدمی کو مرنے سے پہلے زندہ ضرور ہو جانا چاہیے، اور زندہ کا مطلب ہے، زندگی کا جواز۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں، ''انسان کی دو پیدائشیں ہیں۔ ایک جس دن وہ پیدا

ہوتا ہے اور دوسرا جس دن وہ ڈھونڈ لیتا ہے کہ میں کیوں پیدا ہوا ہوں۔ "دوسری پیدائش زیادہ اہم ہے۔ یہ جن لوگوں کی زندگی میں آجاتی ہے، وہ کارآمد ہو جاتے ہیں۔ حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ "وہ شخص بہترین ہے جو دوسروں کیلئے فائدہ مند ہے۔" جب آپ دوسروں کیلئے فائدہ مند بن جاتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے جوازِ ہستی کو تلاش کرلیا اور اگر آپ کی زندگی آپ کے اپنے کام نہیں آرہی تو پھر سمجھ لیجیے کہ ابھی تک آپ کو زندگی کا مقصد نہیں ملا۔ جوازِ ہستی تلاش کرنے کیلئے تہجد لگائیں، روئیں، اس کے دروازے پر دستک دیں۔ آپ کو جواب ضرور ملے گا۔ ہمیں اپنی ماں پر یقین ہوتا ہے، ہمیں وقت کے وزیر اعلیٰ پر یقین ہوتا ہے مگر مالک کائنات پر یقین نہیں ہوتا۔ وہ جو کائنات کا مالک ہے، کہتا ہے کہ تم مانگو، میں دوں گا۔ کیا عجب ہے کہ میں سب پر یقین رکھوں اور مالک پر یقین نہ رکھوں۔ وہ تو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے۔ سونے سے پہلے نیت کیجیے اور صبح اٹھ کر سجدے میں سر رکھ کر اللہ تعالیٰ سے التجا ضرور کیجیے کہ اے میرے مالک، اگر تو نے مجھے ماں کے پیٹ میں پالا ہے تو مجھے اس زندگی میں یہ شعور عطا فرما کہ میں کیوں آیا ہوں۔

بڑے مقاصد

تمام امیر ہونے والے لوگ اپنی زندگی میں بڑا مقصد رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کے اہداف بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد پیسہ کبھی نہیں ہوتا۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ پیسے سے آپ کی کئی خواہشیں اور ضرورتیں جڑی ہوتی ہیں جنہیں آپ نے پورا کرنا ہوتا ہے۔ جو لوگ پیسے کو غلام نہیں سمجھتے، وہ پیسے کے غلام ہو جاتے ہیں۔ لوگوں سے پیار کرنا چاہیے۔ پیسے کو استعمال کرنا چاہیے۔ ہوتا کیا ہے کہ ہم لوگوں کو استعمال کر جاتے ہیں اور پیسے سے پیار کرتے ہیں۔ پیسہ آپ کا غلام ہے۔ آپ پیسے کے غلام نہیں۔ پیسہ اس وقت تک مفید ہے جب تک آپ اس سے اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ پیسے کو اپنے غلام کی

طرح استعمال کیجیے۔اس کی غلامی نہ کیجیے۔

زندگی میں بڑے بڑے مقصد بنایئے۔ بڑے بڑے اہداف بنایئے۔لوگوں کی زندگی میں جذبہ نہیں ہوتا، جنون نہیں ہوتا، جوش نہیں ہوتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مقصد بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔کیا اگر آپ نے لاکھ روپیہ کمانا ہو تو اس کیلئے زیادہ جوش درکار ہے اور دس ہزار کمانے کیلئے کم جوش درکار ہے۔ایک دکان دار اپنی دکان روز کھولتا اور ایک گھنٹہ بعد بند کر کے چلا جاتا۔کسی نے پوچھا کہ تم گھنٹے بعد کہاں جاتے ہو؟ وہ کہتا، مجھے جتنے پیسے چاہیے ہوتے ہیں، میں ایک گھنٹے میں کما لیتا ہوں پھر میں دکان بند کر دیتا ہوں اور سارا دن آرام کرتا ہوں۔اگر اسے کوئی بھلا مانس سمجھائے کہ پورا دن دکان چلاؤ اور جو پیسے تمہیں چاہئیں وہ استعمال میں لاؤ، جو بچ جائیں انہیں تم مستحقین میں بانٹ دو۔آپ اپنی ضرورت کے مطابق کماتے ہیں، اچھی بات ہے کہ مزید کی لالچ نہیں، لیکن دکان کی نعمت سے زیادہ کما کر اس کی اضافی آمدن اُن لوگوں پر خرچ کر دی جائے جن کے پاس کمانے کا ذریعہ نہیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہے؟ زیادہ تر سیلف میڈ ملینیئرز (Self-made millionnaires) اسی اپروچ کے ساتھ امیر ہوئے ہیں۔

زندگی میں جب آپ کسی بڑے مقصد کے پیچھے لگتے ہیں تو پیسہ ویسے ہی آپ کے پیچھے پیچھے آجاتا ہے۔یاد رکھیے، پیسہ ہمیشہ ذیلی پیداوار (By-product) ہوتا ہے۔آپ اپنی زندگی میں کوئی مقصد بنائیں، دل لگا کر ادھر کام کریں۔پیسہ خود ہی آپ کے پیچھے آنا شروع ہو جائے گا۔پیسہ ایک نتیجہ ہے آپ کی کوششوں کا۔لیکن، آپ کی محنت کا مقصد پیسہ نہیں ہونا چاہیے۔فرض کیجیے، آپ ایک استاد ہیں۔آپ بہت محنت کرتے ہیں۔جب آپ محنت کرتے ہیں تو آپ کا نام آپ کے خاص موضوع کے حوالے سے مارکیٹ میں بن جاتا ہے۔اس میں آپ پیسہ بھی کماتے ہیں، عزت بھی کماتے ہیں، تعلقات بھی بناتے ہیں، آپ کے مواقع میں بھی اضافہ ہوتا ہے، آپ کی وجہ سے لوگوں کو فائدہ بھی ہوتا ہے، آپ بھی

لوگوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے، آپ لوگوں کا علم بڑھاتے ہیں، آپ لوگوں کو کامیاب کرانے میں آسانی پیدا کرتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں آپ کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اگر آپ کی کوشش کا نتیجہ صرف پیسہ ہے تو پھر آپ ترقی نہیں کر رہے۔ اگر آپ نے کوشش کا نتیجہ لینا ہے تو پہلے منصوبہ بنایئے۔ مقاصد بنایئے۔ غور کیجیے کہ آپ نے لوگوں کو کیا فائدہ دینا ہے، خدمت کیسے کرنی ہے، نام کیسے کمانا ہے، عزت کیسے کمانی ہے، لوگوں کے دلوں میں کیسے جگہ بنانی ہے، اپنی فیلڈ میں شناخت کیسے بنانی ہے۔

اصل نام وہ نہیں ہوتا جس سے آپ کو پکارا جائے، بلکہ اصل نام وہ ہوتا ہے جو آپ کی شناخت ہوتا ہے۔ مثلاً، راحت فتح علی خان کا نام لیتے ہی فوراً ذہن میں آئے گا کہ وہ گاتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی شناخت ہے۔ طب کا ذکر ہو تو حکیم محمد سعیدؒ کا نام فوری طور پر ابھرتا ہے۔ انسانی خدمت کی بات کی جائے تو محترم عبدالستار ایدھی مرحوم کے سوا کوئی شخصیت سامنے نہیں آتی۔ ایسے لاتعداد لوگ ہیں جن کی شناخت اُن کا کام ہے۔ آج تک کسی کی شناخت اس کا پیسہ نہیں بنا۔ ایک شخص بھی تاریخ میں آپ نہیں بتا سکتے۔ لہٰذا اپنی شناخت بنایئے۔

مقصد کی تلاش

دنیا میں بہت سی چیزیں رغبت دلانے والی ہوتی ہیں جیسے ہی میٹرک کا رزلٹ آتا ہے تو والد صاحب کہتے ہیں، بیٹا تم انجینئرنگ کر لو، دیکھو فلاں کا بیٹا انجینئر بن گیا ہے۔ لڑکی کو کہا جاتا ہے کہ تم ڈاکٹر بن جاؤ، فلاں لڑکی کو دیکھو وہ ڈاکٹر بھی بن گئی ہے۔ ہمارے ہاں یہ عام رواج ہے کہ اپنی زندگی کے فیصلے کرتے ہوئے ہم حوالے باہر کی دنیا سے لیتے ہیں۔ یہ طریقہ کار سراسر غلط ہے۔ باہر کی دنیا آپ کو جواب دے ہی نہیں سکتی، کیوں کہ وہ آپ کے اندر سے واقف نہیں۔ آپ کو اپنی زندگی کا جواب ہمیشہ اپنے اندر سے تلاش کرنا ہوتا ہے۔ جب آپ باہر سے جواب لیتے ہیں تو جواب بڑا خطرناک ملتا ہے۔ ممکن ہے، آج آپ کو کوئی چیز بڑی اچھی لگ رہی ہو، مگر وقت گزرنے کے ساتھ شاید وہ آپ کیلئے بے معنی ہو جائے۔

ممکن ہے، آپ کسی کے کہنے پر ایک ٹرین میں سوار ہو جائیں اور پانچ سال بعد پتا چلے کہ یہ لائن ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے کئی گنا بہتر ہے کہ آپ اپنے اندر تلاش کیجیے اور دیکھئے کہ مجھے کس ٹرین میں سوار ہونا ہے۔ عین ممکن ہے جس ٹرین میں آپ کو سوار ہونا ہو، وہ زیادہ خوبصورت نہ ہو لیکن آپ کے اندر سے جواب آ رہا ہو کہ یہ میرے لیے بہتر ہے، اس لیے آپ اپنی ان صلاحیتوں کو تلاش کیجیے کہ جن صلاحیتوں کے بارے میں قدرت آپ کو اشارے دیتی رہتی ہے۔ ان اشاروں یا ان صلاحیتوں کو سمجھنے کیلئے رھونڈا برن کی کتاب "دی ہیرو" بہت اچھی ہے۔

''مقصد کی تلاش'' باہر کی دنیا کا سوال نہیں ہے۔ یہ داخلی دنیا کا سوال ہے۔ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہمارے ابا جی کہتے ہیں، بیٹا تم نوکری کرو، کوئی کام کرو، ہم نے تمہاری شادی بھی کرنی ہے، کب تک تم اپنی صلاحیتوں کو تلاش کرتے رہو گے۔ اگر ابھی تک آپ کو اپنی صلاحیتوں کا پتا نہیں چلا تو اس کا بہتر حل یہ ہے کہ آپ پہلے فی الحال اپنا معاش کا مسئلہ حل کریں۔ آپ کی جو ذمہ داریاں وہ ادا کریں۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ قدرت آپ کو آزادی کی حالت میں لے آئے گی۔ تب اللہ تعالیٰ کا نام لے کر وہ کام کریں جس کیلئے آپ اس دنیا میں آئے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کے اثرات

ہمارے معاشرے میں یہ شعور ہی نہیں ہے کہ میڈیا کیا غضب ڈھا رہا ہے۔ جو آپریشن میڈیا ہمارے ساتھ کر رہا ہے، کبھی ہم نے تیسرا فریق بن کے نہیں دیکھا۔ نہ ہماری سمت رہی ہے، نہ ہمارا کوئی مقصد رہا ہے۔ آپ ایک گھنٹہ بڑے غور سے ٹی وی دیکھتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے اس کا اثر رہتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے، جیسے آپ نے ایک پیپسی کا گلاس پی لیا ہے تو پھر اس کے کیمیکلز نکالنے کیلئے آپ کو دو دن پانی پینا پڑتا ہے۔ میڈیا آپ کو چوبیس گھنٹے کیلئے لاشعوری طور پر سوچنے کیلئے کوئی چیز دے دیتا ہے، خواہ وہ کوئی خبر ہی کیوں نہ ہو۔ پھر آپ

زندگی کے گھٹیا اسی مخمصے میں کھوئے رہتے ہیں۔

اسٹیفن آرکووی کی کتاب The 7 Habits of Highly Effective People ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن پاک اور بائبل کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ دنیا کی 46 زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں ایک جملہ لکھا ہوا ہے، ''دنیا کے ذہین ترین لوگ اپنی زندگی میں شعوری طور پر یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم نے کرنا کیا ہے اور ہم نے سوچنا کیا ہے۔'' جو لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ہماری منزل کیا ہے، ہم نے جانا کہاں ہے، ہم نے سوچنا کیا ہے وہ میڈیا کے اور دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں یرغمال ہوتے ہیں۔ وہ تمام ان خبروں کو پڑھنے کے عادی ہو جاتے ہیں جو کام کی نہیں ہوتیں۔ میڈیا کا فقط ایک مقصد ہے کہ خبر آپ تک پہنچ جائے، وہ خبر چاہے صحیح ہو یا غلط۔

اگر آپ کی زندگی میں پہلے سے کوئی طے شدہ مقصد ہے تو پھر آپ میڈیا کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر دیکھیں گے تو مقصد کے ساتھ دیکھیں گے۔ اگر آپ گھنٹوں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں تو اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ آپ نے کوئی مقام حیات دریافت نہیں کیا۔ حضرت واصف علی واصف ؒ فرماتے ہیں، ''بڑی منزلوں کے مسافر چھوٹے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔'' جن لوگوں کی زندگی میں کوئی مقصد ہوتا ہے، وہ کچھ کر کے جاتے ہیں۔ جن کی زندگی میں کوئی مقصد نہیں ہوتا، ان کو ہر چیز روکتی ہے۔ اشفاق صاحب ؒ فرماتے تھے، ''اگر چار بجے تمہاری فلائٹ ہے اور ساڑھے تین بجے تمہیں کتا پڑ گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم کتے کو پڑ جاؤ۔'' جس کی زندگی میں کوئی منزل ہے، اس کیلئے معاف کرنا، جان چھڑانا، تنقید کو برداشت کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔

◆ ◆ ◆

مسائل

"آدمی کی پہچان راحت میں نہیں ہوتی، اس کی قابلیت کا پتا تب چلتا ہے کہ جب وہ اپنے چیلنجز اور مخالفتوں کے وقت کھڑا رہتا ہے!"

مارٹن لوتھر کنگ

مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے، "بعض اوقات سوال ایک کا ہوتا ہے، مگر وہ کئی لوگوں کے دل میں چھپا ہوتا ہے۔ پھر جواب بھی ایک کو نہیں ملتا بلکہ کئی لوگوں کو مل جاتا ہے۔" جب بھی آپ آگے بڑھیں گے، دل تو ٹوٹے گا، مشکلات آئیں گی۔ مسئلہ اس کے ساتھ نہیں ہے جو کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا۔ اگر آپ نے اپنی زندگی میں مقاصد طے کیے ہیں تو پھر اس دنیا میں مقاصد کو پانے کیلئے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کی جان مسئلوں سے چھوٹ جائے۔

ذہین لوگ دوسروں کی کہانیوں سے اپنی زندگی کے معانی بھی نکال لیتے ہیں، جیسے بابا جی اشفاق احمد کے ڈرامے "من چلے کا سودا" میں ایک محترمہ پوچھتی ہے، "ارشاد صاحب گھر پہ ہیں؟" جواب ملتا ہے، "بالکل ہیں۔" پھر پوچھتی ہے، "کتے بھونک رہے ہیں۔" وہ جواب دیتا ہے، "دیکھو، راستے کے کتے ڈرانے کیلئے ہوتے ہیں، روکنے کیلئے نہیں ہوتے۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا خوف ہے، وہ اس کو روکتا ہے۔ جنہیں منزلوں تک پہنچنا ہوتا ہے، وہ کتوں سے نہیں ڈرتے۔" جب مسئلہ سامنے آتا ہے تو ایسے لگتا

ہے جیسے یہ بہت بڑا ہو، مگر جیسے ہی اس کا سامنا کیا جاتا ہے، وہ چھوٹا ہو جاتا ہے۔

آپ یہ دیکھیے کہ آپ واقعی مسئلوں سے لڑنے والے انسان ہیں بھی یا نہیں۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں مسئلے گھیرتے ہیں، لیکن وہ ان کا سامنا نہیں کرتے، بھاگ جاتے ہیں۔ بھاگ جانا بہت آسان ہے اور بھاگنے والا کبھی جیت نہیں سکتا۔ اصل میں آپ نے جیتنا نہیں ہوتا، آپ نے مزاج کو سیکھنا ہوتا ہے... جیتنے والے کا مزاج۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زندگی میں مشکلات کا سامنا کرنے سے ٹارگٹ نہیں ملا، مگر مزاج مل گیا۔ جو آئندہ کامیابی میں کام آنا تھا۔ عشق مجازی کرنے والا جب عشق مجازی میں ناکام ہوتا ہے تو اس کے صلے میں اسے عاشق تو نہیں ملتا، مگر کچھ عادات پیدا ہو جاتی ہیں جیسے یکسوئی اور اپنا آپ لگانا، یہی یکسوئی اور اپنا آپ لگا دینا بڑی کامیابیوں کیلئے بہت زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کیلئے پورا زور لگایئے۔ مشکلات آئیں گی، مگر آپ ان سے لڑیے۔ پھر آپ دنیا کے خوش قسمت انسان بن جائیں گے۔

مسائل کی تنظیم

زندگی مسئلوں سے بھری پڑی ہے۔ مسئلے انسان کی زندگی میں کسی نہ کسی شکل میں آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح، ہر دور کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ وقت بدلتا ہے، مسئلہ بدل جاتا ہے۔ ہمیں ان مسئلوں کو حل کرنا آنا چاہیے۔ جب ہمارا کوئی مقصد یا ٹارگٹ ہوتا ہے، ہم اس پر کام کرنے لگتے ہیں تو رکاوٹ آجاتی ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ یہ رکاوٹ ہمیں روکنے کیلئے آئی ہے، لیکن یہ ہمیں روکنے کیلئے نہیں آتی۔ اس کی وجہ سے ہمارے کام میں تھوڑی دیر ہوتی ہے، مگر کام نہیں رکتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رکاوٹیں آئیں اور دنیا کا نظام رک جائے۔ انسان ان رکاوٹوں کو توڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان مسئلوں اور رکاوٹوں سے زیادہ طاقتور ہے۔

ہم اگر پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کو دیکھیں تو ہم نے بے شمار مسئلوں کو حل کیا ہے۔ دنیا کے زیادہ تر لوگ مسئلے کا سامنا نہیں کرتے۔ بہت کم لوگ یہ جرأت رکھتے ہیں کہ اپنے مسئلوں کو حل کر سکیں۔ دیہات میں جب بھی دو خاندانوں کے درمیان کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو عام طور پر جس خاندان کی غلطی ہوتی ہے، اس خاندان کی لڑکی کی شادی دوسرے خاندان کے لڑکے سے کر دی جاتی ہے۔ اس سے ان کے درمیان رشتہ بن جاتا ہے اور یوں بہت بڑے بڑے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ تعلق مسئلے کو چھوٹا کر دیتا ہے۔ بہت سارے لوگوں کو تعلق بنانا نہیں آتا، اس لیے ان کے مسئلے بھی حل نہیں ہوتے۔

زندگی میں آنے والے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے پہلے ان مسئلوں کا وزن کیجیے۔ اس سے پتا لگتا ہے کہ مسئلہ کیا ہے اور اس کی شکل کیا ہے۔ حضرت بابا اشفاق احمد فرمایا کرتے تھے: ''جس کی فلائٹ چار بجے ہو، ساڑھے تین بجے اس کی لڑائی ہو جائے تو وہ معافی مانگ لیتا ہے، وہ لڑائی نہیں کرے گا۔'' دنیا میں اسی فیصد مسئلے حل ہو سکتے ہیں، لیکن خوف انسان کا بہت بڑا دشمن ہے۔ یہ اسے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ لیکن اگر آپ اس کا سامنا کرتے ہیں تو پھر زندگی آپ کو گلے لگاتی ہے۔ اگر اس سے پیچھے ہٹتے ہیں تو زندگی پیچھے چلی جاتی ہے۔

زیادہ مسائل کا سامنا کرنے والے لوگ

1- وہ لوگ جن کو تنظیم کرنی نہیں آتی۔ جو فرد چیزوں کو اچھا منظم کرنا نہیں جانتا، اسے زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

2- وہ لوگ جو ذمے داری قبول نہیں کرتے، زیادہ مسئلوں کے شکار ہوتے ہیں۔

3- ہر دم پریشان رہنے والوں کو زیادہ مسئلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ خطرے میں وہ انسان ہے جو کنفیوژ ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں: ''دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا... سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا!''

4۔ جن لوگوں کی سوچ منفی ہوتی ہے، انہیں زیادہ مسئلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

1979ء میں مائیکل ہارٹ نے تحقیق کی اور 100 لوگوں کی فہرست بنائی جنھوں نے سب سے زیادہ دنیا کو متاثر کیا۔ نمبر ایک پر اس نے حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک کو رکھا۔ یہ 100 عظیم لوگ وہ تھے جنہیں مسئلے حل کرنے آتے تھے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ تنگ دستی بہت ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا، تمہارے پاس کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا، میرے پاس تھوڑا سا مان ہے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اس سامان کو بازار میں بیچ کر کلہاڑی لے آؤ۔ وہ لے آئے۔ آپ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کلہاڑی میں دستہ لگایا اور فرمایا کہ اس سے لکڑیاں کاٹو اور بیچو۔ صحابی نے ایسا ہی کیا تو وہ خوش حال ہو گئے۔ اُن کا تنگ دستی کا مسئلہ حل ہو گیا۔

جو مسئلے کو حل کر لیتا ہے، اسے ذہین کہا جاتا ہے۔ ہر فرد کے مسائل مختلف ہوتے ہیں۔ اگر آپ آنے والے مسئلے کو حل کر لیتے ہیں تو پھر آپ عام انسان نہیں ہیں۔ آپ بہت خوش قسمت انسان ہیں۔

مسئلے کو ختم کرنے کا رویہ

مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بعض لوگ مثبت ہوتے ہیں اور بعض منفی ہوتے ہیں۔ مثبت لوگوں کا حلقہ بھی مثبت ہوتا ہے اور منفی لوگوں کا حلقہ منفی ہوتا ہے۔ منفی رویہ رکھنے والوں کے مسائل زندگی بھر ختم ہی نہیں ہوتے۔ بعض کو مسئلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر وہ انہیں حل کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مثبت ہوتے ہیں۔ پتا چلا کہ مسئلے ان لوگوں کے حل ہوتے ہیں جو مثبت ہوتے ہیں۔ اگر زندگی میں آپ مثبت رویہ اپناتے ہیں تو پھر آپ کے مسئلے حل ہونا شروع ہو جائیں گے۔

مسئلہ یا پریشانی تذکرہ کرنے سے بڑھتی ہے۔ خاموش رہنے سے کم ہو جاتی ہے۔ صبر کرنے سے ختم ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے خوشی میں بدل جاتی ہے۔ اگر آپ شکر گزار، صبر کرنے والے اور خاموش رہنے والے ہیں تو پھر آپ مثبت انسان ہیں۔ فرض کیجیے، ایک پانی کا گلاس ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ آدھا خالی ہے۔ یہ منفی رویہ ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں، یہ آدھا بھرا ہوا ہے۔ یہ مثبت رویہ ہے۔ دفتر میں ایک ملازم پر بہت زیادہ کام کا دباؤ ہے۔ اگر وہ دباؤ کے جواب میں کہے کہ کیا یہ سارا کام مجھ ہی کو کرنا ہے تو یہ اس کا منفی رویہ ہوگا۔ اگر وہ یہ کہے کہ یہ کون سا روز روز آتا ہے، اس سے میری ہی صلاحیت میں اضافہ ہوگا، تو یہ مثبت رویہ ہے۔ منفی رویہ منفی رویہ رکھنے والے کو نقصان پہنچاتا ہے اور مثبت رویہ مثبت رکھنے والے کو فائدہ دیتا ہے۔

مسئلے ان لوگوں کے آسانی سے حل ہوتے ہیں جو فوکس رکھتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ ایک طرف ہوتا ہے اور ہم دیکھ دوسری طرف رہے ہوتے ہیں۔ کئی مرتبہ مسئلہ فوکس کی غلطی کی وجہ سے آتا ہے یا بڑھ جاتا ہے۔ آپ ایک مشق کریں۔ اپنے دوست کی طرف دیکھ کر اس کی تعریف میں پانچ جملے کہیں۔ یہ جملے مصنوعی نہ ہوں، اس کی حقیقی خوبی ہوں۔ کیا آپ کیلئے یہ آسان ہے؟ بیشتر کیلئے نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دوسروں میں مثبت چیز تلاش ہی نہیں کرتے۔ اگر ہم مثبت تلاش کریں گے تو پھر کہنا آسان ہو جائے گا۔ یہ مثبت رویہ بن جائے گا۔ اگر ہم ساری زندگی دوسروں میں منفی ہی تلاش کریں گے تو پھر کیسے ہمارے اندر مثبت رویہ آئے گا۔ ایک اور کام ضرور کیا کریں کہ لوگوں کا دل سے شکریہ ادا کیا کریں۔

حضرت علی بن عثمان الجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں فرماتے ہیں، "برتن سے نکلے گا وہی جو اس میں ڈالا گیا ہے۔" اگر بندے میں مثبت رویہ ہوگا تو ہر کسی سے مثبت رویے سے پیش آئے گا۔ ہم زندگی میں تعریف کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ آپ سوشل

بنیں۔ آپ مثبت ہو جائیں گے۔ اسلام کے سارے ارکان مثبت کرنے کیلئے ہیں۔ قیامت کے روز کئی لوگوں کا پہاڑوں کے برابر ثواب ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے کہیں گے کہ باری تعالیٰ، ہم نے اتنی نیکیاں نہیں کیں۔ پتا چلے گا کہ انہوں نے ذرائع پیدا کیے، حق دار کو حق دلایا، مظلوم کی مدد کی۔ جب انسان دوسرے انسانوں سے دور ہو جاتا ہے تو وہ منفی ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی چیز منفی ہے اور آپ مثبت ہیں تو بہتری ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز منفی ہے اور آپ بھی منفی ہیں تو پھر بہتری نہیں ہو سکتی۔ جو شخص مسئلے کے ساتھ لڑ پڑتا ہے، وہ پہلوان بن جاتا ہے اور بھاگنے والا کبھی نہیں جیت پاتا۔

گاڑی کا سامنے والا شیشہ بڑا ہوتا ہے اور پیچھے کی طرف دیکھنے والا شیشہ چھوٹا ہوتا ہے، یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں آگے زیادہ دیکھنا ہے اور پیچھے کم متوجہ ہونا ہے۔ انسان کی زندگی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مگر ہم زندگی کے معاملات کے بارے میں اکثر پیچھے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ دنیا کے ذہین ترین لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ وہ انہی چیزوں کو دیکھتے ہیں، جن پر وہ کام کرتے ہیں۔ آپ زندگی میں اصول بنائیں کہ ان مسئلوں کو نہیں لینا جو آپ کے نہیں ہیں۔ آپ وہ غم نہ پالیں جس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ”اگر دنیا میں تمہارے آنے سے فرق نہیں پڑتا تو دنیا سے جب جاؤ گے تب بھی فرق نہیں پڑے گا۔“ اگر تمہارے دنیا میں آنے سے فرق پڑا ہے تو پھر آپ مثال بنیں تا کہ آپ کے جانے کے بعد دنیا آپ کی مثالیں دے۔

ندامت

جرم یہ ہے کہ توبہ کا خیال ہی نہ آئے، لیکن اگر یہ خیال آتا ہے کہ میں نے غلط کیا ہے اور اس پر پشیمانی اور پریشانی بھی ہو اور یہ پشیمانی اور پریشانی آپ کو توبہ تک لے جائے تو یہ احساسِ ندامت ہے۔ یہ قبول ہونے والی چیز ہے۔ غلطی کے بعد پریشانی اگر آپ کو توبہ تک

نہ نے کر جائے تو وہ ''جرم'' بن جاتی ہے۔ ہر وہ چیز جو نقصان بن جائے اور خدا سے دور کرے، وہ ہماری غلطی ہوتی ہے۔ اگر یہ نقصان اور غلطی اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے تو پھر یہ انعام ہوتا ہے۔ ایک ایسا نقصان یا پریشانی جو آپ کو تہجد پڑھنے، ہاتھ اٹھانے اور رونے پر مجبور کر دے، باعث رحمت ہے۔

جب ہمیں کوئی اہم شخصیت یاد کرتی ہے تو ہم لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ہمیں فلاں شخصیت نے یاد کیا۔ کہاں یہ مقام کہ ہم اللہ تعالیٰ کو یاد کریں اور کہاں وہ مقام کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یاد کرے۔ ہم اپنی اوقات دیکھیں اور ذرا سوچیں۔ ہم ہمیشہ جرم لے کر اس کی طرف چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اس کو چھوڑ و آگے، چلو۔ آگے زندگی پڑی ہے۔ ایک مستقبل ہے جو تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ آپ ایک کام ضرور کیجیے۔ اپنی غلطیوں کی فہرست بنائیے۔ اگر آپ نے والدین کے ساتھ گستاخی کی ہے تو ان سے معافی مانگیں اور اگر وہ حیات نہیں ہیں تو ان کی قبر پر جا کر معافی مانگیں۔ اگر کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے تو اس سے معافی مانگیں۔

زندگی میں غلطیاں انسانوں ہی سے ہوتی ہیں۔ اگر آپ نے ایک چھوٹی سی غلطی کی ہے تو اس سے تین گنا اچھائی بھی کریں۔ آپ یہ اصول بنا لیجیے۔ ایک وقت آئے گا کہ آپ سے کم غلطیاں ہوں گی اور اچھائیاں زیادہ ہونا شروع ہو جائیں گی۔



پریشانیاں، برداشت

"ہر مشکل قدرت کا ایک تحفہ ہے، کیوں کہ مشکلات کے بغیر
آپ آگے نہیں بڑھ سکتے!"

اینتھونی روبنس

پریشانی کا تجزیہ

پریشانی کی بڑی وجوہات یہ ہو سکتی ہیں:

1- معاش

انسان کا معاش اس کی پریشانی کا بڑا سبب ہے۔ مثال کے طور پر، میں نہیں کماتا تو مجھے کمانا چاہیے یا میں کم کماتا ہوں تو مجھے زیادہ کمانا چاہیے۔

2- صحت

انسان کی صحت بھی اس کی پریشانی کا سبب بنتی ہے۔ اگر صحت ٹھیک ہے تو پریشانی نہیں ہوگی، لیکن اگر صحت ٹھیک نہ ہو تو پریشانی ہوگی۔

3- پیشہ

انسان جس پیشے سے بھی منسلک ہے، اس نے جو بھی ذمے داری اٹھائی ہوئی ہے، وہ بھی پریشانی کا سبب ہے۔

4- نوکری میں آپ کا افسر

جو لوگ نوکری کرتے ہیں، اس نوکری میں ان کا آفیسر ان کیلئے اکثر پریشانی کا باعث

ہوتا ہے۔

5- تعلقات

لوگوں کے تعلقات میں پیار محبت کا نہ ہونا پریشانی کا سبب ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''اپنا گھر اگر سکونِ قلب کا ذریعہ نہیں بن رہا تو توبہ کا مقام ہے۔''

6- سسٹم/نظام

ملک کا سسٹم/نظام پریشانی کا سبب ہے۔ مثال کے طور پر، عدم تحفظ کا ہونا، انصاف کا نہ ملنا، معیاری تعلیم کا نہ ہونا، معیاری غذا کی عدم دستیابی وغیرہ۔ ایک پیدا ہونے والا بچہ جہاں پیدا ہوتا ہے، اس سسٹم کی پریشانی اسے وہاں سے مل جاتی ہے۔

7- اپنی ذات

بعض اوقات آدمی اپنے مزاج میں کمزور انسان ہوتا ہے اور یہ کمزوری اس کیلئے پریشانی کا سبب بنتی ہے۔ جب بھی آدمی اعصابی طور پر مضبوط ہو گا تو اس کی پریشانی کم ہو گی۔

8- واقعات

کبھی کبھی انسان کے ساتھ غیر متوقع برے واقعات پیش آ جاتے ہیں جو اُس کیلئے پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔

آپ اپنے اندر دیکھئے کہ آپ کی پریشانی کس کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ پریشانی کو دیکھیں کہ یہ سامنا کرنے والی ہے بھی یا نہیں، کیونکہ بعض جگہ پریشانی کا سامنا کرنے کی بجائے اسے قبول کرنا پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر چھت گرے تو بھاگ جاؤ؛ آسمان گرے تو رک جاؤ۔ کیونکہ اس میں بھاگا نہیں جا سکتا۔ زندگی میں دو طرح کے مسائل ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا سامنا کیا جا سکتا ہے، دوسری طرح کے وہ ہیں جن کا سامنا کر کے آدمی مزید

نفسیاتی بن جاتا ہے۔

پریشانیوں کا حل

نفسیاتی طور پر دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ خاموش طبع ہوتے ہیں۔ دوسری طرح کے بات چیت کرنے والے ہوتے ہیں۔ جب خاموش طبع شخص بات چیت کے دائرے میں جائے گا تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ اسی طرح، بات چیت کرنے والے کو خاموش کرا دیا جائے تو اس کیلئے پریشانی ہوگی۔ ہمیشہ اپنی نفسیات کو سمجھتے ہوئے غور کیجیے کہ میرا مزاج کیا ہے۔ قدرت نے مجھے کس مزاج کا بنایا ہے اور کس مزاج کے ساتھ مجھے پرکام کرنا ہے۔ ہر انسان کو قدرت نے مخصوص صلاحیتیں دے رکھی ہیں۔ آپ ان مخصوص صلاحیتوں کو پالش کریں، انہیں بہترین طور پر استعمال میں لائیں۔ اس سے آپ کی پریشانی کم ہوگی۔ قابلیت کا نہ ہونا پریشانی کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ لوگ کمزور صلاحیت کے ساتھ کام کرتے ہیں اور پریشانی میں چلے جاتے ہیں۔ جب آدمی کو اپنا کام آتا ہے تو اسے کم پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے کام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ پریشانی ہمیشہ اس کی زیادہ ہوتی ہے جس کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں کم ہوتی ہیں۔

ایک تحقیق کے مطابق، جو لوگ خاموش طبع ہوتے ہیں انہیں زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ بات چیت کرنے والے اپنی پریشانی کو منظم کر لیتے ہیں۔ جو شخص اپنی پریشانی کو بیان کر سکتا ہے وہ زیادہ پریشان نہیں ہوتا۔ اس لیے تھوڑی بہت بات کرنا آنا چاہیے۔ ہر شخص کی پریشانی مختلف ہوتی ہے اور اس کا اظہار بھی مختلف ہوتا ہے۔ تجربہ کیجیے کہ آپ کا اظہار کیا ہے جونہی آپ سچے اظہار سے لیتے ہیں تو پریشانی کم ہونا شروع ہو جائے گی۔

ہر انسان پریشانیوں سے بھری پڑی ہے اور ہر پریشانی کچھ نہ کچھ سکھا رہی ہوتی ہے۔ ہر پریشانی دوسری سے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر دنیا میں اندھیرا بہت تھا۔ ایک دن انسان نے

سوچا کہ میں اس اندھیرے کو ختم کروں گا۔ اس نے بلب ایجاد کر لیا۔ آپ پریشانیوں سے سیکھیں کیونکہ جو پریشانی زندگی میں ایک بار آتی ہے، ہوسکتا ہے وہ دوبارہ نہ آئے۔ اس لیے اس پریشانی سے جو سبق ملے۔ اس سے ضرور سیکھیں۔

انسان کو اس دنیا میں تین طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلا مسئلے کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ اس کو وقت نے حل کرنا ہوتا ہے۔ آپ کو صرف اس حل کا انتظار کرنا ہوتا ہے۔ دوسرا کچھ مسئلے ایسے ہوتے ہیں جن کو ہر حال میں قبول کرنا پڑتا ہے، کیونکہ آپ ان کو حل نہیں کر سکتے۔ اس میں انتظار کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس پر اپنی توانائی اور وقت خرچ کرنا حماقت ہے۔ ہمیں دیانت داری اور پوری محنت سے کام کرنے کے بعد فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ تیسری قسم کے وہ مسئلے ہوتے ہیں جو ہماری توجہ مانگتے ہیں۔ اگر ہم ان پر تھوڑی سی توجہ لگا دیں تو یہ حل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم مسئلوں کو ترتیب نہیں دیتے۔ ہم انہیں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ زندگی میں صرف مسائل ہی نہیں ہیں، زندگی میں وسائل بھی ہیں۔

پیشہ ورانہ زندگی میں پریشانیاں

پیشہ ورانہ افراد کے مسائل بہت ہوتے ہیں، لیکن جن پروفیشنلز میں قیادت (لیڈر شپ) کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ اپنے مسائل کو کم کرنے کی خوب صلاحیت رکھتے ہیں۔ اپنے پیشہ ورانہ مسائل کو کم کرنے والوں میں درج ذیل خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

1- ٹیم بنانا

آپ اپنی ٹیم بنانا سیکھیں، کیونکہ ٹیم پریشانی کو تقسیم کر دیتی ہے۔ جب آپ ٹیم نہیں بناتے تو ساری پریشانی آپ کو اکیلے ہی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ دفاتر میں کام کرنے والے لوگ تو ہوتے ہیں، مگر ان کا ہونا اور ان سے ٹیم بنا کر ان سے کام لینا دونوں میں بہت

فرق ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، "سو بھیڑوں کے لشکر کا امام اگر شیر ہے تو بھیڑ خود کو شیر سمجھے گی۔ لیکن سو شیروں کا لشکر ہو اور امامت بھیڑ کر رہی ہو تو شیر خود کو بھیڑ ہی سمجھے گا۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ لیڈر کا فن ہوتا ہے کہ وہ ٹیم بنا کر کام کرتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ فرماتے ہیں، "مجھے کھوٹے سکے چلانے آتے ہیں۔" کھوٹا سکہ وہ ہوتا ہے جو چل نہیں سکتا۔ اچھا لیڈر ایسے لوگوں سے بھی کام لینے کا گر جانتا ہے جو خود کام کرنا نہیں جانتے۔

2- پہلے سے تیاری

دنیا کے جتنے بھی موثر لوگ ہیں، وہ پہلے سے تیاری کرتے ہیں۔ پہلے سے تیاری کا سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پریشانی کم ہو جاتی ہے۔ اگر آپ پہلے سے تیار ہوتے ہیں تو آپ کی پرفارمنس بہتر ہوگی اور پریشانی بھی کم ہو جائے گی۔ اس کا آسان حل یہ کہ آپ آنے والے دن کی منصوبہ بندی کریں۔

3- منصوبہ بندی کا قائل ہونا

جس نے پریشانی کم کرنی ہے، وہ منصوبہ بندی (پلاننگ) کا قائل ہو۔ جو جتنی اچھی منصوبہ بندی کرتا ہے، وہ اتنا ہی اچھے طریقے سے اپنی پریشانی کو منظم کر لیتا ہے۔ منصوبہ بندی یہ ہوتی ہے کہ اپنے ذرائع کو، اپنے وقت کو، اپنے ٹارگٹ کی نوعیت کو دیکھنا۔ اگر آپ یہ تینوں اقدامات درست طور پر ترتیب دے لیتے ہیں تو آپ ایک اچھے منصوبہ بندی کرنے والے بن جاتے ہیں۔

4- کام کو اچھے طریقے سے منتقل کرنا

اگر آپ اپنا کام کسی دوسرے کو اچھے طریقے سے منتقل کر دیتے ہیں اور کسی کو ذمہ داری دے دیتے ہیں اور اس پر اعتماد کر سکتے ہیں تو آپ کی پریشانی منظم ہو جاتی ہے۔ کام کے منتقل کرنے کا بہترین حل یہ ہے کہ آپ ایسے لوگ تلاش کریں جن میں کام کرنے کی صلاحیت ہو۔ جب آپ کسی فرد کی صلاحیت جانچ کر اس سے کام لیتے ہیں تو آپ کی

پریشانی کم ہو جاتی ہے۔

5۔ ٹیم کی قابلیت کو بہتر کرنا

آپ اپنے اردگرد کے لوگوں کی قابلیت کو بہتر بنائیں۔ جب آپ کی ٹیم کے لوگ قابل ہونا شروع ہو جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کی پریشانی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ آپ اپنی ٹیم کو چیلنج اور ٹاسک دیجیے۔ جب آپ یہ کرتے ہیں تو پھر ٹیم میں بہتری آنا شروع ہو جاتی ہے اور نتائج بہتر سے بہتر ہونے لگتے ہیں۔

ذہنی دباؤ کی چار وجوہ

ایک تحقیق کے مطابق نوجوانوں میں ذہنی دباؤ کی چار وجوہ ہوتی ہیں:

1۔ لاعلمی

ہم اعداد و شمار کے حوالے سے لاعلم ہوتے ہیں۔ ہم جب بھی لاعلم ہوں گے، ہمارے دباؤ کا لیول زیادہ ہوگا، کیونکہ لاعلمی غیر یقینی پیدا کرتی ہے۔ اور غیر یقینی ہمیشہ دباؤ کی طرف لے کر جاتی ہے۔ فرض کیجیے آپ بزنس کر رہے ہیں اور آپ کو مارکیٹ کا پتا ہی نہیں ہے کہ اس کا دائرہ کار کیا ہے، اس کی صورت حال کیا ہے۔ یہ لاعلمی آپ کو غیر یقینی کی طرف لے جائے گی اور جیسے ہی غیر یقینی پیدا ہوگی، ساتھ ہی ذہنی دباؤ پیدا ہو جائے گا۔

2۔ شخصیت میں خلا

جب بھی شخصیت میں خلا ہوگا، یہ خلا ذہنی دباؤ بن جائے گا۔ اس خلا کی وجہ سے یہ احساس بڑھنے لگتا ہے کہ ہمیں کوئی سمجھتا نہیں ہے۔ جو آدمی اندر سے بنا ہوا ہوتا ہے، اسے یہ قلق نہیں ہوتا کہ مجھے کسی نے سمجھا ہے یا نہیں۔ اصل میں یہ گلہ ہی غلط ہے کہ مجھے کسی نے نہیں سمجھا۔ صحیح سوال یہ ہے کہ میں نے کبھی خود کو کتنا سمجھا ہے۔

3- اقدار/اخلاقیات

ہمیں شروع سے ملنا ملانا، جڑنا، محبت، اخلاص وغیرہ سکھائی نہیں جاتیں۔ یہ معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے۔ جن گھروں ہر وقت لڑائی جھگڑے رہتے ہیں ان کے بچے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ والدین کا حال بچے کا ماضی ہے۔ اگر آپ نے اپنے حال کو ٹھیک نہیں بنایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے بچے کا ماضی خراب کر دیا۔

4- شوق اور پروفیشن کا ایک نہ ہونا

ہم جو کرنا چاہتے ہیں وہ کچھ اور ہوتا ہے اور جو والدین کی خواہش ہوتی ہے وہ کچھ اور ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اگر ان کا دل رکھنے کیلئے ان کی مرضی کا کام کر بھی لیں تو دباؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ نہ کریں تو بھی دباؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا آسان سا حل یہ ہے کہ آپ اپنی جرأت کو دیکھیں۔ جب آپ کو واقعی یقین ہو تو اپنے شوق کو پروفیشن بنائیں۔ آپ کا سکون والا فیصلہ، شوق اور پروفیشن کو ایک کرنے کا فیصلہ ہے۔ خوش نصیبی یہ ہوتی ہے کہ زندگی میں آپ وہی کر رہے ہیں جس کیلئے آپ پیدا ہوئے ہیں۔ اگر آپ تلاش کرتے ہیں کہ میرا کام کیا ہے تو پھر آپ مطمئن ہو جاتے ہیں۔

انسانی نفسیات

ہم لوگ اتنا کتابوں سے نہیں سیکھتے جتنا انسانوں سے سیکھتے ہیں۔ انسان جو کام کرتا ہے، اس کے پیچھے اس کی پوری نفسیات ہوتی ہے۔ آپ ایک حرکت کرتے ہیں، اس کے پیچھے پوری نفسیات ہوتی ہے۔ انسان کی ہر حرکت، ہر انداز، کام کرنے کا طریقہ، سوچنے کا طریقہ، ان سب کے پیچھے پوری نفسیات ہوتی ہے۔ آپ اگر بات چیت میں مہارت (کمیونیکیشن اسکلز) پڑھیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ بات کے ساتھ ہاتھ ہلانے سے بات کا مطلب بدل جاتا ہے۔ آپ کی آواز کے زیر و بم سے گفتگو کا مفہوم بدل جاتا ہے۔

انسان کے ایک کام کے پیچھے بہت سی نیتیں ہوتی ہیں، کیونکہ وہ ایک ہی کام کو کئی طریقوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ہم جب بھی کچھ کرتے ہیں، بولتے ہیں، بتاتے ہیں، کوئی کام کر رہے ہوتے ہیں تو در حقیقت ہم پوری سائنس بتا رہے ہوتے ہیں۔ جو لوگ جسمانی زبان (باڈی لینگویج) کو جانتے ہیں کہ کسی بھی کام کے پیچھے کون سی ممکنات ہو سکتی ہیں اور ان ممکنات میں کون سی بالکل ٹھیک ہو سکتی ہیں، وہ اپنی پریشانیوں کو بہتر طور پر منظم کرنے کا فن بھی رکھتے ہیں۔

انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جو شعور رکھتی ہے۔ اسے اپنی زندگی گزارنے کا پتا ہے۔ اسے یہ بھی احساس ہے کہ مجھے زندگی گزارنے کے بارے میں سیکھنا ہے۔ جس طرح ایک لکڑی کو دیمک اندر ہی اندر ختم کر دیتی ہے، اسی طرح انسان کی زندگی میں جو مضبوطی والا حصہ ہوتا ہے، اسے اندر ہی اندر جو چیز کھا جاتی ہے، اسے "جھجک" کہا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوتی، اس لیے کہ نہ کسی کو اس کا پتا ہے اور نہ ہی لوگ اس کے بارے میں سوچتے ہیں۔

برداشت اور صبر پیدا کرنا

برداشت کر کے ہی برداشت پیدا کی جا سکتی ہے۔ جو انسان کسی مصیبت سے بچنا چاہتا ہے، وہ کبھی برداشت پیدا نہیں کر سکتا۔ جب آپ بار بار چیلنج کا سامنا کرتے ہیں تو برداشت کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ آپ چھوٹی سی غلطی کو معاف کرتے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ آپ بڑی غلطی کو بھی معاف کر سکتے ہیں۔ جس آدمی نے کبھی غلطی معاف نہ کی ہو، وہ برداشت نہیں کر پاتا۔ برداشت ہمیشہ اس کی ہو گی، جو خود شناس ہو گا۔ تاریخ کے جتنے بھی خود شناس گزرے ہیں، ان میں برداشت بہت زیادہ تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو پہچان لیا تھا۔ انھیں کسی کے تاثرات اور کسی کی غلطی کا اثر نہیں ہوتا

خواب انہیں پتا تھا کہ وہ بھی انسان ہے۔ برداشت اس میں ہوگی جو یہ جانتا ہے کہ کائنات کا مالک اگر مجھے برداشت کر رہا ہے تو میں بھی دوسروں کی غلطیوں کو برداشت کروں۔ زندگی گزارنے کے بارے میں جس کے تصورات فطرت کے مطابق ہوں گے، اس میں برداشت زیادہ ہوگی۔ جس کے تصورات فطرت کے خلاف ہوں گے، اس کی برداشت کم ہوگی۔ اپنے اندر برداشت کا مادہ بڑھانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ قریبی لوگوں سے وہ معاملات کہہ دیں کہ جن سے آپ میں عدم برداشت پیدا ہوتی ہے۔

لیکن ہر جگہ، ہر وقت یہ ممکن نہیں کہ آپ کے سامنے آپ کی فکر کے خلاف بات نہ کی جائے۔ اس لیے اپنے اندر برداشت پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ بنیادی انسانی وصف ہے جسے اللہ تعالیٰ بھی بہت پسند فرماتے ہیں۔ برداشت کی صلاحیت پیدا کرنے کیلئے "چھوڑنا" سیکھئے۔ یہ ایک شاندار مائنڈ سائنس ٹیکنیک ہے جسے پوری دنیا میں سکھایا جا رہا ہے۔ آپ Emotional Releasing کے تحت گوگل کر کے اس کے بارے میں مزید جان سکتے ہیں۔

غلطیوں کی اقسام

غلطیاں نظر نہیں آتیں، لیکن اندر ہی اندر کھا جاتی ہیں۔ یہ کئی طرح کی ہو سکتی ہیں:

1- مذہبی غلطیاں

دنیا میں موت کی سب سے بڑی وجہ پریشانی بتائی جاتی ہے اور پریشانی کی سب سے بڑی وجہ غلطی ہوتی ہے۔ پہلی غلطی عموماً مذہبی غلطی ہوتی ہے۔ مذہبی غلطی یہ ہے کہ میں نے روزے نہیں رکھے، میں نے گناہ کیا ہے۔ بسا اوقات وہ گناہ اتنا بڑا نہیں ہوتا جتنا بڑا اسے ایک شخص سمجھ رہا ہوتا ہے۔ فرض کیجیے، آپ نماز پڑھنے جا رہے ہیں اور راستے میں آپ نے کسی شخص کو دھکا دیا۔ جب آپ مسجد پہنچتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ نماز ہو چکی ہے۔ آپ کی نماز

چھوٹا بڑا نقصان نہیں ہے، مگر بڑا نقصان یہ ہے کہ آپ نے دس لوگوں کو دھکا دیا۔ جب ہم قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ دل دکھانا کتنا بڑا گناہ ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''بخشش کا سب سے بہترین ذریعہ استغفار ہے۔'' ہم روز کتنی غلطیاں کر دیتے ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا، اس لیے کہا جاتا ہے کہ سونے سے پہلے استغفار کیا جائے۔

2- تعلقات کی غلطیاں

غلطیوں کی دوسری قسم ہمارے تعلقات ہیں۔ جب ہم کسی کا دل دکھاتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہمیں بار بار خیال آتا ہے کہ ہم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ جب یہ خیال بار بار آتا ہے تو ہمارے اندر گناہ کا ایک احساس پیدا ہو جاتا ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ ہم اس کے مجرم ہیں۔ اسے آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کو غلطی کرتے وقت شرم نہیں آئی تو اس سے معافی مانگتے بھی شرم محسوس نہ کریں۔ آپ فوری طور پر معافی مانگ لیں۔ اگر کچھ وقت گزر گیا ہے تو جب یاد آ جائے، تھوڑی ہمت کریں۔ اس غلطی کا تذکرہ کسی سے نہ کیجیے۔ خاموشی سے معافی مانگ لیجیے۔ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ جن غلطیوں کی آپ معافی مانگ لیتے ہیں، وہ تعلقات زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں، بہ نسبت ان کے جن تعلقات میں کبھی غلطی نہ ہوئی ہو۔ ایسا تعلق خطرناک ہوتا ہے۔ اس میں منافقت کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ زندگی میں ہمیں چلنا ہوتا ہے اور چلنے کیلئے دونوں ٹانگیں آزاد ہونی چاہئیں۔ اگر یہ بندھی ہوں گی تو ہم آگے نہیں چل سکتے۔ غلطی وہ رسی ہوتی ہے جو پاؤں سے بندھی ہوتی ہے۔ ہمیں اس کو کھول کر چلنا ہوتا ہے۔

3- معاشرتی غلطی

ہم نے معاشرے کے حوالے سے کچھ ایسے انداز اپنائے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہم غلطیاں کرتے ہیں۔ جب ہمیں ان غلطیوں کے متعلق خیال آتا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ ہم

کتنا عجیب انسان تھا۔ میں نے عجیب طرح کے بال رکھے ہوئے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے شرم آنا شروع ہو جاتی ہے اور اندر ہی اندر گھٹن ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اسے ختم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ زندگی میں وہ یادیں جو لاحاصل ہیں، انہیں بھلا دیں، کیونکہ زندگی میں ہم نے آگے بڑھنا ہے۔ چلنے کیلئے ٹانگوں کا آزاد ہونا بہت ضروری ہے۔ ان ٹانگوں کو ماضی کی یادوں کی رسی سے چھڑانا ہوگا۔ جب بھی کوئی ایسا خیال آئے، اس کو فوری طور پر ختم کر دیں کیونکہ خیال قلم کی طرح ہوتا ہے۔ جب یہ چل پڑتا ہے تو پھر چلتا ہی رہتا ہے، جب تک یہ آپ کو پریشان نہ کر دے، یہ چلتا چلا جاتا ہے۔

4۔ ذاتی اصولوں کی غلطیاں

بعض اوقات اپنے ہی بنائے نام نہاد اصولوں کی وجہ سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ ہم اپنی سوچ سے دوسرے کے بارے میں رائے قائم کر لیتے ہیں۔ ہمیں دوسروں کو جانچنے کا حق کسی نے نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سا بندہ کیسا ہے۔ حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں، "خدا کو راضی کرنے سے پہلے پوچھ لینا کہ وہ ناراض بھی ہے کہ نہیں ہے۔" بعض اوقات بندہ ناراض ہی نہیں ہوتا، آپ اسے بار بار کہتے ہیں کہ مجھے معاف کر دے۔ سنجیدہ بات اگر آپ بار بار کہنا شروع کر دیں تو وہ بات مذاق بن جاتی ہے اور اپنا اثر کھو دیتی ہے۔

غلطیوں کا شکار کرنے والے لوگ

زندگی میں سب سے زیادہ خطرناک وہ لوگ ہوتے ہیں جو آپ کو غلطیوں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ کوئی بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسروں کے جملے جو آپ بار بار سنتے ہیں، وہ آپ کی غلطی بن جاتے ہیں۔ یہ بڑی خوفناک چیز ہے۔ حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں: "جس کے ساتھ دوستی ہو تو پھر اس کے ساتھ دکھ سکھ پیار بھی کرو، ورنہ تعلق ختم ہو جائے گا۔" اگر آپ

کو کوئی دباؤ میں لانا چاہتا ہے تو اس سے بچیں اور اگر آپ قدرتی طور پر زیادہ حساس ہیں تو پھر اپنے آپ کو مضبوط کریں، ورنہ ہوا بھی آپ کو گرا دے گی۔

ناامید کرنے والے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ دنیا میں سب سے بڑا چور وہ ہوتا ہے جو آپ کا خواب چوری کرے۔ ان غلطیوں کو اگر ہم کچھ نہ سمجھیں تو یہ رائی کے برابر ہوتی ہیں اور اگر کچھ سمجھیں تو یہ پہاڑ بن جاتی ہیں۔ ہمیں ان کو سمجھنا ہوتا ہے۔ ہم نے غلطی کو منظم کرنا ہوتا ہے اور اس سے باہر نکلنا ہوتا ہے۔ اس کیلئے ہمیں سیکھنا پڑے گا۔ جو چیز اپنے ساتھ چاہتے ہیں، وہ دوسروں کے ساتھ ضرور کریں۔ دوسروں کی غلطیوں کو ختم کرنے میں مدد دیں۔ حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں، ''جسے اپنے مستقبل سے اچھی امید ہے اسے خدا سے امید ہے۔'' خدا سے امید کی بڑی علامت یہ ہے کہ آپ کو ایک اچھا مستقبل نظر آتا ہے جس کا خدا سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے، اسے مستقبل نظر نہیں آتا۔

ہم لوگوں کا وہم ہوتا ہے کہ زندگی میں موقعے نہیں آتے۔ جس چیز کے آپ شکر گزار نہیں ہوتے، اس چیز کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ پہچان کے ساتھ وہ چیزیں آپ کو فائدہ نہیں دیتیں۔ کمال یہ ہوتا ہے کہ آپ کا علم، آپ کی زندگی میں آنے والے لوگ، آپ کی زندگی میں آنے والے واقعات آپ کو فائدہ دیں۔ لیکن جب پہچان ختم ہو جاتی ہے تو پھر فائدہ نہیں ملتا، کیونکہ برکت اٹھ جاتی ہے۔

غلطیوں سے سیکھنا

دنیا میں ضائع کچھ نہیں جاتا۔ آپ غلطیوں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ ایک تاجر ایک سیلز مین رکھتا ہے اور وہ لاکھوں کا نقصان کر دیتا ہے۔ اس کو پورا دھڑکا ہوتا ہے کہ میرا مالک نکال دے گا۔ مالک اسے بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھے نہیں نکالنا۔ وہ پوچھتا ہے، کیوں؟ مالک نے کہا کہ تجھے سکھانے کیلئے کہ غلطی نہیں کرنی، لاکھوں روپے لگ گئے۔ اب تو نے سیکھ لیا۔ اگر میں تجھے نکال کر دوسرا سیلز مین رکھوں گا تو کیا اسے بھی اسی طرح غلطی کر کے سیکھنے کا موقع

دوں؟

زندگی میں آپ بے شمار غلطیوں سے سیکھ کر آگے بڑھتے ہیں اور جو غلطیوں سے نہیں سیکھتا، اس کیلئے مشکل ہو جاتا ہے۔

پہلی قسم کے وہ لوگ جن کے ساتھ ہو رہا ہو اور وہ بہ ضد ہوں، وہ آگے نہیں جا سکتے۔ دوسری قسم کے وہ لوگ جنہیں پتا لگ جاتا ہے کہ وہ غلطی کر رہے ہیں، لیکن ٹھیک نہیں کر سکتے۔ وہ بھی آگے نہیں جا سکتے۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو ذہین ہوتے ہیں۔ یہ غلطی کرتے ہیں، اپنی غلطی سے سیکھتے ہیں اور پھر ٹھیک کر کے آگے نکل جاتے ہیں۔

پہلے اپنا شوق دریافت کیجیے، کیونکہ یہ کسی کی نہیں سنتا۔ وہ شوق ہی کیا جو کسی کی باتوں میں آ کر چھوڑ دیا جائے۔ وہ جنون ہی کیا جو کسی کی باتوں میں آ جائے۔ آپ دنیا کو کسی بھی طرح مطمئن نہیں کر سکتے۔ آپ کے قریبی لوگ کئی دفعہ دور ہو جاتے ہیں اور کئی دور کے لوگ قریب ہو جاتے ہیں۔ سب سے خوبصورت رشتہ نظریے کا رشتہ ہوتا ہے۔ سب سے خوبصورت رشتہ اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتا ہے۔ سب سے بہترین تعلق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں ہوتا ہے۔ سب سے بہترین دشمنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کیلئے دشمنی ہے۔

بری عادات

1- گلہ کرنا

جو گزر گیا، وہ اہم نہیں ہے؛ جو آنے والا ہے، وہ اہم ہے۔ ایک آدمی کے مزاج میں گلہ کرنا ہے۔ وہ اگر صرف دن کے دس منٹ گلہ کرتا ہے، ایک مہینے میں پانچ گھنٹے بنتے ہیں اور سال کے 60 گھنٹے بنتے ہیں، یعنی ایک سال میں تین دن صرف گلہ کر کے گزار دیتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ گلہ کرنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ آپ جتنی دیر گلہ کرتے ہیں، آپ کا وہ وقت ضائع جاتا ہے۔

2- ماضی میں رہنا

جتنے بھی لوگ ماضی میں رہتے ہیں، ان کے پاس مستقبل کیلئے کچھ نہیں ہوتا۔ جب بھی مستقبل میں کچھ ہوتا ہے، ماضی خود بہ خود ختم ہونے لگتا ہے۔ اگر آپ کی زندگی میں مقاصد ہیں تو پھر پیچھے والی زندگی خود بہ خود بھولتے جائیں گے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: "بڑی منزلوں کے مسافر چھوٹے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔"

3- اپنے علم کو کامل سمجھنا

ہمیشہ اپنے علم پہ شک کیا کیجیے، بالخصوص اس علم پر شک ضرور کیا کیجیے جسے مزید بہتر ہونا چاہیے۔ اس علم پر ضرور شک کیجیے جو آسانی اور سکون کا سبب نہیں بن رہا۔ ایسی پی ایچ ڈی پر سوال ہے جو کسی کی زندگی کو بدل ہی نہیں سکی۔ اس سے بہتر تو شاید میٹرک پاس ہے جس کے پاس کچھ کرنے کا جذبہ ہے۔ اپنے سے بہتر لوگوں میں ضرور اٹھا بیٹھا کریں۔ سیکھنے کا عمل ہمیشہ جاری رکھیے۔ ضرورت سے زیادہ خوداعتمادی وقت ضائع کراتی ہے۔ یہ مزاج بہت سے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ ایسے لوگ ضدی ہوتے ہیں۔ ضدی کیلئے زندگی مشکل ہے۔ جس میں لچک ہے، زندگی اس کیلئے مشکل نہیں ہے۔ کبھی بھی اپنے ساتھ یہ غلطی نہ کریں۔ ضد چھوڑیں۔ پھر گنجائش بنے گی۔ لچک آئے گی۔ نیا علم بھی آئے گا۔ آپ کا مزاج بھی خوش گوار ہوگا۔

4- دوسروں کے معاملات میں دلچسپی لینا

دوسروں کی زندگی کو اپنی گفتگو کا موضوع بنانا، اخلاقی طور پر گھٹیا پن کی بات ہے۔ کوشش کیجیے کہ اگر کوئی اس موضوع پر بات کر رہا ہو تو اس میں دلچسپی نہ لیں۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ آپ کہیں گے، سوری میں اس گفتگو کا حصہ نہیں بن سکتا۔ آپ اس طرح کرکے دیکھیں۔ آپ کے دوستوں کے گروپ میں اس طرح کی گفتگو ویسے ہی ختم ہو جائے گی۔

5- منفی سوچ

منفی سوچ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہم جلدی تھک جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، آج میں بیٹھا رہوں، تھکاوٹ بہت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دماغ میں جو خیالات چل رہے ہیں ہیں وہ منفی ہیں۔ جیسے ہی مثبت سوچ آتی ہے، آگے بڑھنے کا جذبہ بڑھ جاتا ہے۔ وہ تمام خیالات اور نظریات جو وقت ضائع کرتے ہیں، انہیں اپنے دماغ سے نکال دیجیے۔

پیشہ ورانہ برتاؤ

پیشہ وارانہ برتاؤ وقت کے ساتھ آتا ہے اور یہ برتاؤ ہر فرد کی مہارت نہیں۔ فرض کیجیے، آپ نوکری کر رہے ہیں۔ اگر یونیورسٹی کا بچہ انٹرن شپ کرنے آئے تو اسے پتا ہی نہیں ہے کہ آپ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت آپ جن معاملات کا سامنا کر رہے ہیں، دو سال کے بعد ان کا تناسب کم ہوگا۔

کچھ مسئلے وقتی ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض مسئلے وہ ہوتے ہیں جن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تیسرے قسم کے مسئلے وہ ہوتے ہیں جن کا آپ نے سامنا نہیں کرنا ہوتا، صرف اور صرف سمجھنا ہوتا ہے اور پھر انہیں منظم کرنا ہوتا ہے۔ چوتھا مسئلہ بھی ہوتا ہے: دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے، میں ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ میں جو ہوں، وہی رہوں گا۔ یہ منافق لوگ ہوتے ہیں۔ اگر ہمیں اس دنیا میں رہنا ہے تو ایسے لوگ ختم نہیں ہو سکتے۔ ان کے ساتھ جینا پڑے گا۔ البتہ ان سے بچنا ضروری ہے۔ ذہین انسان وہ ہے جو منفی انسان سے بچنا سیکھ جاتا ہے۔ ان مسئلوں کا سامنا تو پیغمبروں کو بھی کرنا پڑا، آپ ذہنی طور پر ان کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہیے، یہ مسائل آپ کو کہیں ہلکے اور معمولی لگیں گے۔

ہم سو فیصد آئیڈیل دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ یہ دنیا مسئلوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں کوئی دن بہت اچھا ہوتا ہے تو کوئی دن اچھا نہیں ہوتا۔ اس میں دن کا قصور نہیں ہوتا کہ فلاں

دن منحوس ہے۔ اللہ نے ہر دن بابرکت بنایا ہے۔ البتہ اس دنیا میں ہر روز نئے چیلنجز آتے رہتے ہیں۔ جو آدمی اس حقیقت کو سمجھ جاتا ہے، وہ دباؤ میں نہیں آتا۔ جو شخص اس حقیقت کو نہیں سمجھتا، وہ کہتا ہے کہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ میرے ساتھ اچھا کیا ہو رہا ہے۔ اس کی توجہ اس طرف جاتی ہے کہ میرے ساتھ برا کیا ہوا۔ جب بھی آپ برا ڈھونڈیں گے تو آپ اگلے برے کا انتظار کریں گے۔ آپ کا واسطہ برے ہی سے پڑے گا۔ لیکن آپ اگر اچھا سوچیں گے تو پھر آپ کو اچھا ملے گا۔ آپ کو تعریف کرنے والے بھی لوگ ملیں گے اور تنقید کرنے والے بھی۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ لوگوں کی تنقید کو دل میں لے کر بیٹھ رہیں اور مایوس ہو جائیں، یا دوسروں کی تعریف اور خود توصیفی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہیں۔ جب آپ یہ طے کر لیتے ہیں تو پھر زندگی آسان ہو جاتی ہے۔



رویہ اور برتاؤ

"اپنے ہر دن کا آغاز پُر سکون، شکرگزار، باصبر رویے سے کرو،
تمہارا پورا دن خوشگوار اور کامیاب گزرے گا!"

نارمن ونسنٹ پیل

برتاؤ کے اجزا

انسانی رویے کی تشکیل درج ذیل اجزا کرتے ہیں:

1 علم	2 سوچ	3 ذاتی تجربات
4 تربیت	5 رویہ	

1- علم

علم انسان کا برتاؤ (Behavior) بناتا ہے اور لاعلمی بھی برتاؤ کو بناتی ہے۔ ہمارے بنیادی برتاؤ عموماً لاعلمی سے تشکیل پاتے ہیں۔ ہماری لاعلمی ہمارے برتاؤ پیدا کرتی ہے۔ برتاؤ کو منظم کرنے کا مطلب ہے، درست علم رکھنا۔ کیونکہ صحیح علم ہوگا تو برتاؤ مثبت ہوگا۔ فرض کیجیے، ایک کونسلنگ یا کوچنگ کیس ہے۔ اس میں ایک شخص کا برتاؤ بہت خراب ہے تو دیکھا جائے گا کہ اس کا کون سا علم ایسا ہے جس کی وجہ سے اس کا برتاؤ ایسا بنا۔

2- سوچ (خود سے سوچتے رہنا)

ہم اکثر خود ہی (لاشعوری طور پر) سوچتے رہتے ہیں۔ اس لاشعوری سوچ سے بھی برتاؤ بنتا ہے۔ مثال کے طور پر، میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں کہ میری جیب کٹ جاتی ہے تو میرا ایک برتاؤ بن جائیگا اور میں اپنے ہاتھ اپنی جیب میں رکھوں گا کہ کہیں جیب کٹ نہ

جائے۔ یہ برتاؤ ظاہر کرتا ہے کہ میں زیادہ تر سوچتا ہوں کہ کہیں میرا نقصان نہ ہو جائے۔

3- ذاتی تجربات

انسان کے ذاتی تجربات اس کے برتاؤ کی تشکیل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کسی دفتر میں ایک شخص کے ساتھ اس کے افسر نے زیادتی کی۔ اس تجربے نے اس کے اندر ایک نئے برتاؤ کو جنم دیا کہ افسر اچھے نہیں ہوتے۔ ایک شخص موبائل استعمال کرتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا کہ حادثہ ہو گیا۔ اس تجربے نے اسے بتایا کہ اس طرح کی غلطی سے اس طرح کے کام ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے برتاؤ میں احتیاط آ جائے گی۔

4- تربیت

بعض برتاؤ وراثت میں ملتے ہیں۔ رواج پیسوں کا آتا ہے، لیکن اصل رواج برتاؤ کا رواج ہوتا ہے جو لڑکی اپنی ماں کے گھر سے لے کر آتی ہے۔ برتاؤ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہیں، کیونکہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں اسے قبول کرنا آسان ہوتا ہے۔ جن اخلاقیات اور اقدار پر کسی گھر کا نظام چل رہا ہوتا ہے، اس گھر کے افراد خاص کر بچوں کیلئے ان اخلاقیات کو اپنانا بہت آسان ہوتا ہے۔ ایک بارہ سال کا بچہ اپنے گھر میں ایک بوڑھے ملازم کو تھپڑ مار دیتا ہے۔ جب اس کی ماں کو پتا چلتا ہے تو اس کی ماں غصے کی وجہ سے اس کو گھر سے نکال دیتی ہے اور کہتی ہے کہ تیری کیا مجال کہ تو نے اس ملازم کو مارا۔ وہ تین دن تک اسے گھر میں نہیں آنے دیتی۔ پھر اس بچے کی خالہ سفارش کرتی ہے کہ بچہ ہے، غلطی ہو گئی، آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔ طے یہ پاتا ہے کہ یہ معافی مانگے گا تو گھر میں داخل ہوگا۔ بچہ گھر آتا ہے، ملازم سے معافی مانگتا ہے۔ بعد میں وہی بچہ سرسید احمد خاں بنتا ہے۔

لوگوں کی زندگی میں تربیت کے چھوٹے چھوٹے واقعات ان کے مزاج کو بڑا بناتے ہیں۔ ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہماری گزشتہ زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ہی نہیں ہوتا جس سے ہمارا رویہ بن سکے۔ ہر انسان کے برتاؤ سے پتا چلتا ہے کہ اس کی تربیت کیسی کی گئی ہے۔

آدمی کا برتاؤ اس کے ماں باپ، اس کے گھربار کی شرافت یا جہالت کا پتا دیتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی حدیث کا مفہوم "والدین کی طرف سے سب سے بہترین تحفہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت ہے" اسی طرف اشارہ ہے، اور یہ بہترین صدقہ جاریہ ہے۔

5- رویہ

انسانی رویہ (attitude) درج بالا چیزوں کا مرکب ہوتا ہے۔ انسانی برتاؤ اگر انسان کے ظاہری عمل یا پروڈکٹ کا نام ہے تو اس کا رویہ اس کا مخفی میکانزم ہے۔ یوں سمجھئے کہ اگر بسکٹ کی فیکٹری سے بسکٹ تیار ہو کر نکلتا ہے تو یہ پروڈکٹ "برتاؤ" ہے، جبکہ اس فیکٹری میں کام کرنے والا سسٹم جو اس فیکٹری کی مشینوں اور افراد کو مرتب اور منظم کر کے چلا رہا ہے اور بسکٹ تیار کر رہا ہے، اس کا "رویہ" ہے۔

جذباتی ذہانت

1991ء میں ڈینیل گولمین کی معرکہ آرا کتاب :Emotional Intelligence Why it can matter more than I.Q? نے انسانی نفسیات کا دھارا موڑ دیا۔ اس کتاب میں ڈینیل گولمین نے "منظم جذبات" کا تصور دیا۔ اس نے کہا کہ انسان کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کا سب سے زیادہ انحصار اس کے جذبات (Emotions) پر ہے۔ اس سے پہلے ذہانت کا پیمانہ "آئی کیو" (Intelligence Quotient) تھا، مگر نئی تھیوری کی آمد کے بعد آئی کیو کی جگہ "ای کیو" E.Q یعنی Emotional Quotient نے لے لی۔ اس نے بتایا کہ انسان کیلئے دنیا میں اس کی تعلیم اور سند سے کہیں اہم اس کی جذبات کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت ہے۔ اسے اس نے "جذباتی ذہانت" یا Emotional Intelligence کہا۔

جذباتی ذہانت کے فلسفے کے مطابق، انسان جذبات کا مرکب ہے۔ وہ ہر لمحہ کسی نہ کسی منفی یا مثبت جذبے یا احساس سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اگر آدمی کوئی کام کرتے ہوئے حقی

جذبات کا تجزیہ کر رہا ہے تو وہ یہ کام نہیں کر پائے گا یا کرے گا تو اس میں ناکامی کا امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اس کے برخلاف، ایک آدمی ایک کام کرتے ہوئے مثبت اور تعمیری جذباتی کیفیت سے سیراب ہے تو وہ کتنا ہی مشکل کام کر رہا ہو، اس کام کو بڑی دلچسپی اور خوش دلی سے کرے گا لہٰذا اس کام میں اس کی کامیابی یقینی ہے۔

گویا، منفی جذباتی کیفیت آدمی کی ساری مہارت اور پیشہ وری ضائع کر دے گی۔ اس کے برخلاف، اگر اس کے جذبات اس وقت مثبت ہیں تو مہارت چاہے اوسط درجے کی ہی ہے تب بھی وہ مثل کیس بن جائے گا۔

دنیا کے امیر ترین لوگوں پر جب تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ ان کے پاس آئی کیو سے کہیں زیادہ ای کیو ہوتی ہے۔ ای کیو کی وجہ سے وہ سارے آئی کیو والوں کو اپنا ملازم رکھ لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو نوکریاں دو اور ان سے کام لو۔

جن لوگوں میں ای کیو میں کم ہوتی ہے، ان کی ٹیم ان سے خائف ہوتی ہے۔ وہ گلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ دنیا میں خراب اور نالائق لوگوں سے کام لینا لیڈر کا کام ہے۔ لیڈر وہ ہوتا ہے جو آخری ذرّے کو ساتھ لے کر چلے اور مطلوبہ نتیجہ دے۔ لیڈر میں ای کیو بہت زیادہ ہوتی ہے۔ شاباشی، جوڑنا، ٹیم بنانا، ان کو کام دینا اور ٹیم کا خوشی سے کام کر کے نتیجہ دے دینا، ایک ایسی خاصیت ہے جسے "ای کیو" کہا جاتا ہے۔

منظم کردار یہ ہے کہ آپ کی شخصیت میں جو پہلے سے موجود ہے اس کو کیسے منظم کیا جا سکتا ہے۔ حضرت علی بن عثمان المعروف داتا گنج بخشؒ اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں فرماتے ہیں "برتن سے وہی نکلے گا جو اس میں ڈالا گیا ہے۔" منظم کردار کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہ دینا ہے جو آپ میں موجود ہے۔ جو آپ میں موجود نہیں، وہ آپ نہیں دے سکتے۔ بحیثیت مسلمان، ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت آسان ہے۔ روز ایک بڑھیا کوڑا پھینکتی ہے۔ حضور رسولِ کریم ﷺ اسے معاف فرما دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب وہ بیمار

ہونے کی وجہ سے کوڑا نہیں پھینکتی تو اس کی تیمارداری کیلئے تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ ای کیو کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

قدرت کا بنیادی اصول ہے کہ جو چیز آپ کی جیب میں نہیں ہے، وہ دے نہیں سکتے۔ جو علم آپ کے پاس نہیں ہے، وہ کیسے دیا جا سکتا ہے۔ اگر رحمت ہے تو پھر رحمت مل سکتی ہے۔ بڑھیا کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس کوڑا تھا۔ میرے پیارے رسول کریم ﷺ کے پاس رحمت تھی۔ اس مزاج نے کلمہ پڑھا دیا۔

آپ کے یقین

آپ کی زندگی کی بنیاد آپ کے نظریات پر ہے۔ دنیا میں ہر انسان کے کچھ نظریات اور تصورات ہوتے ہیں۔ انہیں خود نموئی (سیلف امپروومنٹ) کی اصطلاح میں ''یقین'' (Belief) کہتے ہیں۔ یہ یقین غلط بھی ہو سکتے ہیں اور صحیح بھی۔ تاہم، ہمارے یقینوں کے ساتھ سب سے بڑی نزاکت یہ ہے کہ ہم غلط یقین رکھتے ہوں، تب بھی ہم انہیں درست ہی سمجھتے ہیں۔ امریکن فٹبال ایسوسی ایشن کے ایک کوچ کے بقول، اگر تم سمجھتے ہو کہ تم کر سکتے ہو یا تم سمجھتے ہو کہ تم نہیں کر سکتے، دونوں ہی تمہارے تئیں درست ہیں۔

ہم سب اپنے یقینوں کے غلام ہوتے ہیں، یعنی ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہر عمل کی اصل ہمارا کوئی یقین ہوتا ہے۔ کامیاب اور ناکام لوگوں کے درمیان سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ کامیاب افراد کے یقین، حقیقت کے قریب تر ہوتے ہیں۔ وہ قوانین قدرت کے مطابق یقین رکھتے ہیں تو کامیابی اُن کے قدم چومتی ہے۔ ناکام لوگ اپنے یقین قوانین قدرت کے خلاف تیار کرتے ہیں۔ چونکہ کامیابی قوانین قدرت کے مطابق عمل کرنے سے ملتی ہے، اس لیے وہ ناکام رہتے ہیں۔

آپ اپنے یقینوں کو حقیقت کے قریب لے کر آئیں، انہیں قوانین قدرت سے ہم آہنگ کریں۔ آپ کا رویہ مثبت ہو جائے گا، آپ کا برتاؤ تعمیری ہو جائے گا۔ دنیا کے جتنے بڑے

دانشور ہیں، صوفی ہیں، بڑے دماغ والے ہیں، یہ حقیقت کی طرف گئے۔ حضرت بابا بلھے شاہ فرماتے ہیں: "وچے ای موسیٰ، وچے ای فرعون" انہیں سمجھ آ گئی تھی کہ باہر کچھ نہیں ہے، انسان کے اندر ہی سب کچھ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب مر ہی جانا ہے تو پھر لڑائی کیسی۔

اللہ تعالیٰ انسان کو کہتا ہے کہ جو تو کچھ بنا سکتا ہے، بنا لے، بعد میں تم نے مٹی ہو جانا ہے۔ ایک لمحے کیلئے سوچئے کہ سو سال پہلے آپ کا وجود ہی نہیں تھا تو سو سال بعد آپ ہوں گے؟ رہے نام اللہ کا!

اور... اللہ کے سوا، انسان کی خدمت کے سوا... انسان بے وقعت ہے۔ ہر وہ چیز جو بک سکتی ہے، آپ کی نہیں تھی، کسی کی تھی۔ آپ بیچ کر جائیں گے۔ آپ نہیں بیچیں گے تو کوئی دوسرا بیچ دے گا۔ ہر وہ محل، ہر وہ کوٹھی، ہر وہ گاڑی، ہر وہ چیز جو بک سکتی ہے وہ چھوڑ کر جانا ہے۔ اگر میں سو سال پہلے نہیں تھا اور سو سال کے بعد بھی نہیں رہوں گا تو پھر میرے جھگڑے بھی نہیں تھے اور نہ آئندہ ہوں گے۔ میں اپنی لڑائی جو آخری لڑائی سمجھ رہا ہوں، یہ آخری لڑائی نہیں ہے۔ صرف ایک حالت، ایک situation کا نام ہے۔

کائنات کی کل زندگی کھربوں سال ہے اور اس مالک نے "کن فیکون" کہہ کر اتنی بڑی کائنات بنا لی ہے۔ اس میں ایک نقطے کے برابر بھی ہماری حیثیت نہیں ہے۔ پھر چیزوں کی حفاظت کیسی۔ ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح چیزوں پر رائے بھی ایک نہیں ہو سکتی۔ کسی صوفی نے کہا، زمین اور آسمان کے درمیان کو گزوں میں تقسیم کر دو۔ اتنے گز نہیں بنیں گے جتنے مزاج بن جائیں گے۔ پھر جب آپ کسی پر فیصلہ کرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اس کی سوچ اور ہے اور میری سوچ اور ہے، میرا نظریہ اور ہے اس کا نظریہ اور ہے۔ پر مجھے اس کو بھی جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا مجھے جینے کا حق ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو چھوٹے مسئلے کو بہت بڑا بنا دیتے ہیں اور بہت سارے لوگوں میں ایسا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے مسئلے کو بھی چھوٹا کر دیتے ہیں۔ یہ سب ہماری ذات پر منحصر ہے کہ ہم

اپنے مسئلے کو کس طرح لیتے ہیں۔

سیکھنے کا رویہ

سیکھنا بہت ضروری ہے۔ سیکھے بغیر گزارہ نہیں ہے۔ جب تک ہم سیکھنے کا کلچر پیدا نہیں کر لیتے، اس وقت تک ہم زوال سے نہیں نکل سکتے اور نہ ترقی کر سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ہاں کتاب پڑھنے کا رواج نہیں ہے، موبائل اور اس کے مختلف پیکیجز رکھنے کا رواج ہے۔ ہمیں کتاب کے کلچر کو فروغ دینا ہوگا، کیونکہ کتاب کا کلچر ہی ہماری ترقی کا باعث ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری ترجیحات طے نہیں ہیں۔ اور جب تک یہ ترجیحات قومی سطح پر نہ ہوں تو وہ انفرادی سطح پر کیسے طے ہوں گی، کیونکہ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے۔ پوری دیگ میں چاولوں کا ایک دانہ پوری دیگ کا اظہار ہوتا ہے۔ جب تک علم، کتاب، سیکھنے کا رویہ ہماری ترجیحات میں نہیں آئیں گے، ہم ترقی نہیں کر سکیں گے۔ انفرادی سطح پر بھی ترقی نہیں ہوگی اور نہ قومی سطح پر ترقی ہوگی۔

چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ حاسد ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اٹھنے بیٹھنے، بولنے، چلنے میں محسوس کراتے ہیں کہ ہم حسد کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ منفی ہوتے ہیں۔ ان کے تئیں، ان کوئی قصور نہیں ہوتا۔ بس، یہ ہر چیز کو منفی لیتے ہیں۔ تیسری قسم کے وہ لوگ صرف تعریفیں ہی کرتے رہتے ہیں۔ چوتھی قسم کے افراد جو بے ضرر ہوتے ہیں۔ انھیں آپ اپنے ساتھ ملائیے۔ ہمیں پلان کرنا پڑے گا کہ کس قسم کے لوگوں کے ساتھ ہم نے اپنا میل جول رکھنا ہے۔ جن کے ساتھ ملنا ہے، پہلے اس کی تیاری کرنی ہوگی، کیونکہ جب جب ہم پہلے سے تیار نہیں ہوتے تو ہم دوسرے کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ منفیت کو ختم نہیں کیا جا سکتا، مگر اس کو بہتر طور پر منظم کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں کسی بھی شخص کے ساتھ منفی نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی ہار مان لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مشاہدہ

جن لوگوں کا مشاہدہ اچھا ہوتا ہے، زیادہ سیکھتے ہیں؛ اور جن کا مشاہدہ کم یا اچھا نہیں ہوتا، وہ زیادہ سیکھ نہیں پاتے۔ جب وہ سیکھ نہیں پاتے تو اُن کے رویے میں بھی بہتری نہیں آتی۔ یہ لوگ سیکھتے ہیں، مگر محدود سوچ اور عمل رکھتے ہیں۔ قرآن ہمیں مشاہدے کی دعوت دیتا ہے، غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے، کیونکہ اس کے فطرت عین خدائی مزاج کی عکاس ہے۔

جو آدمی علم کی کمی کا شکار ہے، وہ کسی بڑے مقام پر آنے کے باوجود اچھی کارکردگی نہیں دکھا سکتا۔ آدمی جو کام کرنے کا ماہر ہوتا ہے، وہ اس کا علم ہے۔ فرض کیجیے، ایک کثیر قومی کمپنی (ملٹی نیشنل کمپنی) کا کنٹری ہیڈ اگر ماہانہ ستر لاکھ تنخواہ لیتا ہے تو وہ صرف اور صرف اپنے ایکسپوزر کی وجہ سے لیتا ہے، کیونکہ اس کا ایکسپوزر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ کھربوں کی کمپنی کو سنبھالے ہوئے ہے۔ کمپنی کیلئے ستر لاکھ روپے دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس کے عوض کمپنی اس سے کروڑوں روپیہ کماتی ہے۔ علم، ایکسپوزر، نمو (امپروومنٹ) اور بڑے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے سے انسان میں پختگی آتی ہے۔ ہماری زندگی خود ایک بہت بڑی کتاب ہے، جہاں ہم ہر لمحہ ہر تجربے سے کچھ نیا سیکھتے ہیں۔ آپ کا اپنا علم، ایکسپوزر، تجربہ، اپنی نمو، ذہانت، جذبات... بڑا انسان بناتے ہیں۔ اگر یہ نہیں ہیں تو پھر برتاؤ کو منظم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تب دوسرے آپ کے برتاؤ کو کنٹرول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

بہتر بننے کا رویہ

انسان کی زندگی میں دو بنیادی اسباب ہیں جو انسان کو بہتری اور نمو پر مائل کرتے ہیں۔ یا تو آدمی کو اللہ تعالیٰ نے پیدائشی طور پر اتنی صلاحیتوں سے نوازا ہوتا ہے کہ وہ آگے چلا جاتا ہے یا پھر کوئی بات، کوئی لیکچر یا زندگی کا کوئی ایسا تجربہ کہ جس میں اس کا احساس جاگا ہو کہ مجھے کچھ کر کے دکھانا ہے۔

اگر ہم آج بھی انہی چیزوں سے ڈر رہے ہیں جن سے پانچ سال پہلے ڈرتے تھے تو اس کا مطلب ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں ہم میں بہتری نہیں آ رہی، ہم نے نمو نہیں پائی، کیونکہ جب بھی بہتری آتی ہے تو انسان کیلئے خوشی، غم اور دیگر چیزوں کے معانی بدل جاتے ہیں۔ زندگی میں بے شمار ایسے مواقع آتے جو ہمارے لیے چیلنج ہوتے ہیں۔ ہمیں انہی واقعات سے سیکھنا اور آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ آنے والی رکاوٹ بتاتی ہے کہ یا تو اس کے ذریعے بڑا ہوتا ہے یا چھوٹا۔ ہمارا مقابلہ رکاوٹ کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ مقابلہ ہماری ہمت و جرأت اور رکاوٹ کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر ہماری ہمت بڑی ہوگی تو ہم اس رکاوٹ کو توڑ دیں گے یا اس سے گزر جائیں گے۔ اس رکاوٹ کو توڑنا یا اس سے گزرنا ہمارا پروفائل بن جائے گا۔ پھر جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو اپنے آپ کو کہہ سکیں گے کہ میں اتنا بڑا غم برداشت کر سکتا ہوں۔ جو آدمی تنگ گلیوں سے نکل کر حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے کسی مقام پر پہنچا ہے، وہ عام انسان نہیں۔

وہ تمام رکاوٹیں جو معاشرے، گھر اور اداروں سے ملتی ہیں ان رکاوٹوں کا سامنا کرنے والا، قبول کرنے والا ترقی کر جاتا ہے۔ بعض لوگ سر پر پڑنے والے پتھروں کو رکاوٹ مان لیتے ہیں۔ وہ اپنے آگے ان کی دیوار بنانا شروع کر دیتے ہیں اور اسی کو اپنے آگے کھڑا کر لیتے ہیں۔ کچھ خوش نصیب لوگ وہ ہوتے ہیں جو سر پر پڑنے والے پتھروں کو جمع کرتے ہیں اور پل بنا کر آگے گزر جاتے ہیں۔ یہ ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ آنے والی رکاوٹ کو ہم کیسے لیتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ برتاؤ جس کا آپ کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس کا کامیابی سے تعلق نہیں ہے بلکہ آپ نے جو جواب اس برتاؤ کا دیا ہے، اس کا تعلق کامیابی سے ہے۔

دل کی بات سننے والے دوست

دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دل کا اظہار کر دیتے ہیں، دوسرے وہ ہوتے ہیں جو اظہار نہیں کر پاتے۔ جیل میں ساٹھ سے ستر فیصد مجرم وہ لوگ ہوتے ہیں جو

اپنے دل کا اظہار نہیں کر پاتے۔ ان کے اندر گھٹن ہوتی ہے۔ وہ زیادہ بات چیت نہیں کر سکتے۔ جو آدمی اظہار نہیں کر پاتا، اس کے دل کے اندر لاوا پکتا رہتا ہے اور ایک دن آتا ہے کہ وہ لاوہ باہر نکل آتا ہے۔ وہ کسی جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے اور اس کی اگلی ساری زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ ہمارا ایمان اتنا زیادہ ہو کہ ہماری باتیں صرف اللہ تعالٰی کے ساتھ ہوں۔ پھر تو کیا ہی بات ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہمارے دو چار ایسے دوست ہونے چاہئیں جن سے ہم اپنے دل کی بات کر سکیں۔ اگر آپ کے دوست نہیں ہیں تو قابل اعتبار دوست بنائیے۔ جب ہم خود قابل اعتبار ہوں گے تو قابل اعتبار لوگ ہماری زندگی میں آئیں گے۔ مشکل میں ہم جن لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں وہ لوگ ہمارے مخلص ساتھی بنتے ہیں۔

ایک تحقیق کے مطابق، جس کا رویہ مثبت ہوتا ہے اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے جو اس کے رویے کو مثبت کرتی ہے۔ ایک آدمی بہت بدکار تھا، نیک ہو گیا۔ آنکھوں میں حیا آ گئی۔ کسی نے پوچھا، تجھے کیا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا، میری زندگی میں پیر صاحب آ گئے ہیں۔ پوچھا، پیر صاحب کا کیا نام ہے؟ جواب دیا، "بیٹی۔"

بعض اوقات ہماری زندگی میں کوئی ایک تعلق ایسا آتا ہے جو ہمیں مثبت کر دیتا ہے۔ ایک سپاہی بہت ظالم تھا۔ پھر ایک دن اس کی زندگی بدل گئی۔ وہ نیک ہو گیا۔ پتا کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا جوان بیٹا فوت ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اسے ہر نوجوان اپنا ہی بیٹا لگتا تھا۔ آپ اپنا تعلق اچھا بنائیے۔ سب سے بہترین تعلق عشق رسول ﷺ ہے۔ جب ہمارا تعلق رسول ﷺ سے ہو گا تو پھر ہم ان کی سیرت کی پیروی کریں گے۔

آپ کے پاس جتنی توانائی ہے، اس کا مثبت اور بہترین استعمال کیجیے۔ اس قابل ہوں کہ بارگاہِ الٰہی میں پیش ہونے کے قابل ہو سکیں۔ حضرت قائداعظم کو لوگ کہتے تھے، آپ نے کیا کیا؟ وہ جواب دیتے، جو میں بہترین کر سکتا تھا، کر دیا، اب جب میں بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوں گا تو وہ صرف مجھے یہ کہہ دے کہ تم نے اچھا کیا جو تم نے کیا۔

آپ اپنی توانائی کو بچا کر نہ رکھیے۔ اس کا بھرپور استعمال کیجیے۔ آپ ایک ایسا خوبصورت گلدستہ بنیں کہ آپ ہر روز، ہر مہینے، ہر سال پانچ دس لوگوں کو فائدہ ضرور دے سکیں۔

خوشی اور غمی کا احساس ختم ہونا

بعض اوقات انسان کی زندگی میں خوشی اور غم کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اکثر ہوتا ہے تو یہ نفسیاتی عارضہ ہے۔ بہتر ہے، چیک کرائیں، کیونکہ نارمل انسان کبھی خوش ہوتا ہے اور کبھی غمگین ہوتا ہے۔ پرانے غم ہمیں غم نہیں لگتے۔ ہم کہتے ہیں، ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح پرانی خوشی ہمارے لیے خوشی نہیں ہوتی۔ ہم نئے غم اور نئی خوشیاں تلاش کرتے ہیں۔ یہ فطری عمل ہے، کیونکہ ہم جیسے جیسے بڑے ہورہے ہوتے ہیں، غم اور خوشی کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں اور ان کی شدت میں بھی فرق آتا ہے۔ انہیں کی وجہ سے انسان بڑا ہوتا ہے۔ خطرناک بات یہ ہے کہ پرانے غم تازہ رہیں اور نئی خوشیاں منانی نہ آتی ہوں۔ یہ کیفیت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ہم نے اپنے رویوں کو منظم نہیں کیا۔

یہ ساری چیزیں سیکھنے سے آتی ہیں۔ لیکن اگر غم اور خوشی بالکل اثر نہیں کرتیں تو پھر بہتر ہے کہ اپنے اندر کوئی نیا علم داخل کریں یا کوئی نیا فرد تلاش کریں۔ پرانے وقتوں میں بڑی آسانی ہوتی تھی۔ لوگوں کی زندگی میں بابے ہوتے تھے جو باتیں کر کے، گپیں لگا کر، اشاروں کنایوں میں کئی لوگوں کو ٹھیک کر دیتے تھے۔ اسی فیصد نفسیاتی عارضے بات کرنے سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہمارے پاس کوئی ایسا شخص نہیں ہوتا جس سے بات کی جائے۔ ہمیں کوئی قابل اعتبار ہی نہیں لگتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خود قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ جیسے جیسے زندگی گزرتی ہے، اگر زندگی گزارنے کا شعور نہیں ہوتا تو پھر زندگی رک جاتی ہے۔ اگر شعور آ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ خوش بخت ہیں۔

منفی رویے کو مثبت رویے میں کیسے تبدیل کریں؟

بعض لوگ دوسروں پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر اعتبار نہیں

کیا جا سکتا۔ بعض لوگ اپنی چیزیں دوسروں کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتے ۔ یہ سب منفی رویے کی علامات ہیں۔ سب سے مشکل کام اپنی غلطی کو ماننا اور سب سے آسان کام دوسرے کی غلطی کی نشاندہی کرنا ہے۔ سب سے پہلے آپ اپنے رویے کا تجزیہ کیجیے اور اپنے بارے میں سوچیے کہ میں بھی غلط ہو سکتا ہوں۔ رویے کی درستگی کا عمل ''جرأت'' کے اقدام سے شروع ہوتا ہے۔ جرأت یہ کہ میں بھی غلط ہو سکتا ہوں اور میرا رویہ ہو سکتا ہے کہ مثبت نہ ہو۔ دوسرا اقدام یہ ہے کہ رویے کو تبدیل کرنے کیلئے مجھے ایک نئے رویے کو اپنانا ہوگا۔ جس طرح ایک سگرٹ پینے والا جب سگرٹ کو چھوڑتا ہے تو وہ اپنے منہ میں چیونگم یا کوئی اور چیز رکھنا شروع کر لیتا ہے۔ جب آپ اپنے منفی رویے کو ختم کرنے لگیں تو دیکھیں کہ وہ کون سا مثبت رویہ ہو سکتا ہے جس کو اپنایا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ہمارا منفی رویہ کہاں سے بنا ہے۔ سب سے پہلے اس کی بنیاد تلاش کیجیے۔ مثال کے طور پر، کمرے میں بو آنی شروع ہو جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ یہ کہاں سے آرہی ہے۔ اسی طرح، رویے کے بارے میں جاننے کیلئے دیکھیں گے کہ کیا یہ رویہ میں نے کسی سے سیکھا ہے؟ کیا میرا کوئی تجربہ ایسا ہے جس کی وجہ سے میرے اندر یہ رویہ پیدا ہوا؟ میں نے کسی کے ساتھ کچھ ہوتے دیکھا تو وہاں سے مجھے رویہ ملا؟ کیونکہ حادثہ کسی کے ساتھ ہوا ہوتا ہے محتاط ہم ہو جاتے ہیں۔ گھر کے ماحول کی وجہ سے تو رویہ نہیں بن گیا؟ کیا یہ رویہ موروثی طور پر میرے اندر شامل تو نہیں ہے؟ تجزیہ کر کے اس رویے کے سامنے سوال کھڑا کریں کہ کیا یہ صحیح ہے یا نہیں۔

جب بھی اپنے رویے پر تنقید کی جاتی ہے، اسے چیلنج کیا جاتا ہے یا اس کی وجہ تلاش کی جاتی ہے تو اس کے مقابلے میں مثبت رویہ لانا آسان ہو جاتا ہے۔ ہر وہ چیز زندگی میں لانا بہت آسان ہے جس کے فوائد کا پتا ہو۔ کچھ عرصہ قبل تک ہمارے پاس اپلیکیشن والے موبائل نہیں تھے جبکہ آج لوگوں کی اکثریت اپلیکیشن والے موبائل استعمال کر رہی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے لوگوں کو ان کے فوائد کا پتا چل گیا۔ اسی طرح جو رویہ ہم نے اپنانا ہے جب تک اس رویے کے فائدے معلوم نہیں ہوں گے، کبھی بھی زندگی میں نہیں آئیں گے۔ جیسے ہی رویے کے فوائد کا پتا لگ جائے، ہم کچھ ہی عرصے میں منفی کی جگہ مثبت رویے کو اپنا لیں گے۔

رویہ بننے میں تعلیمی ادارے کا کردار

ہم جس تعلیمی ادارے میں پڑھتے ہیں، اس ادارے کی ایک اپنی ساکھ ہوتی ہے، تاریخ ہوتی ہے، پروفائل ہوتی ہے۔ جب ہم اس ادارے کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں تو حضرت علامہ اقبال بھی تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں، یہاں پر تو اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے بھی تعلیم حاصل کی ہے۔ یہاں تو پروفیسر پطرس بخاری بھی رہے ہیں۔ جب ہم پروفائل کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں انگریز، سکھ اور مقامی لوگ بھی پڑھتے رہے ہیں۔ جب آپ اس ادارے میں پڑھتے ہیں تو وہ اصل میں آپ کا پروفائل بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے آپ میں ایک اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مثبت رویہ ہے۔ اس کے علاوہ دوران تعلیم ہمارے اساتذہ اور انتظامیہ کے ساتھ کچھ معاملات ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ان معاملات کی وجہ سے ایک رویہ پیدا ہو جاتا ہے جو منفی ہو سکتا ہے۔

ہمارے ملک کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ استاد کا جو مقام ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہے۔ استاد یہ گلہ کرتا ہے کہ شاگردوں کو جو مقام انہیں دینا چاہیے، وہ نہیں دے رہے۔ لیکن دیکھا جائے تو اصل میں استاد نے خود ہی اپنا مقام نہیں بنایا۔ استاد کا احترام تو ہوتا ہے، لیکن ہمارے پاس ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنی عادات کی وجہ سے اپنا احترام نہیں کرا رہی۔ وہ شاید تنخواہ تو لے رہے ہیں، لیکن جسے دل سے احترام کہا جاتا ہے، وہ انہیں نہیں مل رہا۔ تنخواہ سے زیادہ عزت کی کمائی ہوتی ہے اور یہ کمائی کرنی پڑتی ہے۔ استاد کی شفقت، اس کی محبت اپنے لیے بہتری کا باعث تو ہوتی ہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے شاگردوں میں شفقت

اور محبت کا بیج ہوتا ہے جو مستقبل میں درخت بن کر کئی لوگوں کو چھاؤں فراہم کرتا ہے اور لاتعداد لوگ اس درخت کا پھل کھاتے ہیں۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کی دیواریں، اس کے کھیل کے میدان اس ادارے میں پڑھنے والوں کے مزاج اور رویے کی تشکیل نہیں کرتے۔ مزاج ہمیشہ اچھا استاد ہی دیتا ہے۔ انسٹیٹیوٹ آپ کو شناخت دیتا ہے۔ مثبت اساتذہ کرام سے مثبت رویہ ملتا ہے۔ رویے پر آپ لاکھ لیکچر لے لیں، جب زندگی میں رویے کی اہمیت نہیں آتی اور کسی کا مثبت رویہ نہیں ملتا۔ یوں مثبت رویے کا پودا نہیں لگے گا۔

چیزیں اتنی بھی مشکل نہیں

ایک طالب علم کلاس میں سویا ہوا ہے۔ جب وہ اٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ استاد نے بورڈ پر کچھ سوالات لکھے ہیں اور وہ کہہ رہا ہے کہ انہیں کل حل کر کے لانا ہے۔ طالب علم گھر چلا جاتا ہے۔ وہ گھر جا کر ان سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ساری رات لگا رہتا ہے۔ صبح تک وہ سارے سوال حل کر لیتا ہے۔ ان کے جواب اسے مل جاتے ہیں۔ جب کلاس روم میں جاتا ہے تو استاد کے سامنے وہ جوابات رکھ دیتا ہے۔ استاد بڑا حیران ہوتا ہے۔ وہ پوری کلاس کو بتاتا ہے کہ یہ اس نے کیسے حل کر لیے، کیونکہ میں تو کل کہہ رہا تھا کہ انہیں حل نہیں کیا جا سکتا۔ بچہ استاد کی طرف حیرانگی سے دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ استاد نے یہ کب کہا تھا۔ اسے یاد آتا ہے کہ جب استاد یہ کہہ رہا تھا کہ ان سوالوں کو حل نہیں کیا جا سکتا، تب میں کلاس میں سویا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ زندگی میں کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمارا جو رویہ چیزوں کے بارے میں بنتا ہے، وہ دراصل دوسروں کی رائے سے بنتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام بہت مشکل ہے، ناممکن ہے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی۔ اگر ہم اس وقت اپنے رویے کو مثبت کر لیں کہ چیزیں اتنی بھی مشکل نہیں ہیں تو یقین کیجیے کہ بے شمار ممکنات ہمارے لیے ممکنات بن سکتے ہیں۔

شکرگزاری

"اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور دوں گا!"

القرآن

شکرگزاری احساس کا نام ہے

شکر ایک عام انسانی اور اسلامی صفت ہے۔ ہمیں ہر حال میں شکر کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم، ہمارے ذہن میں شکرگزاری کا یہ تصور بیٹھا ہوا ہے کہ 100 دفعہ شکر الحمدللہ پڑھنا ہے یا اگر کسی نے حال پوچھا تو جواب میں شکر الحمدللہ کہنا ہے۔ لیکن، یہ شکر کی روح نہیں ہے۔

دراصل، جس کام کو ہم سمجھ لیتے ہیں، وہ کام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، ہم نے جیسے کار چلانا سیکھا ہے تو ہم اسی طرح کار چلاتے ہیں۔ ایک عورت کھال سمیت مرغی پکاتی تھی۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم کھال سمیت مرغی کیوں پکاتی ہو؟ بولی، میری ماں ایسا کرتی تھی۔ اس کی ماں سے رابطہ کیا گیا اور اس سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ اس نے کہا، میری ماں ایسا کرتی تھی۔ پھر اس کی نانی سے پوچھا گیا اور اس سے بھی یہی پوچھا گیا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا کہ میری ماں ایسا کرتی تھی۔ خوش قسمتی سے پرنانی بھی موجود تھی۔ اس سے بھی یہی سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ میری ماں ایسا ہی کرتی تھی۔ ہم بے شمار چیزیں جو دوسروں سے سیکھتے ہیں، بغیر سوچے سمجھے کرتے چلے آتے ہیں۔

شکر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہمارے ذہن میں شکرگزاری کا یہ تصور بیٹھا ہوا ہے کہ 100 دفعہ شکر الحمدللہ پڑھنا ہے یا اگر کسی نے حال پوچھا تو جواب میں شکر الحمدللہ کہنا

ہے، چاہے وہ شکر محسوس ہو یا نہ ہو۔ صرف تسبیح پڑھ لینا، جواب میں شکر کہہ لینا شکر نہیں ہے۔

آپ کا بچہ آپ سے کہے کہ میں آپ کا فرماں بردار ہوں مگر اسے اس فرماں برداری کا احساس نہ ہو تو کیا آپ اس کی بات کو اہمیت دیں گے؟ یا ہم اپنے بچے سے کہیں کہ تم بہت اچھے ہو مگر اسے ان الفاظ کا احساس نہ کرائیں تو وہ بھی محسوس نہیں کرے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم نے بچے کا اچھا ہونا، دل میں محسوس کیا، پھر بچے کو گلے لگایا اور کہا کہ تم بہت اچھے ہو۔ ثانی الذکر کا اثر زیادہ ہوگا، کیونکہ وہ احساس پر مبنی ہے۔

شکر گزاری جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جو شخص جس نعمت پر شکر کرے گا، میں اسے وہ نعمت اور زیادہ دوں گا، درحقیقت احساس کا نام ہے۔ یہ زبان سے نہیں، اپنے عمل سے ہوگا۔ احساسات عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔

ایک آدمی مال جمع کرتا ہے، بانٹتا نہیں ہے اور کہتا ہے کہ شکر ہے، شکر ہے...وہ شکر نہیں کہلائے گا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں، کنجوس انسان مال اکٹھا کرتا ہے اور استعمال کوئی اور کرتا ہے۔ ہم زندگی میں خوب مال جمع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارا ہے۔ ذرا سوچیے، کیا یہ شکر گزاری ہے؟ نہیں، یہ شکر گزاری نہیں!

شکر گزاری کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں استعمال ہو۔ جب ہمیں مال جمع کرنے کی عادت ہوگی تو پھر یہی عادت آگے نسلوں میں بھی جائے گی۔ زندگی میں اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق شکر گزار کو ملتا ہے، خوب ملتا ہے۔ شکر گزاری کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نوازشیں، جو آسانیاں، جو نعمتیں عطا کی ہیں، وہ دوسروں میں بھی بانٹنا شروع کر دیں۔

اپنے رویے سے، انداز سے، اپنے برتاؤ سے شکر گزار بنیں، کیونکہ برتاؤ (عمل) سے پتا چلتا ہے کہ بندہ کتنا شکر گزار ہے۔ مثلاً ایک برتاؤ ادب ہے۔ جو آدمی ادب نہیں کرتا وہ شکر گزار نہیں ہو سکتا۔ جو احترام سے بات نہیں کر سکتا، وہ شکر گزار نہیں ہو سکتا۔ جو اپنے رزق میں

جو حضور ﷺ کی اتباع نہیں کرتا وہ شکر گزار نہیں ہو سکتا۔ حضور اکرم ﷺ کا سچا عاشق ہے وہ تنگی میں بھی شکر کرتا ہے جیسے رسول ﷺ نے بتایا ہے۔ میرے رسول ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہما نے بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلایا ہے۔ انہوں نے زخمی حالت میں دوسروں کو پانی پلایا ہے اور خود موت کو گلے لگایا ہے۔ جبکہ ہم مال جمع کرنے کو، اس کو اپنا سمجھنے کو، تنگ دلی کو، دوسروں کی چیزیں چھیننے کو اچھا سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے مسلمان ہیں۔ معذرت کے ساتھ، یہ حالت بہت ہی ناشکری ہے۔

غیر مرئی چیزوں پر شکر

بہت ساری چیزیں ایسی موجود ہوتی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں اور نہ انہیں چھوا جا سکتا ہے مگر ہماری کامیابی اور ترقی میں ان کا بہت کردار ہوتا ہے۔ ہمیں ان چیزوں پر بھی شکر ادا کرنا چاہیے۔

1. اے اللہ! تیرا بہت بہت شکر ہے کہ تو نے مجھے سیکھنے کا شوق دیا۔ اگر تو نے مجھے سیکھنے کا شوق نہ دیا ہوتا تو میں کبھی بھی یہ علم حاصل نہ کر پاتا۔
2. اے اللہ! تو نے مجھے اگر شکر گزار بندہ نہ بنایا ہوتا تو میری زندگی میں اتنے لوگ نہ ہوتے۔ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔
3. اے میرے اللہ! جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں اگر تو ان کے دلوں میں میری محبت نہ ڈالتا تو میرے سے زیادہ تنہا انسان کوئی نہ ہوتا۔ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔
4. اے اللہ! مجھے تجھ پر یقین ہے، اس کا میں شکر ادا کرتا ہوں۔
5. اے اللہ! میں تیرا ماننے والا ہوں۔ تیری ہی عبادت کرتا ہوں۔ یہ سب تیری توفیق سے ہے۔ اس کا میں شکر ادا کرتا ہوں۔
6. اے اللہ! میں اس پر بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ کبھی میری آنکھ سے حضور اکرم ﷺ کی

محبت میں آنسو نکلے۔

7- اے اللہ، تو نے مجھے اتنی طاقت دی رکھی ہے کہ گھنٹوں کام کرنے کے باوجود بھی مجھے تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ یہ مجھ پر تیرا بہت بڑا احسان ہے۔ میں اس کا شکرادا کرتا ہوں۔

8- اے اللہ، مجھے اپنی غلطیوں پر پچھتاوا ہوتا ہے۔ اس پچھتاوے کے احساس پر میں تیرا شکرادا کرتا ہوں۔

9- اے اللہ، تو نے مجھے توفیق دی کہ میں اپنے والدین کی صحت کیلئے دعا مانگتا ہوں۔ میں اس پر تیرا شکرگزار ہوں۔

10- اے اللہ، تو نے مشکل آنے سے پہلے اس کو حل کردیا۔ میں اس کا شکرادا کرتا ہوں۔

11- اے اللہ، مجھے اچھی چیزوں کی قدر ہے۔ میں اس پر تیرا شکرادا کرتا ہوں۔

12- اے اللہ، تو نے مجھے ہمت دی کہ تیری مخلوق کی مدد کرسکوں، میں تیرا شکرگزار ہوں۔

13- اے اللہ، میں اس احساس کا شکرادا کرتا ہوں جو مجھے تیرے قریب کرتا ہے۔

14- اے اللہ، مجھے آگے بڑھنے کا شوق ہے، میں اس کا شکرادا کرتا ہوں۔

15- اے اللہ، تو نے مجھے خواب دیکھنے والا بنایا، میں اس پر تیرا شکرادا کرتا ہوں۔

ادھوراپن

دنیا کی سب سے بڑی زنجیر ادھوراپن ہے۔ ممکن ہے، کوئی اپاہج نہ ہو وہ پھر بھی ادھورا ہو۔ اپنے آپ کو بہادر سمجھنے کہنے والے اکثر بزدل ہوتے ہیں۔ آدمی پہاڑ کھودتا ہے اور نکلتا چوہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے اعصاب مضبوط نہیں ہوتے۔ اس کی اپروچ منفی ہوتی ہے۔ انسان اپنے قد سے بڑا نہیں ہوتا، وہ اپنی سوچ سے، اپنے آئیڈیے سے، اپنے ویژن سے بڑا ہوتا ہے۔ معروف موٹیویشنل اسپیکر نک وائے چچ (Nick Vuijic) کہتا ہے "اپاہج وہ ہے جو اچھا نہیں سوچ سکتا؛ اپاہج وہ ہے جس کی عادات اچھی نہیں ہیں؛ اپاہج وہ

ہے جو منفی سوچتا ہے؛ اپاہج وہ ہے جو زیادتی کرتا ہے؛ اپاہج وہ ہے جو دوسرے کے نقصان کے بارے میں سوچتا ہے؛ اپاہج وہ ہے جس کے پاس علم نہیں ہے؛ اپاہج وہ ہے جس کے پاس وسائل ہیں، مگر کوئی مقصد نہیں ہے؛ اپاہج وہ ہے جس کے پاس زندگی ہے لیکن جواز ہستی نہیں ہے؛ اپاہج وہ ہے جس کے پاس آنکھیں ہیں لیکن زندگی میں کوئی ویژن نہیں؛ اپاہج وہ ہے جس کے پاس ٹانگیں ہیں لیکن وہ صحیح راستے پر نہیں چل رہیں؛ اپاہج وہ ہے جس کے پاس ہاتھ اور بازو ہیں لیکن وہ ہاتھ اور بازو اس کام پر نہیں لگے ہوئے جو کام کسی کے فائدے میں ہو سکتا ہے۔ جب انسان اتنا واضح ہو تو پھر وہ بغیر بازوؤں کے، بغیر ٹانگوں کے بہت کچھ کر کے دکھاتا ہے۔

لوگ لاکھوں روپیہ لگا کر اپنے دل کا، اپنی آنکھوں کا علاج کراتے ہیں مگر یہ چیزیں کروڑوں روپے میں بھی نہیں ملتیں۔ اس لیے ان کی قدر کیجیے۔ کسی دن کسی ایسے فرد کے ساتھ کھڑے ہوں جس کے پاس آنکھیں نہیں ہیں۔ اگر آپ میں احساس زندہ ہے تو پھر آپ اپنی آنکھوں کی قدر کریں گے۔ آپ سوچیں گے کہ اگر یہ نہ ہوں تو میری زندگی کتنی مشکل ہو جائے۔ اس سے جا کر پوچھیے کہ جس کے ہاتھ نہیں ہیں اور وہ کتنی مشکل سے کام کر رہا ہے۔ پھر آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے، کیونکہ اعضائے جسمانی کے بغیر زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ کہتا ہے، لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔

مشق

ان دس چیزوں کے نام لکھیے جو آپ کو شکر گزاری کا احساس دیتی ہیں۔

اگر ہم بدل جائیں

زندگی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ سب لوگ آپ جیسے ہو جائیں؟

فطرتاً ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ وہ بندہ ذہنی دباؤ میں زیادہ ہوتا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی میری طرح ہو جائیں۔ یہ تمنا کہ دوسرے بدل جائیں، بذاتِ خود ایک درد ہے۔ آپ اس خواہش کو ختم کیجیے۔ اگر بچہ نالائق ہے تو نالائق کو قبول کیجیے۔ وقت خود اسے تبدیل کر دے گا۔ کچھ لوگوں کو آپ سمجھا نہیں پاتے۔ انہیں وقت سمجھاتا ہے۔ بعض لوگ دنیا میں سمجھنے کیلئے نہیں آتے۔ وہ اس زعم میں رہتے ہیں کہ وہ جو کچھ سمجھتے ہیں، وہی درست ہے۔ یہ لوگ حقیقت تک پہنچ نہیں پاتے۔ خام خیالات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ خیالات انسانی کمائی ہیں۔ اگر آپ کسی کے ساتھ دو گھنٹے رہتے ہیں تو ان دو گھنٹوں کے عوض آپ کو جو خیالات ملتے ہیں، وہ آپ کی کمائی ہوتے ہیں۔ یہ خیالات مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی۔ آپ ان خیالات سے زیادہ سے زیادہ سیکھنے کی کوشش کیجیے، کیوں کہ تمام خیالات کچھ نہ کچھ سکھاتے ہیں۔ کچھ خیالات یہ بتاتے ہیں کہ آپ کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ آپ کو ابھی بہت کچھ جاننا ہے؛ کچھ خیالات آپ کو شکرگزار بناتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ ایسے خیالات سے ہم دور ہیں۔

ایسے ہی لوگوں میں وہ بھی شامل ہیں جو شکر نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ اپنے کاموں سے، اپنی حرکتوں سے، اپنی باتوں سے، شکر ادا نہیں کر رہے ہوتے۔ اُن کی زبان پر ہر دم گلے شکوے دھرے رہتے ہیں۔ شکایت کرنا تو بہت آسان ہے، گلہ کرنا بہت آسان ہے، جبکہ کام کرنا، شکر ادا کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اگر آپ اپنی زندگی میں شکرگزاری کو شامل کرتے ہیں، شکرگزاری کا جذبہ لے کر آتے ہیں، شکرگزار بنتے ہیں تو پھر آپ کی زندگی بدلے گی اور اطمینانِ قلب بھی نصیب ہوگا۔

وہ تمام لوگ جو آپ کی زندگی میں خوش قسمتی بن کر آئے، وہ تمام چیزیں جو آپ کو نعمت کی شکل میں ملیں، وہ تمام چیزیں جو آپ کا حق نہیں تھا، قدرت نے پھر بھی آپ کو دیا... ان کا شکر ادا کیجیے۔ اگر آپ شکر ادا کرتے ہیں تو یقین کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ان موجود نوازشات میں

برکت ڈال دیتا ہے۔ آپ کے کام آسان ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ آپ کا اطمینان قلب بڑھ جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ آپ کو ایک راحت مل جاتی ہے۔ آپ حیران ہوتے ہیں کہ میں وہی انسان ہوں، یہ کیسے ہو گیا۔ فقط شکر گزاری کے جذبے سے حیران کن تبدیلی کیسے آ گئی۔ یہی دنیا جو مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی، یہی دنیا اب مجھے کیسے اچھی لگنی شروع ہو گئی۔ حیران کن بات ہے۔ یہی دنیا بدلی بدلی لگتی ہے... اگر آپ بدل جائیں۔ شاڈ ہیمسٹیڈ نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر آپ وہ چاہتے ہیں جو آپ کے پاس نہیں ہے تو اسے چاہنے لگیں جو آپ کے پاس اس وقت موجود ہے۔



سوچ

"اگر تم اپنی زندگی بدلنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے تمہیں اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا!"

لاطینی کہاوت

بڑی سوچ

سوچ کی دو اقسام ہیں۔ چھوٹی سوچ اور بڑی سوچ۔ چھوٹی سوچ کا مطلب ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے مسائل سے ہی نہیں نکل سکے۔ دنیا ترقی کرتی جا رہی ہے۔ اگر ہم سکردو کے کسی میٹرک کے طالب علم کی سوچ کا پتا لگائیں تو اس کی سوچ صرف یہی ہوگی کہ کام تو یہاں کوئی نہیں ہے۔ جیسے میرا دادا مونگ پھلی بیچتے بیچتے دنیا سے چلا گیا، اسی طرح میں بھی مونگ پھلی بیچتے بیچتے دنیا سے چلا جاؤں گا۔ شہریوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارے جیسے سادہ لوح لوگوں کے ساتھ دھوکا فراڈ کرتے ہیں۔ پاکستان بہت بڑا ملک ہے۔ شاید پورا پاکستان پہاڑوں سے بھرا پڑا ہے۔

ہماری سوچ جیسی ہوتی ہے، ویسی ہی سوچ دوسروں کی نہیں ہوتی۔

چھوٹی سوچ کے برخلاف، جب ہم اپنی سوچ کو بڑا کرتے ہیں تو دراصل ہم اپنے خوابوں کو بڑا کرتے ہیں۔ جس طرح ربر میں بہت زیادہ لچک ہوتی ہے، بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی سوچ میں بہت لچک رکھی ہے۔ اپنی سوچ کو جتنا مرضی چاہیں، آپ بڑھا سکتے ہیں، جتنا چاہیں، بڑا کر سکتے ہیں۔

بڑے لوگوں کی سوچ ہی بڑی ہوتی ہے، بلکہ وہ عام لوگ ہی ہوتے ہیں جیسے ہم لیکن ان کی سوچ بڑی ہوتی ہے تو کچھ بڑا کر جاتے ہیں، کچھ غیر معمولی کر جاتے ہیں۔ لہٰذا، بڑا

سوچ کا ایک حصہ ہو سکتا ہے جو سوچ کو غالب بنا سکتا ہے۔

آپ خریداری کرتے ہیں تو دکان پر ہر شے کی ایک قیمت مقرر ہوتی ہے۔ یہ قیمت ادا کرکے وہ چیز مل جاتی ہے۔ اسی طرح زندگی کی ہر شے قیمت سے مشروط ہے۔ ہمیں اس کی قیمت ادا کرکے یہاں سے جانا ہے۔ اس زندگی کی ایک قیمت یہ ہے کہ ہم چھوٹی سوچ کے ساتھ زندگی نہ گزاریں، بڑا سوچیں۔ بڑی سوچ یہ ہے کہ "میں دنیا میں آیا ہوں تو کچھ کام کرکے جاؤں کہ دنیا مجھ سے متاثر ہو۔" یہ اثر پذیری (Effectiveness) اصل کامیابی ہے۔

کامیابی یا اثر پذیری کے سکے کے دو رخ ہیں۔ سوچنا ایک رخ ہے تو عمل دوسرا رخ ہے۔ جو انسان صرف سوچ پر گزارہ کیا اور عمل نہیں کرسکا تو وہ اس کی شخصیت میں کوئی خرابی ہے۔ وہ کرنا تو بہت کچھ چاہتا ہے لیکن اس کی شخصیت میں کوئی ایسا خوف ہے جو اسے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ سب سے پہلے غور کیجیے کہ وہ کون سی خرابی ہے جو آپ کو آگے نہیں جانے دے رہی، اسے ٹھیک کیجیے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ عمل کیلئے خود کو تیار کرنا آسان ہوگا۔ بہت سے لوگ لیکچر سنتے ہیں، ویڈیوز دیکھتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے۔ کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے۔ اگر آپ ایک ہزار لیکچر سن لیں لیکن آپ نے زندگی میں یہ طے نہیں کیا کہ میں یہ کن کیوں رہا ہوں، میں اس ٹریننگ میں شریک کیوں ہوں۔ تو ان تمام کا فائدہ کوئی نہیں ہے۔

عمل نہ کرنا درحقیقت کام چوری کا مزاج ہے۔ بے عملی کے مزاج سے خود کو آزاد کیجیے۔ طے کیجیے کہ آپ کو اپنی واحد زندگی میں کیا کرنا ہے۔

خیالات کی آمدورفت

کبھی کبھی یہ سوچا کیجیے کہ میرے خیالات کہاں سے آتے ہیں؟ اس خیال کا ماخذ کیا ہے؟ اگر یہ خیال حسنِ خیال ہے تو پھر شکر ادا کیجیے۔ اگر خیال جذباتیت ہے تو ضرور سوچئے کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ جب یہ بات حضرت واصف شاہ کو سمجھائی تو انہوں نے فرمایا

معلوم نہیں، میں مومن ہوں کہ کافر ہوں، میں موسیٰ ہوں یا فرعون ہوں۔"

انسان کے اندر ہی ساری چیزیں ہیں۔ پاکی بھی انسان کے اندر ہے، ناپاکی بھی اسی کے اندر ہے۔ انہیں سمجھ آئی کہ باہر دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو میرے خیالات کو تحریک دے۔

جب یہ بات مہاتما بدھ کو سمجھ آئی تو وہ کئی سال درخت کے نیچے مراقبے میں بیٹھا رہا۔ ایک دن اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے سامنے ایک خوبصورت لڑکی کو آتے دیکھا۔ اس لڑکی کا نام مارہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نفس امارہ وہاں سے چلا ہے۔ جب بدھا نے اس لڑکی کو دیکھا تو اس کا خیال پراگندہ ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے ایک جملہ کہا کہ اتنا گندا میں نے سوچا اور وہ بھی مارہ کی وجہ سے۔ اس نے کہا کہ دنیا میں جب بھی خیال آئے، اس کی وجہ مارہ ہو سکتی ہے۔ پھر ایک اور خیال آیا کہ اس کی وجہ مارہ نہیں ہے، تیرے اندر کی کمینگی ہے جس نے اس خیال کو بنایا تھا۔ مارہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔

جب آپ سمجھ جائیں کہ وہ کون سی شے ہے جو خیال بناتی ہے، وہ کون سا جذبہ ہے جو خیال بناتا ہے، تو پھر آپ یہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ خیالات کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔

اوّل تو آپ ان تمام چیزوں کی فہرست بنا لیجیے جو خیالات کو کنٹرول کر رہی ہیں۔ مثلاً ٹی وی، اخبار، باس، بیوی، والدہ، حالات ہو سکتے ہیں۔ حالات ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کئی دفعہ ہم حالات کی وجہ سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ جب آپ کی یہ فہرست بن جائے تو پھر آپ دیکھیے کہ واقعی ان چیزوں کو اپنی زندگی میں اجازت دینی چاہیے۔ فرض کیجیے، آپ کے خیالات کو آپ کی بیگم صاحبہ کنٹرول کر رہی ہیں۔ آپ اس کے ساتھ بیٹھ کر طے کیجیے کہ میں سب چیزوں کا ذمہ دار ہوں۔ میں اچھا شوہر بننے کی کوشش کروں گا اور کوشش کروں گا کہ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہ کروں۔ لیکن میں یہ اجازت نہیں

دے سکتا کہ آپ میرے خیالات کو کنٹرول کریں۔ جب آپ کچھ عرصہ ایسا کریں گے تو وہ بے چاری وہی بات کرے گی جو کرنے والی ہوگی۔ جب آپ اختیار والی چیزوں کو کنٹرول کرنا شروع کر دیتے ہیں تو بہت سی بے اختیار چیزوں کے اثرات بھی زندگی سے کم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ زندگی میں خیالات کی بوچھاڑ کم سے کم ہوتی جاتی ہے۔

سوچ پر قابو

سوچ یا خیال کو کنٹرول کرنے کے تین طریقے ہیں۔ یہ طریقے سمجھنے میں آسان ہیں مگر ان پر عمل کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے:

1- باقاعدہ سوچنا سیکھیے

باقاعدہ سوچنے کیلئے انٹرنیٹ پر جائیے۔ Edward D Bono لکھیے۔ آپ کو ذہنی قوتوں کے ماہر ایک شخص کے بارے میں لاتعداد لنکس پڑھنے کو ملیں گے۔ یہ پڑھیے یا اس کی کتابیں بازار میں ملتی ہیں، ان کا مطالعہ یکسوئی سے کیجیے۔ ایڈورڈ دی بونو سوچنے کا فن سکھانے والا ایک ماہر ہے۔ اس کی کتابوں کے مطالعے اور کورسز کے ذریعے آپ سوچنے کے طریقے سیکھتے ہیں۔ یوں آپ اپنی سوچ کا معیار بلند کرنا اور کچھ نیا سوچنا سیکھ سکتے ہیں۔

جو لوگ نیا سوچنا نہیں جانتے، وہ اپنی پرانی سوچ پر جمے رہتے ہیں۔ ہر سوچ ہر وقت کام نہیں کرتی۔ ایک ہی سوچ کئی مسئلے حل نہیں کر سکتی۔ نئے خیالات کا کمال یہ ہے کہ یہ پرانے خیالات کو نکال باہر کرتے ہیں۔ نئے خیالات مسائل کے نئے حل سامنے لاتے ہیں۔

2- زندگی میں بڑا جنون رکھیے

جن لوگوں کی زندگی میں کوئی بڑا، غیر معمولی جنون (Passion) ہوتا ہے، ان کے خیالات منظم اور مرتب ہوتے ہیں۔ جنون، شوق سے پیدا ہوتا ہے۔ انسانی شوق کی چھتری اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اس کے نیچے سب چیزیں پھیکی لگنے لگتی ہیں۔ تمام اعذار (Excuses)

مانند پڑ جاتے ہیں۔ اگر آپ کی زندگی میں انجن نام کی چیز ہے تو پھر سارے ڈبے خود کھنچے چلے جائیں گے۔ اس انجن کا نام ہے، "جنون"۔ جنون جب زندگی کا مقصد بن جائے تو منتشر خیالات مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں اور زندگی کے تمام تر معاملات منظم ہوتے رہتے ہیں۔

3- اپنے آپ کو سمجھیے

جو آدمی اپنے آپ کو سمجھنا شروع کر دیتا ہے، وہ اپنے خیالات کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ سوچ یا خیال دراصل بیج کا نام ہے۔ اس بیج سے اعمال، کردار اور عادات کا پورا درخت بنتا ہے۔ سوچ وہ بیج ہے جو پورے نصیب کو بناتا ہے۔ اگر بیج ٹھیک نہیں ہے تو پھر فصل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جب آپ خود کو جان جاتے ہیں ہے تو پھر آپ اپنی سوچ کے محافظ بن جاتے ہیں۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، "آپ اپنے دل کے دروازے پر دربان بن کے بیٹھیے اور دیکھیے کہ دل کے اندر داخل کرنے کے قابل کوئی سوچ ہے یا نہیں۔" یہ صوفی کر سکتا ہے، یہ بابا کر سکتا ہے، یہ درویش کر سکتا ہے۔ جو آدمی پہلے سے لالچ لیے بیٹھا ہو، وہ مسئلے نہیں حل کر سکتا۔ وہ سوچ نہیں پکڑ سکتا۔ سوچ پکڑنے کا مطلب ہے کہ آپ نے ایک لیباٹری اپنے اندر لگائی ہے۔ آپ ایک سوچ کو دیکھتے ہیں اور تجزیہ کرتے ہیں کہ کیا یہ سوچ رکھنے کے قابل ہے یا نہیں؛ کیا یہ سوچ کہیں میرے اور میرے مالک کے درمیان حائل تو نہیں ہو رہی؛ کیا یہ سوچ آنے والے وقت میں میری تباہی کا سبب تو نہیں بنے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ میں خود شناس بنوں، جتنی خود شناسی بڑھتی ہے، آپ اتنا ہی اپنی سوچ کی گرفت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص اپنے بابے کے پاس گیا۔ بابے کو جا کر کہا کہ اسم اعظم عطا کر دیں۔ انہوں نے جواب دیا، اسم اعظم تمہیں کل دوں گا۔ آج یہ کام کرو کہ یہ ڈبا لے جاؤ اور کل لے کر آنا۔ جب تم یہ ڈبا مجھے لوٹاؤ گے تو میں تجھے اسم اعظم دوں گا۔ اس ڈبے سے آواز آ رہی تھی۔ بابے نے اسے کہا کہ اسم اعظم اسی صورت میں دوں گا۔ اگر تم اس کو نہیں کھولو گے۔ بس تم نے اس کو ایک دن کیلئے سنبھالنا ہے۔ اس شخص

کیلئے وہ ایک دن گزارنا مشکل ہو گیا۔ اسے تجسس ہو گیا کہ اس ڈبے کے اندر کیا ہے۔ اس سے رہا نہ گیا اور بالآخر اسے کھول ڈالا۔ دیکھا کہ اس ڈبے کے اندر چوہا ہے۔ ڈبا کھولا تو چوہا باہر نکل بھاگا۔ اگلے دن وہ شخص روتا ہوا خالی ڈبے کے ساتھ اپنے بابے کے پاس پہنچا اور کہا کہ مجھے معاف کر دیں، مجھ سے رہا نہیں گیا۔ انہوں نے جواب دیا، بیٹا ایک چوہا تجھ سے سنبھالا نہیں گیا، اسم اعظم تو کیا خاک سنبھال کر رکھے گا۔

دنیا میں اکثریت اپنے خیالات، اپنی سوچ کو تو سنبھال نہیں سکتی، وہ اپنے مستقبل کو خاک سنبھالے گی۔ جب بھی خدشے اور گمان آپ کے ذہن میں بنتے ہیں، وہ آپ کی شخصیت کے عکاس ہوتے ہیں۔ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، "باپ کی سوچ بیٹے پر آشکار ہو جائے تو وہ اس کا جنازہ نہ پڑھے۔"

سوچ کو کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ یہ ایجنڈا ہو کہ میں نے اپنے خیالات کو تبدیل کرنا ہے۔ لوگ اس بارے میں سنجیدہ ہی نہیں ہوتے۔ یہ احساس پیدا کیجیے کہ میرے اندر کمی ہے۔ کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ہے۔ نہ سکھانے والے اور نہ سیکھنے والے۔ ہم سب میں کچھ نہ کچھ خامیاں ہوتی ہیں۔ اچھا وہی ہوتا ہے جو اپنی خامیوں کو بہتر کرنے لگے۔ بھارت کے صدر عبدالکلام کہتے ہیں، "دنیا کا کوئی انسان اپنے مستقبل کو نہیں بدل سکتا لیکن وہ اپنی عادتوں کو بدل سکتا ہے، اور اس کی عادتیں اس کے مستقبل کو بدل دیتی ہیں۔"

جب آپ کو لگے مجھے ایسی عادات اپنانی چاہئیں جس سے میرا مستقبل بہتر ہو تو وہ عادتیں اپنائیں۔

کچھ خیالات ایسے ہوتے ہیں جو آنے والے وقت میں آپ کے بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔ کچھ خیالات ایسی ہوتے ہیں جو آنے والے وقت میں آپ کو بنا جاتے ہیں۔ آپ سے

دیکھئے کہ میری سوچ کے معیارات کیا ہیں؟ میں کس معیار پہ سوچ رہا ہوں؟ اگر میری سوچ مثبت ہے تو پھر مثبت لوگ اور حالات میری طرف آنا شروع ہو جائیں گے۔ اگر سوچ مثبت نہیں ہے تو پھر معاشرے کی منفیت سامنے آئے گی۔ اپنی موٹیویشن کے ذرائع بنائیں چاہے وہ کام ہوں، وہ کتابیں ہوں، وہ اساتذہ کرام ہوں یا دوست ہوں۔ جاوید چوہدری سے کسی نے پوچھا کہ جب آپ دباؤ میں ہوتے ہیں یا پریشان ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اس کیلئے لوگ رکھے ہوئے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھنے لگا، کیا مطلب؟ وہ کون سے لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، میں نے کچھ لوگ ایسے رکھے ہوئے ہیں جن کے ساتھ صرف بیٹھ کر ہی موٹیویشن مل جاتی ہے۔

بعض اوقات ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم نے تلاش نہیں کیا ہوتا۔ عموماً انہی لوگوں سے ہمیں موٹیویشن ملتی ہے۔ ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے جو وہ دے رہا ہوتا ہے۔ جیسے وہ کہاوت ہے کہ اگر تم عطر کی دکان پر جاؤ گے تو کپڑوں کو خوشبو لگ ہی جائے گی اور اگر کوئلے کی دکان پر جاؤ گے تو کپڑوں پہ داغ لگ ہی جائیں گے، اس کے مترادف ہم جس کے پاس جاتے ہیں، اسی کی طرح کی سوچ ہم لے کر آتے ہیں۔ ویسے ہی خیالات ہم پر حاوی ہوتے ہیں۔

اچھی سوچ کے ذرائع بڑھایئے، کیونکہ یہ ذرائع بڑھنے سے اپنی سوچ کو مثبت اور تعمیری انداز سے منظم کرنا آسان تر ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہمیں روزانہ صبح دانت برش کرنے پڑتے ہیں، اسی طرح روزانہ ہمیں اچھے خیالات کی مشق بھی کرنے کی ضرورت ہے۔ خیالات کو اچھا بنانے کیلئے ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ گھر سے نکلنے سے پہلے دس سے پندرہ منٹ مراقبہ (Meditation) کریجیے۔

◆ ◆ ◆

تنقید

"اپنے خوفوں کو اپنے خوابوں کی تکمیل میں دیوار نہ بننے دو!"

ڈونلڈ ٹرمپ

تنقید برداشت کرنے کا طریقہ

تنقید ہمارے معاشرے کا ایک عام چلن ہے۔ جس کو دیکھو، مصلح بنا تنقید سے اصلاح کا آغاز کرتا ہے۔ تنقید یقیناً اچھی شے ہے، لیکن تنقید کرنا جتنا آسان ہے، تنقید سننا اور اسے برداشت کرنا کہیں زیادہ مشکل۔ تاہم، اگر آپ کسی محفل میں ہیں اور آپ موضوع گفتگو ہو جائیں تو۔۔۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن!

تنقید برداشت کرنے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ تھوڑی دیر کیلئے وہ جگہ چھوڑ دیں کہ جہاں تنقید کی جا رہی ہے۔ بات کو بدل دیجیے۔ موضوع تبدیل کر دیجیے۔ ٹی وی پر پروگرام کرنے والا میزبان جب ماحول کو گرم دیکھتا ہے تو وہ اسی وقت بات کو بدل دیتا ہے، کیونکہ وہ اس طریقہ کو جانتا ہے۔ بالکل اسی طرح ماہرین نفسیات، ڈاکٹرز، مزید دانش مند لوگ بھی موقع محل کے اعتبار سے بات کو سنبھال لیتے ہیں۔ مگر عام انسان کیلئے یہ بہت مشکل ہوتا ہے۔

اگر آپ کو باتوں کو Reframe کرنا یعنی مفہوم بدلنا آتا ہے تو پھر تنقید برداشت کرنا آسان Easy ہے۔ ری فریمنگ نفسیات کی ایک اصلاح ہے جس کا استعمال ابلاغ (کمیونیکیشن) میں کیا جاتا ہے۔

تنقید برداشت نہ ہو تو غصہ آتا ہے، اور اکثر فوری آتا ہے۔ یاد رکھیے، وہی برتن زیادہ بجتا ہے، جو اندر سے خالی ہوتا ہے۔ لہٰذا، غصہ اسی شخص کو آئے گا، جس کا ظرف کم ہوگا۔ ایسا فرد کسی کی رائے کو حتمی سمجھ بیٹھتا ہے۔ وہ دوسروں کے جملوں کے منفی پہلو پر توجہ کرتا اور اسی کو دل سے لگا کر بیٹھ رہتا ہے۔ ابراہام لنکن جب پہلی دفعہ پارلیمنٹ میں گیا تو اس کے بارے میں کہا گیا کہ ایک موچی کا بچہ پارلیمنٹ میں آ گیا ہے۔ لنکن نے کہا، یہ بات درست ہے کہ میں موچی کا بچہ ہوں، مگر آپ مجھے یہ بتایئے کہ کیا پورے امریکا میں میرے باپ موچی جیسا کوئی دوسرا موچی ہے، جس کا بیٹا صدر ہو؟

اگر آپ مثبت انسان ہیں تو پھر آپ منفی سے منفی بات کو بھی مثبت انداز میں لیں گے۔

حضور اکرم ﷺ کو طائف میں جب پتھر مارے گئے تو واپسی پر آپ ﷺ ایک کے باغ میں آرام کی غرض سے رکے تو وہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے عرض کیا، آپ ﷺ حکم کریں تو طائف شہر کے دونوں جانب پہاڑوں کو ملا دیا جائے تاکہ یہ شہر والے ختم ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ”نہیں، یہ مجھے نہیں جانتے۔ اگر ان میں کوئی مسلمان نہ ہوا تو مجھے امید ہے کہ ان کی نسلوں میں ضرور ایمان لائیں گے۔“

جب آپ کسی کی لاعلمی دیکھتے ہیں تو آپ اس کی تنقید کو معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ برابری کا مقابلہ ہے تو پھر آپ لڑتے ہیں۔ جب آپ کو پتا ہے کہ میں اندر سے بڑا انسان ہوں تو آپ اپنی عظمت کو معافی سے ثابت کرتے ہیں۔

تنقید سے دل برداشتہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں دوسرے کی گفتگو کو ”تنقیص“ کے روپ میں لیتے ہیں۔ اس وقت اگر آپ خود کو یہ یاد دلائیں کہ ہر فرد کی رائے (خواہ تنقیص ہو یا تعریف) اس کی ذاتی رائے ہے، حقیقت نہیں تو آپ کیلئے اسے برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

(”کامیاب نوجوانوں کی سات عادات“ سے ماخوذ ایک نشست)

تنقید کو منظم کرنا

تنقید کو ہم مینج نہیں کرتے۔ ہر انسان کی برداشت کی سطح مختلف ہوتی ہے۔ تنقید کو منظم کرنے کیلئے ہمیں صرف اپنی برداشت کی سطح کو بڑھانا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو چیزیں ہمیں پچھلے پانچ سال سے پریشان کر رہی ہیں، کیا اب بھی وہ ہمیں پریشان کر رہی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے ابھی تک تنقید کو تربیت نہیں دی، اسے منظم کرنا نہیں سیکھا۔

جیسے جیسے آپ بڑے ہوتے ہیں، آپ کی فکر میں اضافہ ہوتا ہے، شعور بڑھتا ہے اور آپ کے نظریات بھی ترقی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی آپ کا حوصلہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے دنیا میں جتنے بھی علم والے اور بڑے کردار والے انسان دیکھے ہوں گے، ان میں ایک نمایاں وصف ضرور پایا ہوگا، اور وہ ہے، معاف کرنا، درگزر کرنا۔ ان کامیاب لوگوں کے پاس ظرف، حوصلہ اور برداشت زیادہ ہوتی ہے۔ سقراط کو اگر کوئی گالی دیتا تو وہ اسے معاف کر دیتا۔ کوئی اسے کہتا کہ آپ کو غصہ نہیں آیا تو جواب دیتا کہ جو یہ شخص میرے بارے میں کہہ رہا ہے، غلط ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جو یہ سمجھ رہا ہے۔

دنیا میں انسانوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ یہاں آپ کو پھول نما انسان بھی ملیں گے اور کانٹا نما انسان بھی۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب آپ ان چیزوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ آپ سمجھ جاتے ہیں کہ زندگی میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ پھر آپ کسی بہت اچھے کیلئے کسی بہت برے کو معاف کرنے کے قابل ہیں۔

('کامیاب نوجوانوں کی سات عادات' سے ماخوذ ایک نشست)

فیڈ بیک

تنقید ہو، تنقیص ہو یا تعریف ہو، تمام آراء کو اپنے لیے ''فیڈ بیک'' (Feedback) کا

ذریعہ بنائیے۔ یوں، آپ کے سیکھنے کی صلاحیت یعنی Self learning میں اضافہ ہوگا۔ آپ کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ اپنی خوبیوں اور خامیوں سے خود واقف ہوں۔ آپ اگر اپنے بارے میں لوگوں کی رائے کو فیڈ بیک کے طور پر جانچیں گے تو آپ اپنی خامیاں دور کرنے اور خوبیاں بڑھانے کے قابل ہوں گے۔ آپ روز بہ روز بہتر سے بہتر ہوتے جائیں گے۔

تنقید وہی برداشت کرسکتا ہے کہ جو یہ جانتا ہے کہ اصل میں، میں کیا ہوں۔ وہ لوگ جو ایک گالی پہ قتل کر دیتے ہیں، حقیقتاً خود آشنا نہیں ہوتے۔ انہیں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا پتا ہی نہیں ہوتا۔



تاثیر

"آپ جتنا زیادہ لوگوں سے بہتر طور پر ملتے اور انہیں متاثر کرتے ہیں، اتنی ہی زیادہ تاثیر رکھتے ہیں!"

تاثیر

دنیا میں کچھ لوگوں کی تاثیر (Effectiveness) بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کی بات میں تاثیر ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عرض کرتے، "یا رسول اللہ ﷺ، جب ہم آپ ﷺ کی بارگاہ میں ہوتے ہیں تو ہمارے ایمان کی کیفیت اور ہوتی ہے اور جب اٹھ کر جاتے ہیں تو دل کی حالت بدل جاتی ہے۔" یہ تاثیر تھی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے زمانے کے سب سے بڑے استاد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کی زبان میں اتنی تاثیر دی کہ جس دن اللہ تعالیٰ کے خوف کے بارے میں بات ہوتی تھی تو مجلس میں چار پانچ لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت میں زمین پر گر پڑتے تھے۔ آپؒ کی بات سننے والے وقت کی قید سے نکل جاتے تھے۔ ایک دفعہ آپؒ بیماری کی وجہ سے آرام فرما رہے تھے لہٰذا آپؒ کے بیٹے کو خطبہ دینا پڑا۔ وہ خاصی دیر بات کرتے رہے لیکن محفل میں وہ رنگ نہ جم سکا۔ کسی نے شیخ سے درخواست کی کہ آپ تشریف لا کر چند منٹ ہی بات کر لیں۔ جب درخواست آپ تک پہنچی تو آپ آ گئے اور کہنے لگے، "آج طبیعت بڑی ناساز ہے۔" آپ کا اتنا ہی کہنا تھا کہ سارے لوگ دھاڑیں مار کر رونے لگے۔

تاریخ کے جتنے بھی بڑے نام ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں فصاحت و بلاغت کے ساتھ

ساتھ تاثیر بھی عطا کی ہوتی ہے۔ بولنے والے کیلئے اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے تاثیر دے دے۔ علم بہتوں کو مل جاتا ہے، مگر تاثیر اللہ کی عطا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو دیتا ہے۔ یہ وہ چابی ہے جو دلوں کے قفل کھولتی ہے۔ جاوید چوہدری اپنے کالم میں لکھتے ہیں، ''انسان بول سکتا ہے، لکھ سکتا ہے، لیکن یہ کہ کس کی لکھی ہوئی اور بولی ہوئی بات دل میں اترتی ہے، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔'' ہٹلر جتنا بڑا سفاک تھا اس کا جملہ بھی انتہائی سفاکانہ ہوتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ''اگر ایک استاد نے تین نسلوں کو پڑھا دیا ہے تو اس کو گولی ماردو!'' کسی نے پوچھا، کیوں؟ اس نے جواب دیا، ''اگر کام نہیں کیا تب بھی گولی بنتی ہے اور اگر کام کر گیا ہے تو تین نسلوں کا مطلب ہے وہ پوری نسلوں کو سنوار گیا ہے پھر بھی گولی ماردو کیونکہ اب اس کا رہنا نہیں بنتا۔'' اس کو مثبت انداز میں لیجیے کہ وہ نسلیں سنوار کر اپنا کام کر گیا ہے۔ یہ سب تاثیر کی وجہ سے ہے۔ تاثیر اللہ تعالیٰ کی عطا اور انعام ہے۔

تاثیر کیسے پیدا کی جائے

جس طرح چیزیں جگہ بناتی ہیں، اسی طرح باتیں بھی جگہ بناتی ہیں۔ ہر اچھی بات، کام کی بات، بہتر بات اپنی جگہ خود بناتی ہے۔ باتوں میں تاثیر کیلئے آپ کے اندر چھے خصوصیات ہونی چاہئیں:

1- سچ

سچے اور کھرے انسان میں تاثیر ہوتی ہے، کیونکہ سچ کا نعم البدل کوئی نہیں ہے۔ سچ کو ثابت نہیں کرنا پڑتا۔ بسا اوقات سچ ثابت نہیں ہو رہا ہوتا، مگر وقت ثابت کر دیتا ہے۔ دنیا کی کچھ چیزیں صرف سچ ہیں، ابدی سچ، جیسے سورج کا نکلنا۔ اس پر دلائل نہیں دیئے جا سکتے کیونکہ وہ خود نکل کر بتاتا ہے کہ میں سورج ہوں۔ دنیا میں کچھ سچ ہوتے ہیں، مگر لگتے نہیں ہیں، جیسے ایمانداری بڑی اچھی چیز ہوتی ہے۔ ممکن ہے، کوئی بے ایمان ہو اور وہ کہے ایسا نہیں ہے۔ مگر جو نیک ہو جاتے ہیں، وہ مان جاتے ہیں۔ سچ سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔

بچے میں اعتماد ہوگا اور اعتماد بذاتِ خود تاثیر بن جاتا ہے۔

2- اخلاص

سننے والے پر اتنی ذمے داری نہیں ہوتی جتنی بولنے والے پر ہوتی ہے۔ جس کے پاس اخلاص نہیں، اس کے پاس تاثیر نہیں ہوتی۔ ستر اسی سال پہلے کی بات ہے، لاہور کے رنگ محل بازار میں ایک موچی بابا فیروز رہتے تھے۔ وہ کھسے بناتے تھے۔ ان کی باتوں میں تاثیر بہت تھی۔ وہ جو کچھ بھی کہتے، دل پہ اتر جاتا تھا۔ وہ بہت نیک اور صاف ستھرے انسان تھے۔ کسی نے بابا فیروز سے پوچھا کہ بابا جی، آپ کی بات میں اتنی تاثیر کیوں ہے؟ انہوں نے جواب دیا: "میں نے چالیس سال صرف جوتیاں نہیں بنائیں، میں نے اللہ کی مخلوق کی سیوا کی ہے۔ میں نے اس کے بندوں کی جوتیاں بنائی ہیں۔" بابا جی مزید کہتے، "موچی بادشاہ سے بہتر ہے۔ اگر موچی کی نیت بادشاہ سے بہتر ہے اور بادشاہ کی نیت بری ہے تو بادشاہ موچی سے بدتر ہے۔" حضرت جنید بغدادیؒ وقت کے بادشاہ کی بارگاہ میں پیش ہوئے۔ بادشاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جب آپؒ واپس جانے لگے تو وہ آپ کو باہر تک چھوڑ کر آیا۔ اس وقت آپؒ کی والدہ ماجدہ حیات تھیں۔ جب آپؒ گھر پہنچے تو والدہ نے فرمایا، آج آپ کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی خوشی ہے، خیر تو ہے؟ آپؒ فرمانے لگے، "ماں، آج آپ کے بیٹے کیلئے بادشاہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور باہر تک چھوڑنے آیا۔" ماں نے کہا: "میں اس وقت کو یاد کر رہی ہوں جب تو پیٹ میں تھا۔ میں سوت کات کر حلال رزق سے تجھے پال رہی تھی۔ یہ اس کا کمال ہے۔ تم سمجھ رہے ہو، یہ تمہارے علم کا کمال ہے۔"

آپ کے ہر کام میں اخلاص توانائی پیدا کرتا ہے، تاثیر پیدا کرتا ہے۔

3- نرمی

شخصیت میں نرمی تاثیر پیدا کرتی ہے۔ سخت انسان میں تاثیر نہیں ہوتی۔ اگر ہم تلوار لے کر کام کریں گے تو تاثیر نہیں آئے گی۔ خوف سے کوئی نہیں مانتا۔ محبت سے سب مان

جاتے ہیں۔ طبیعت میں تھوڑی سی نرمی، جھکاؤ، آسانی فراہم کرنا تاثیر پیدا کرتا ہے۔ اپنے اندر سے سختی اور جبر کا پہلو ختم کیجیے۔ استاد اگر درگزر نہیں کرتا، معاف نہیں کرتا تو پھر اس کی باتوں میں تاثیر بھی نہیں آئے گی۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے معافی کے خواستگار ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مالک ہمیں معاف کر دے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم خود معافی چاہ رہے ہیں، مگر خود کسی کو معاف نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑا تضاد ہے۔ نرم انسان معاف کر دیتا ہے۔ تاثیر کیلئے نرم ہونا بہت ضروری ہے۔

4۔ متوازن شخصیت

حضرت امام غزالیؒ اپنی کتاب ''کیمیائے سعادت'' میں لکھتے ہیں، ''متوازن وہ ہے جو گھڑیال کے پنڈولم کی مانند ہے۔ وہ دونوں طرف انتہا تک جاتا ہے، مگر واپس وسط میں ہی آتا ہے۔'' نارمل انسان وہ ہے جو وسط میں آئے۔ بہت لوگ احساسِ گناہ کا عارضہ پال لیتے ہیں۔ یہ ان لوگوں میں ہوتا ہے جن میں ایمان کی کمی ہوتی ہے۔ آج سائنس اس نتیجے پر پہنچ گئی ہے کہ جو بندہ گڑگڑاتا ہے، وہ نارمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بہت سے نفسیاتی عارضے اللہ کے سامنے گڑگڑانے سے ختم ہو جاتے ہیں۔ جب آپ بوجھ محسوس کریں تو اس وقت آپ کو تڑپ والے سجدے کی ضرورت ہے۔ انسانی جسم میں ایک کیمیکل سوڈیم پوٹاشیم پایا جاتا ہے۔ جب بھی جسم میں سوڈیم کا تناسب بڑھ جائے تو انسان میں غبار آ جاتا ہے۔ اسے چیک کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ روتے وقت جو آنسو نکلتے ہیں، ان کا ذائقہ چیک کریں تو وہ نمکین ہوتا ہے۔ وہ نمکینی سوڈیم کی وجہ سے ہے۔ جب آنسو کے ساتھ وہ نمک نکلتا ہے تو اس کے ساتھ انسان کا غبار نکل جاتا ہے۔ نفرت نارمل ہے، جبکہ مسلسل نفرت رکھنا نارمل نہیں ہے۔ اس لیے اپنی شخصیت کو فطرت پر لائیں، اسے متوازن بنائیے۔ جب آپ متوازن ہوں گے تو آپ میں تاثیر آ جائے گی۔

5- محنتی

جو لوگ محنت کرنے والے، اپنا خون پسینا ایک کرنے والے ہوتے ہیں، ان کی شخصیت کی تاثیر کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کام چور نہیں ہوتے۔ کام چور انسان میں تاثیر نہیں ہوتی۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، ''تو بچا بچا کے نہ رکھ، اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ۔۔۔۔۔۔ جو شکستہ ہو تو عزیز تر نگاہ آئینہ ساز میں'' دل ٹوٹتا ہے تو پھر اندر سے چشمہ نکلتا ہے اور اللہ تعالیٰ ٹوٹے دلوں کی زیادہ سنتا ہے۔ اس لیے محنت کرنے والا رو پڑتا ہے۔ محنتی انسان بنیں تو تاثیر خود بخود آ جائے گی۔

6- تعلق

حضرت واصف علیؒ واصف فرماتے ہیں، ''بغیر تعلق کے تبلیغ ایسے ہی ہے جیسے غیر زبان کی تقریر''۔ تعلق جتنا اچھا ہوگا، گفتگو اتنی ہی تاثیر والی ہوگی۔ سیکھنے کے مقام پر آؤ گے تو سکھانے کے مقام پہ جا سکو گے۔ یہ خصوصیت قدرت نے کئی لوگوں کو عنایت کی ہوتی ہے۔ پانی کا ایک ٹینکر بھرا ہو اور ایک خالی ٹینکر ہو، اور دونوں کے درمیان پائپ لگا دیا جائے تو خالی ٹینکر میں پانی بھر جائے گا۔ جب ہم تعلق بنائے بغیر اپنی بات پہنچانا چاہتے ہیں تو گویا ہم پائپ لگائے بغیر پانی خالی ٹینکر میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ؟ پھر بات نہیں بنتی۔

تعلق بنانا پوری نفسیات ہے۔ اس کیلئے صفات ہونی چاہئیں۔ جب ہماری شخصیت میں دوسروں کیلئے آسانی ہوگی تو بات بھی دوسروں تک جلد پہنچے گی۔ اس سے پہلے کہ کوئی ہم سے مدد مانگے، ہمیں خود آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنا شروع کر دینا چاہیے۔ اس سے تعلق بھی بن جاتا ہے اور بات کرنے میں بھی آسانی رہتی ہے۔ دوسروں کی قدر کیجیے۔ کب، کیا بات کرنی ہے ضرور دیکھیں۔ ہمیشہ یاد رکھیے کہ تعلق پہلے بنانا ہے اور بات بعد میں کی جاتی ہے۔

تعلیم اور طالبعلم

"طالبعلم کا دماغ کوئی ڈبا نہیں کہ جو چاہو ٹھونستے چلے جاؤ؛ طالبعلم تو چراغ ہے جسے تعلیم سے روشن کرنا ہے!"

البرٹ آئنسٹائن

تعلیمی نظام کی بہتری

پاکستان میں تعلیم کی بہتری کیلئے جتنے بھی تجربات ہوتے ہیں، وہ باہر سے آتے ہیں۔ یہاں انہیں صرف نافذ کیا جاتا ہے۔ میٹرک سے لے کر ایم اے تک پورا تعلیمی نظام گورے کا بنایا ہوا ہے جسے ہم نے بلا چون و چرا اپنایا ہوا ہے۔ ہماری تقریباً تمام نصابی کتابیں ما سوائے اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کے، سب کی سب گورے کی لکھی ہوئی ہیں یا ان کی لکھی کتابوں کا چربہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گورے نے محنت کر کے کتابیں لکھی ہیں جبکہ یہاں کوئی محنت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ہمیں عادت پڑ چکی ہے کہ کوئی بنا بنایا مواد مل جائے اور اسے Copy Paste کر دیا جائے۔ اس وقت دنیا میں جو تعلیمی نظام رائج ہے وہ بی ایس ہے۔ یعنی بی ایس کی ڈگری، ماسٹرز کی ڈگری کے برابر ہوگی۔ یہاں پر بچہ ماسٹر بھی کرلے پھر بھی وہ نالائق ہی رہتا ہے۔ اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی۔ ہمارے تعلیمی نظام میں کورس بہت زیادہ شامل کر دیا گیا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں وقت بہت کم ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اساتذہ کرام بھی پوری توجہ کے ساتھ نہیں پڑھا پاتے۔

یہ نظام تو ٹھیک ہے، مگر بچے اس کے مطابق تیار نہیں ہو رہے۔ ہمیں رٹنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ ایک دم سے بی ایس کا نظام متعارف ہو گیا ہے۔ وہ ذرا تخلیقی نوعیت کا ہے۔ اس

پہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ کام زیادہ ہے۔ لیکن فکر ہے کہ بڑے تجربوں کے بعد بہتری آرہی ہے۔ ہمیں ایک ڈگری کیلئے پختہ کاری کی ضرورت ہے۔

کامیابی پر تحقیق کے مطابق، جتنے کامیاب کاروباری لوگ ہیں، وہ زیادہ تر پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ آخر ان کے پاس کون سی وجہ یا نسخہ ہے جس کی وجہ سے وہ اتنے امیر ہو گئے؟ دنیا کا نظام قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ کائنات کے مالک نے قانون بنا کر ہمیں دے دیے ہیں۔ کامیابی کے بھی کچھ اصول ہیں اور ناکامی کے بھی کچھ اصول ہیں۔ ہر چیز کسی تناسب سے ہو رہی ہے۔ دنیا کے اسی فیصد امیر ترین کاروباری لوگوں کو کامیابی کے اصول سمجھ آجاتے ہیں۔ انہیں پتا لگ جاتا ہے کہ جذبہ، فوکس اور پیسے سے پیسہ بنانا بہت ضروری ہے۔ ڈگری زیادہ ضروری نہیں ہے۔ وہ پڑھے لکھے لوگوں کو ملازم رکھ لیتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کامیابی کے اصولوں کو سمجھ لیا ہے۔ کامیابی کے جتنے بھی اصول ہیں، انہیں سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کسی بھی شعبے میں کامیابی کیلئے اس شعبے کے اصولوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

طالب علم کا مقصد حیات

ہم پڑھتے ہیں، اسکول جاتے ہیں، کالج جاتے ہیں، اکیڈمی جاتے ہیں، کتابیں کھولتے ہیں، بڑے بڑے نوٹس لیتے ہیں۔ جب اچھا خاصا وقت گزر جاتا ہے تو ہم پڑھے لکھے جاہل بن چکے ہوتے ہیں۔ یہ بڑی خوفناک بات ہے۔ اگر ترقی کرنی ہے تو باہر کی آوازوں کو بند کرنا پڑے گا۔ باہر کی آوازوں کا مطلب ہے کہ انجینئر ہو، ڈاکٹر ہو، اکاؤنٹنٹ ہو، پائلٹ ہو۔ ایک لمحے کیلئے یہ سب چھوڑ کر فقط اپنے اندر کی آواز کو سنئے۔ وہ آواز خاموشی میں آئے گی۔ تنہائی میں اپنے ساتھ وقت گزاریے۔ آپ کو پتا لگے گا کہ جس راستے پر میں ہوں وہ راستہ میرا نہیں ہے۔ میں نے تو دنیا کو دیکھ کر راستے کا انتخاب کیا ہے۔

بچے تعلیم تو حاصل کر رہے ہیں مگر ان کے اندر طلب کی آگ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ ڈائریکشن نہیں ہے۔ ماؤزے تنگ کہتا ہے، ''ہزار میل کے سفر کی ابتدا ایک قدم سے ہوتی ہے، مگر اہم بات یہ ہے کہ جو قدم آپ نے اٹھایا ہے اس کی سمت کیا ہے'' یعنی آپ کی منزل کچھ ہے اور آپ نے اپنا قدم کسی اور سمت میں اٹھایا ہے۔ یوں، آپ ہزار میل بھی چلیں گے تو کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ اگر سمت ٹھیک ہے تو پہنچنا آسان ہوتا ہے۔

کیا فقط رٹے لگا لینا، چیزیں یاد کر لینا، نمبر لے لینا... آپ کی زندگی کی بہت بڑی کامیابی بن جائے گا؟ ایسا نہیں ہوگا۔ پھول جیسا ہو، وہ اگر دیکھنے میں خوبصورت اور خوشبودار نہیں ہے تو پھر وہ پھول نہیں ہے۔ جس چیز کی جو صفت ہوتی ہے، اگر اس صفت کو چیز سے نکال دیا جائے تو پھر وہ چیز، چیز نہیں رہتی۔ اسی طرح انسان میں بھی ایک صفت ہے اور وہ صفت خود شناسی ہے۔ اس کے متعلق حضرت علامہ محمد اقبالؒ فرماتے ہیں، ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی'' وہ خود شناسی یہ ہے کہ جس کام کیلئے مالک کائنات نے آپ کو پیدا کیا ہے، آپ وہ کام کریں۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یا اللہ، میں نے ایک چھپکلی کو بڑے غور سے دیکھا ہے۔ میرا سوال ہے کہ اس کو تو نے کیوں بنایا ہے؟ یہ بے معانی سی چیز لگتی ہے۔ اوپر سے جواب آیا، اے موسیٰ، ابھی چھپکلی تھوڑی دیر پہلے پوچھ رہی تھی کہ آپ نے موسیٰ کو کیوں بنایا۔ نتیجہ دنیا کی ہر چیز کا مقصد ہے۔ اگر ہر چیز کا مقصد ہے تو پھر آپ کا بھی دنیا میں آنے کا کوئی مقصد ہے۔ آپ اس دنیا میں آئے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کی ضرورت نہ ہو۔ ایک چھوٹے سے گھر میں جو چیزیں ہوتی ہیں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر ضرورت کے کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کائنات میں آپ کے وجود کا ہونا بغیر کے مقصد کے کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کی زندگی میں مقصد کے آنے سے آپ کی زندگی مکمل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر بننا، پائلٹ بننا، انجینئر بننا، نوکری کرنا وغیرہ وغیرہ یہ سارے جزوی مقاصد ہیں، یہ مکمل زندگی کا مقصد نہیں ہے۔

جب آدمی کا اپنے شوق کا کام کرتا ہے تو پھر اس کا کام بولتا ہے۔ پھر عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا فلاں شخص نے کیسے یہ غیر معمولی کام کر لیا۔ جیسے مائیکل انجیلو اتنی اچھی پینٹنگ بنا لیتا تھا کہ عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس نے ایک عام سے پتھر سے کیسے جوہر تخلیق کر لیا۔ قابل آدمی کیلئے ساری دنیا کھلی ہوئی ہے۔ اس کیلئے پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ملک کو قابل انسان کی ضرورت ہے۔ وہی لوگ رلتے ہیں جو قابل نہیں ہوتے، جو کچھ نہیں کر سکتے۔ جو انسان قابل ہے، اسے تو تلاش کیا جاتا ہے۔ مائیکروسوفٹ کمپنی میں دنیا کے ہر ملک کا آدمی کام کر رہا ہے۔ اس کمپنی نے تلاش کر کے ہر ملک میں سے قابل لوگ رکھے ہوئے ہیں اور انہیں اتنی زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے کہ ایک عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ قابل بنیں۔ آپ کا پاسپورٹ آپ کا کام بن جائے گا جبکہ ہم پاسپورٹ بنا کر پھرتے ہیں اور ہمارا ویزا ہی نہیں لگتا۔ آپ کا سب سے بڑا ویزا آپ کا ٹیلنٹ ہوتا ہے۔ اگر آپ میں ٹیلنٹ ہے تو ساری دنیا آپ کے پیچھے بھاگے گی۔

ہمارے ملک میں نو کروڑ نوجوان ہیں جن کو اس وقت سب سے زیادہ کامیابی کی ضرورت ہے۔ ہمارا ملک دنیا کے ان ملکوں میں شمار ہوتا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس ملک کے پاس یہ خزانہ ہو، وہ سب سے امیر ملک ہے۔ یہ سونے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ ہاں، اگر اس کی کوئی سمت ہو۔ تعلیم اگر آپ کے اندر ایک رتی کے برابر بھی فرق نہ پیدا کرے تو پھر ایسی تعلیم، تعلیم نہیں ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ڈگریاں تعلیمی اخراجات کی رسیدیں ہیں۔ زندگی میں اگر ترقی کرنی ہے تو رٹے کے تعلیمی نظام سے نکلیں۔ آپ کے رٹے کے نمبر شاید کسی کالج میں داخلہ تو دلوا دیں گے، مگر آپ میں اہلیت پیدا نہیں کریں گے۔ عملی دنیا میں سند کی نہیں، کام کی مانگ ہے۔ مثال کے طور پر، کمپنی کو وہ کارکن درکار ہوتا ہے جس میں اعتماد ہوتا ہے، جس کو اپنے کام میں مہارت ہوتی ہے، جو دیانت دار ہے۔ جس نے آپ کو کروڑوں روپے کی کمپنی آپ کے حوالے کر دی ہے اور

آپ کو لاکھوں روپے دیتے ہیں۔ اگر اسے آپ کی دیانت داری یا مہارت پر شک ہو جائے تو وہ آپ کو کبھی نہیں رکھے گا۔

تھامس اسٹینلے نے کئی سال تحقیق کے بعد لوگوں کے امیر ترین ہونے کی وجوہ نکالیں تو اس نے ان کی پہلی وجہ یہ بتائی کہ جو جتنا زیادہ دیانت دار ہے، وہ اتنی زیادہ ترقی کرتا ہے۔ تاریخ کا سب سے خوبصورت دور حضور اکرم ﷺ کا دور ہے۔ آپ اسے پڑھیں تو آپ کو پتا لگے گا کہ اخلاق، کردار اور اچھا معاملہ کرنے سے لوگ بدلتے ہیں۔ ایک صحابی ؓ آ کر پوچھتے ہیں، یارسول اللہ ﷺ، اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، "اچھی بات کرنا اور کھانا کھلانا۔" کیونکہ آپ جب بھی اچھی بات کرتے ہیں یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ ایک اچھے انسان ہیں۔ آپ کھانے کھلاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے، آپ سخی ہیں۔ تنگ دل انسان نہ کبھی اچھی بات کر سکتا ہے اور نہ کھلا سکتا ہے۔ اس کے پاس حوصلہ اور ظرف نہیں ہوتا۔ اللہ کے رسول ﷺ کا اتنا خوبصورت اخلاق تھا کہ وہ بڑھیا جو روز آپ ﷺ پر کوڑا پھینکتی تھی، وہ بھی کلمہ پڑھنے پر مجبور ہو گئی۔ کیا آپ ﷺ نے اسے تبلیغ کی؟ نہیں! آپ ﷺ نے اس کے ساتھ معاملہ اتنا اچھا کیا کہ اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ عرب میں بے شمار ایسے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ ایسا انسان ہم نے پوری دنیا میں دیکھا ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کا اخلاق اتنا اچھا تھا کہ اس اخلاق کی وجہ سے لوگ ایمان دار ہونا شروع ہو گئے۔ ہمیں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ برصغیر میں اسلام تبلیغ سے پھیلا ہے۔ یہ بات صحیح ہے، مگر ایک حصہ بتایا ہی نہیں جاتا کہ برصغیر میں اسلام جن لوگوں کی تبلیغ سے پھیلا، وہ انتہائی ایمان دار اور دیانت دار مسلمان تاجر تھے کہ جن کی وجہ سے اسلام پھیلا۔ جب مسلمان تاجر یہاں تجارت کرنے کیلئے آئے تو ہندو حیران ہوتے تھے کہ یہ عجیب لوگ ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ یہ گندم کی بوری ہے اوراوپر صحیح ہے لیکن نیچے ٹھیک نہیں ہے، اس لیے سستی بیچ رہے ہیں۔

جب ایک بندہ ایماندار ہوتا ہے تو پھر وہ اندر سے بھی وہی ہوتا ہے جو باہر سے نظر آتا ہے جبکہ بے ایمان اندر سے کچھ اور ہوتا ہے اور باہر سے کچھ اور ہوتا ہے۔ جس انسان کی لوگوں کے دلوں میں محبت موجود ہے، وہ انسان برا نہیں ہو سکتا۔ بغیر کسی وجہ کے اللہ تعالیٰ محبت نہیں ڈالتا۔ اللہ تعالیٰ اس کے خلوص کو دیکھتا ہے، اس کی نیت کو دیکھتا ہے، اس کی عاجزی کو دیکھتا ہے، اس کی ایمانداری کو دیکھتا ہے، اس کے جذبے کو دیکھتا ہے، اس کی محنت کو دیکھتا ہے، اس کی کوشش کو دیکھتا ہے۔ پھر وہ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیتا ہے۔ پھر ایسے بندے کے گرد میلہ ختم نہیں ہوتا۔ وہ کہیں بھی جاتا ہے، میلہ لگ جاتا ہے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے، لوگ اس سے ملنے کی جستجو کرتے ہیں۔ لوگ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کیلئے راستے کھلنے لگتے ہیں۔

جب بھی بندہ بے ایمان ہوگا، وہ اکیلا ہو جائے گا۔ کسی کو ایک بار دھوکا دیا جا سکتا ہے، بار بار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر آپ کو ترقی کرنی ہے تو پھر آپ ایماندار بن جائیں، دیانت دار بن جائیں۔ اور ایمانداری کا آغاز اپنی ذات سے ہوتا ہے۔

ساری چیزیں اعتبار سے چلتی ہیں۔ اعتبار کا مطلب ہے، قابل بھروسہ ہونا، کام کے قابل ہونا، مثبت ہونا۔ حضرت واصف علی واصفؒ سے کسی نے پوچھا کہ روحانیت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ آپؒ نے فرمایا، انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے پھر وہ ویسا ہی بن جاتا ہے۔ انسان کو اللہ والے سے محبت ہو گی تو وہ بھی اللہ والا بن جائے گا۔ انسان کی دنیا دار سے محبت ہو گی تو وہ دنیا دار بن جائے گا۔ انسان کی کسی منافق سے محبت ہو گی تو وہ منافق بن جائے گا۔

محبت ایک برتن سے دوسرے برتن میں صفات جانے کا نام ہے۔

پہلا کام خود کو تلاش کرنا ہے... اپنا مقصد تلاش کرنا۔ یہ آپ کو ایک دن میں نہیں ملے گا۔ جب آپ یہ سوال دل میں رکھ لیں گے تو پھر کبھی یہ سوال تہجد بن جائیگا، کبھی التجا بن جائے گا، کبھی آنسو بن جائے گا، کبھی استاد تک لے جائے گا، کبھی پیدل سفر کرائے گا، کبھی تجد سے

میں سر رکھ کر رونے پر مجبور کرے گا، کبھی ہاتھ اٹھانے پر مجبور کرے گا۔ کبھی آپ اس کیلئے کتابیں پڑھیں گے۔ جب تک یہ سوال آپ کے اندر نہیں ہوگا، اس کا جواب نہیں ملے گا۔

آپ میں جتنی خوبیاں ہوں گی، اتنی آپ کو ترقی ملے گی۔ محنتی انسان کے راستے آسان ہو جاتے ہیں۔ اسے اللہ تعالیٰ ضرور نوازتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی کی نہ محنت ضائع کی ہے اور نہ کسی کی محبت ضائع کی ہے۔ محبت کا مطلب ہے، شوق۔ آپ کبھی پھل دار باغ میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ پھل دار درخت پر خاصی ٹہنیاں ہیں۔ ان میں کچھ کو پھل لگا ہوا ہے اور کچھ کو نہیں لگا۔ جس ٹہنی پر پھل لگا ہوگا وہ ٹہنی باریک سی اور جھکی ہوئی ہوگی۔ اس میں لچک ہوگی۔ اور درخت کا جو حصہ اکڑا ہوا ہوگا، اس میں پھل نہیں لگا ہوگا۔ اس سے آپ کو پتا چلے گا کہ زندگی میں لچک ہونی چاہیے۔ اگر آپ نے فائدہ مند، قیمتی اور قابل انسان بننا ہے تو پھر آپ زندگی میں جھک جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجز بن جائیں۔

پیسہ کمانا مشکل نہیں ہے، عزت کمانا بہت مشکل ہے۔ جب آپ کچھ کر کے دکھاتے ہیں تو پھر آپ کو اس کے صلے میں عزت ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں، "تم میں سے ہر شخص گڈریا ہے۔ اس کا ایک ریوڑ ہے۔ اس کا حساب اسے دینا ہے۔" عزت کیلئے محنت کیجیے۔ عزت کیلئے اچھے کام کیجیے۔ عزت کیجیے دوسروں کی عزت کیجیے۔ کبھی کبھی وضو کر کے اکیلے بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے بات ضرور کیا کیجیے۔ یہی عمر اللہ تعالیٰ سے تعلق بنانے کی ہے۔ جس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے، اس کا اس بات پر بھی ایمان ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ محنت کا صلہ دیتا ہے۔ وہ اتنی شان والا ہے کہ وہ کہتا ہے، کوئی میری طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو میں اس کی طرف دس قدم اٹھاتا ہوں۔ آپ جب واقعی سچی نیت کے ساتھ ارادہ کر کے گھر سے کتابیں لے کر نکلتے ہیں تو آپ کیلئے آسانیاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ یاد رکھیے، آپ کی سند پر اللہ تعالیٰ کے کرم کے نمبر نہیں ہوتے۔ یہ آپ کے اندر محسوس ہوتے ہیں۔ یہ زندگی میں جگہ جگہ محسوس ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ کبھی اللہ تعالیٰ

سے مانگو تو اپنی اوقات دیکھ کر نہ مانگنا۔ اللہ تعالیٰ سے جب بھی مانگنا تو اس کی شان دیکھ کر مانگنا۔

اپنی زندگی کو بہترین بنائیے

دو طرح کے طالب علم ہوتے ہیں۔ کچھ پڑھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ رو رہے ہوتے ہیں کہ مجھے اسکول جانا پڑتا ہے، ساتھ ٹیوشن بھی لینی پڑتی ہے۔ آٹے میں نمک کے برابر وہ طالب علم ہوتے ہیں جو نوکری کے ساتھ ساتھ پڑھ بھی رہے ہوتے ہیں اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ ہماری پوری زندگی میں ایک حصہ پڑھنا، ایک حصہ انجوائے کرنا، ایک حصہ لوگوں کے ساتھ تعلقات، ایک حصہ عبادات، ایک حصہ دوست جبکہ ایک حصہ شوق ہوتا ہے۔ جو طالب علم اپنی تعلیم کو منظم نہیں کر سکتا وہ زندگی کے باقی حصوں کو بھی منظم نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کو بہتر نہیں کیا ہوتا۔

جب تک آپ قابل نہیں بنیں گے، تو جیسے ہی بوجھ اٹھائیں گے، گر جائیں گے۔ جب قابل ہو جائیں گے تو پھر بڑے بڑے بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جائیں گے۔ ضرور پڑھیں، مگر ساتھ انجوائے بھی کریں۔ لوگوں کے ساتھ تعلقات بھی بنائیں، عبادت بھی کریں، دوستوں کے ساتھ وقت گزاریں اور اپنے شوق کو بھی برقرار رکھیں۔ مہینے میں ایک دفعہ مل کر باہر سے کھانا ضرور کھایا کریں۔ اس سے بندہ تر و تازہ ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی دوستوں کے ساتھ گپ شپ ہو جاتی ہے۔ آپ کے جو بھی شوق ہیں، انہیں ضرور پورا کیا کیجیے۔ ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کریں۔ اگر صرف پڑھائی کرتے رہیں گے تو پھر اکتا جائیں گے۔ متوسط طبقے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ تر کی سوچ چھوٹی ہوتی ہے۔ انہیں اگر کہا جائے کہ دنیا کہاں تک پہنچ چکی ہے تو وہ آگے سے یہ جواب دیتے ہیں کہ رہنے دیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ زمانہ کہاں پہنچ چکا ہے۔

آپ کچھ چیزوں کو تھوڑا تھوڑا وقت دینا شروع کیجیے۔ آپ میں بہتری آنا شروع

ہو جائے گی۔ ایک طالبعلم کے چہرے پر خوشی ہونی چاہیے۔ اسے اداس نہیں ہونا چاہیے۔ دل زندہ رہنا چاہیے۔ آدمی کو اندر سے خوش رہنا چاہیے۔ اس کے پاس بات کرنے کو ہے نیک ہوں۔ اسے چلنا، کھانا پینا اور پہننا آتا ہو۔ جب آپ ان کاموں کو اپنی زندگی کا حصہ بناتے ہیں تو پھر آپ کے خواب بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب خواب بننا شروع ہو جاتے ہیں تو ساتھ ہی زندگی بدلنا شروع ہو جاتی ہے۔ قابل بننے کا خواب دیکھو گے تو قابل ہو گے اور قابل ہو گے تو زندگی میں آگے بڑھو گے۔ زندگی کو بہتر بنانے کیلئے اپنی سوچ کو بیدار رکھیے۔

کامیابی کے بارے میں سوچنا

سوچ ایک بیج ہے۔ بیج لگایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ایک چھوٹی سی کونپل نکلتی ہے، پھر وہ پودا بن جاتا ہے، پھر پودا درخت بن جاتا ہے، پھر وہ درخت دو نتیجے دیتا ہے۔ ایک چھاؤں اور دوسرا پھل۔ کامیابی کی چھاؤں لینے اور پھل کھانے کیلئے سب سے پہلی چیز بیج ہے اور وہ بیج سوچ ہے۔ تحقیق کے مطابق دنیا کے کسی بھی شعبے میں کامیابی اس کو ملتی ہے جو کامیابی کے بارے میں سوچتا ہے جو بچے نالائق رہ جاتے ہیں، جن کے نمبر نہیں آتے انہوں نے کبھی کامیابی کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہوتا۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کامیابی کتنی بڑی چیز ہے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ نمبر آنے سے کیا عزت ملتی ہے۔ نمبر آنے سے کہاں کہاں داخلہ مل سکتا ہے۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں ہوتا کہ اچھے نمبر آنے سے ہماری کتنی شناخت بنے گی۔ جب بھی نالائق بچوں کو کہا جاتا ہے کہ آپ کامیابی کے بارے میں سوچیں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم کیوں سوچیں؟ یا پھر کوئی چیز ان کی زندگی میں نہیں آتی جو انہیں سوچنے پر مجبور کر دے۔ زندگی میں ہمیں ایسی چیزیں چاہیے ہوتی ہیں جو ہمیں سوچنے پر مجبور کریں کہ تم نے کامیاب ہونا ہے۔ سوچنے والے ذرائع یہ ہیں:

1- مطالعہ

استاد کے لیکچر، استاد کی موٹیویشن (تحریک)، استاد کی باتیں جو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ کامیاب ہونا ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ بچوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ انہیں سوچنے پر مجبور کرے۔

2- کامیاب لوگوں کی کہانیاں

آپ کے اردگرد کتنے ہی بچے ایسے ہوتے ہیں جن کے بہت اچھے نمبر آئے ہوتے ہیں۔ انہوں نے بورڈ میں پوزیشن لی ہوتی ہے۔ ان کی کامیابی آپ کو موٹیویٹ کرتی ہے۔ لائق بچہ ہوتا ہے تو وہ کامیابی کے بارے میں بار بار سوچتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر یہ لڑکا کامیاب ہو سکتا ہے، وہ لڑکا کامیاب ہو سکتا ہے تو میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکتا۔

3- حالات

بعض اوقات حالات ایسے بن جاتے ہیں کہ آپ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پڑھائی ممکن نہیں ہے۔ غریب کے بچے کے پاس پڑھائی کے وسائل نہیں ہوتے تو اس کے گھر والے کام پر بٹھا دیتے ہیں۔ امیر کا بچہ اگر نہیں پڑھے گا تو وہ اسے کاروبار کرا دیں گے، باہر بھیج دیں گے۔ مگر جو بچہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہے، اس کے پاس پڑھائی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ وہ بچہ جو عام گھر سے تعلق رکھتا ہے اور پھر بھی اپنی کامیابی کے بارے میں نہیں سوچتا، وہ بڑا ظالم ہے۔

سوچ سے یقین بنتے ہیں۔ یقین سے توقعات بنتی ہیں۔ توقع سے رویہ بنتا ہے۔ رویہ سے برتاؤ تشکیل پاتا ہے۔ جس سے کارکردگی میں بہتری آتی ہے۔ اور جب کارکردگی بدل جائے تو انسان کی زندگی بدل جاتی ہے۔ اگر آپ کامیابی کے بارے میں سوچتے نہیں ہیں، نہ پڑھتے ہیں، نہ بات کرتے ہیں، پھر کامیابی کا خیال نہیں آئے گا۔ جب یہ خیال نہیں آئے گا تو کامیابی کا یقین بھی نہیں بنے گا۔ یقین نہیں بنے گا تو توقع نہیں بنے گی۔ توقع نہیں بنے گی تو پھر وہ رویہ نہیں بنے گا، پھر برتاؤ نہیں بنے گا، پھر کارکردگی بھی نہیں بنے گی۔ جب

کارکردگی نہیں ہوگی تو پھر زندگی نہیں بدلے گی۔ اگر آپ کے پاس سوچ ہے تو پھر وہ سوچ آپ کی زندگی کی ہر شے پر حاوی ہو جائے گی۔ آپ لازماً سوچیں گے کہ میں نے آگے بڑھنا ہے۔ جو آدمی اپنی سوچ بدلتا ہے، اس کی زندگی بدل جاتی ہے۔ کیوں کہ زندگی کی تبدیلی کا آغاز، سوچ کی تبدیلی سے ہوتا ہے۔

ہر انسان اپنی سوچ کے اعتبار سے مختلف ہے۔ ہم سب انسان بہ ظاہر برابر ہیں، مگر سوچ کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ اسی لیے کارکردگی بھی مختلف ہے اور اسی طرح زندگیاں بھی مختلف ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بچے نے کبھی کامیابی کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہے اور اسے کامیابی مل جائے اور یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک بچہ صرف سوچتا ہی کامیابی کے بارے میں ہے، اسے لازمی کامیابی ملے گی۔ گھر کے ایک فرد کو انجن بننا ہوتا ہے، باقی ڈبے بن جاتے ہیں۔ گھر کا ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو کامیاب ہو کر سب کو کامیاب کر دیتا ہے۔ وہ آپ بن جائیں۔ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اگر آپ نے اپنی زندگی کو بدلنا ہے اور پڑھائی میں آگے جانا ہے تو آپ اپنی پڑھائی کے بارے سوچنا شروع کیجیے۔ اپنی کامیابی کے بارے ضرور سوچیے۔ سوچ کو بدلنے کیلئے فہرست بنائیں:

1- میں نے کامیاب ہونا ہے
2- میں نے اعلیٰ نمبر لینے ہیں
3- میرے والدین خوش ہوں گے
4- مجھے عزت ملے گی
5- مجھے شناخت ملے گی
6- مجھے اچھے کالج میں داخلہ ملے گا
7- میری زندگی بدل جائے گی

سوچ ایک مقناطیس ہے۔ یہ اپنی طرح کی چیزوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جب آپ

کامیابی کے بارے میں سوچتے ہیں تو شعاعیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں اور کامیابی آپ کی طرف آنا شروع ہو جاتی ہے۔ جب آپ بار بار سوچتے ہیں تو آپ کو ایسے استاد مل جاتے ہیں، نوٹس مل جاتے ہیں، اکیڈمی مل جاتی ہے، کوچ مل جاتے ہیں جو آپ کی کامیابی میں معاون ہوتے ہیں۔ جب آپ زندگی میں کبھی پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اگر میری سوچ نہ بدلتی تو آج میں اتنا کامیاب نہ ہوتا۔ اپنی کامیابی کو اپنے دماغ میں بٹھائیں۔ پھر وہ کامیابی دنیا میں بھی آپ کی زندگی کا حصہ بنے گی۔

پڑھائی کیسے کی جائے

منفی سوچ ہمیں معاشرے سے ملتی ہے، کیونکہ ہم ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں بہت زیادہ مسائل ہیں۔ ہمارا معاشرہ تعلیم کی طرف گیا ہے، تربیت کی طرف نہیں گیا۔ تعلیمی اداروں سے نکلنے کے بعد بچے کی یادداشت بڑھ جاتی ہے، مگر اس کی تربیت میں فرق نہیں پڑتا۔ شعوری کوشش سے زندگی میں مثبت تبدیلی لے کر آیئے۔ اس کیلئے کتابیں پڑھا کیجیے۔ جو اساتذہ کرام اچھی سوچ دیتے ہیں، ان کے پاس بیٹھا کیجیے۔ دنیا ای لرننگ پر جا چکی ہے۔ آنے والا وقت انٹرنیٹ کا ہے۔ ہر موضوع پر لیکچرز کی بھرمار انٹرنیٹ پر ہے۔ آپ اپنی سوچ کو بہتر کرنے کیلئے انٹرنیٹ سے لیکچر سنئے۔ اس سے مثبت سوچ آئے گی۔ ایسی اچھی جگہ تلاش کیجیے جہاں علمی ادبی مجالس ہو رہی ہوں۔ ان میں جائیں۔ اس سے آپ کا ذہن کھلے گا۔ پڑھنے کیلئے وقت نکالنے کا آسان حل یہ ہے کہ اپنے آپ پر غور کیجیے۔ قدرت ہر انسان کو پرائم ٹائم دیتی ہے۔ جدید ریسرچ بتاتی ہے کہ سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ انسان کی توانائی کی سطح (انرجی لیول) بھی طلوع ہوتی ہے، یعنی جیسے جیسے سورج بلند ہوتا ہے، ویسے ویسے انسان کی جسمانی اور ذہنی توانائی کی سطح بھی بلند ہوتی ہے، یہاں تک کہ صبح نو سے دس بجے کے درمیان اپنی انتہا پر ہوتی ہے۔ سورج کے زوال کے وقت تقریباً بارہ بجے کے قریب انسان کی توانائی کی سطح پست ترین سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ کامیاب اور ذہین لوگوں

کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ دیر تک نہیں سوتے، صبح سویرے اٹھتے ہیں اور اپنے کام شروع کر دیتے ہیں۔

کچھ چیزیں صرف رٹا ہی ہوتی ہیں۔ انہیں سمجھ کر یاد نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر، ہندسے، فارمولے، پہاڑے، معلومات عامہ وغیرہ مثلاً پاکستان کب بنا تھا؟ جو چیزیں صرف رٹا ہی ہیں انہیں ضرور دہرائیں، کیونکہ رٹنے کے بھولنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن جو چیز آپ سمجھ کر یاد کرتے ہیں، وہ جلدی نہیں بھولتے۔ مثال کے طور پر، آپ سائیکل چلاتے ہیں۔ یہ ایک صلاحیت ہے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ سائیکل کس طرح چلانی ہے۔ آپ کو کبھی کتاب کھول کر یہ نہیں دیکھنا پڑتا کہ مڑنا کب ہے، کب بریک لگانی ہے۔ جن چیزوں کو سمجھا جاتا ہے انہیں یاد نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن جو چیزیں رٹا لگا کر یاد کی ہوتی ہیں انہیں بار بار دہرائیں ورنہ ممکن ہے، پیپر کے دوران آپ بھول جائیں۔ بہت سوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ صرف رٹنے سے ایک نقصان نہیں ہوتا بلکہ زندگی میں خوبصورتی نہیں رہتی۔ رٹنے والا طالبعلم بہت آگے نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر، ابو بن عدم ایک نظم ہے جو میٹرک میں پڑھی جاتی ہے۔ اسے رٹا لگا کر دس میں سے دس نمبر لیے جا سکتے ہیں، لیکن آپ نے اسے سمجھا نہیں ہے تو پھر آپ اچھے انسان نہیں بنیں گے۔ یہ نظم اس لیے کورس میں ڈالی گئی ہے کہ پڑھنے والا زندگی میں دوسروں کے کام آنا سیکھے۔ اگر آپ دوسروں کے کام نہیں آئیں گے تو آپ کبھی بھی سبق سے کوئی بھی چیز سیکھ نہیں سکیں گے۔

فوکس کو مستقل کرنا

جب طالب علم کالج یا یونیورسٹی کی زندگی میں آتے ہیں تو اس وقت عموماً اپنے آپ کو سمجھنا شروع کرتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ میری یادداشت کیسی ہے، میں زبان کیسے سیکھتا ہوں، میں سبق کو یاد کیسے کرتا ہوں، اس کا طریقہ کار کیسے بہتر کیا جا سکتا ہے، میں اپنی تعلیم کیسے بہتر کر سکتا ہوں، میں خود کو کیسے بہتر کر سکتا ہوں، وہ کیا چیزیں ہیں جو مجھے فکر

مند رکھتی ہیں۔

فوری طور پر یہ تلاش کیجیے کہ ہمارے اندر کیا چیز ہے جو ہمیں فوکس سے ہٹا دیتی ہے۔ وہ زیادہ تر فکر مندی ہو سکتی ہے، غیر یقینی ہو سکتی ہے، مقصد کا واضح نہ ہونا ہو سکتا ہے، کنفیوژن ہو سکتی ہے یا پھر کوئی پریشانی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اسے پکڑ لیتے ہیں تو آپ کا فوکس زیادہ ہو جائے گا اور آپ زیادہ دیر تک یہ کام کر سکتے ہیں۔

جب آپ کوئی چیز کو یاد کرتے ہیں تو آپ کا دماغ کسی اور طرف چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، آپ نے اچھی طرح فوکس کی پریکٹس نہیں کی، کیونکہ فوکس بذات خود ایک پریکٹس ہے۔ جب آپ ایک کام کو بار بار کرتے ہیں تو آپ اس میں ایکسپرٹ ہو جاتے ہیں۔ ایک آدمی جو بیس سال سے مچھلیاں پکڑ رہا ہے اور پھر بھی اچھے طریقے سے مچھلیاں نہیں پکڑ پاتا تو وہ قصوروار ہے۔ اگر آپ نے کلاس ون سے لیکر سولہ تک پڑھا ہے، پھر بھی آپ کو پڑھنا نہیں آتا تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے پڑھنا سیکھا ہی نہیں ہے۔ ہمیں سیکھنا چاہیے کہ پڑھنا کیسے ہے۔ اس کا تعلق آپ کی ڈگری سے نہیں ہے۔ آپ گوگل پر جا کر سرچ کیجیے کہ فوکس کس طرح رکھنا ہے۔ آپ کو کئی ویڈیوز مل جائیں گی جو اس سلسلے میں آپ کی مدد کریں گی۔ فوکس پریکٹس سے آتا ہے یا پھر وجہ تلاش کریں۔

آپ ان چیزوں کو اپنی زندگی سے نکال دیں جو آپ کی توجہ دوسری طرف مبذول کراتی ہیں، جیسے ٹی وی دیکھنا، سوشل میڈیا کا بہت زیادہ استعمال وغیرہ۔ توجہ اس کی ہوتی ہے جس کے پاس توجہ کو خراب کرنے والی چیزیں کم ہوتی ہیں۔ دوسرے، اس کام میں دلچسپی ہونا ضروری ہے۔ آپ کسی بھی کلاس میں پڑھ رہے ہیں، آپ اپنی پڑھائی کے فائدے لکھیں کہ یہ پڑھائی مجھے کیا کیا فائدہ دے سکتی ہے۔ مجھ پر کون سی کون سی ذمہ داریاں ہیں جن کو مجھے پورا کرنا ہے اور وہ ذمے داریاں صرف پڑھائی کرنے سے ہی پوری ہو سکتی ہیں۔ یا مجھے پڑھائی کے ساتھ اور بھی کوئی کام کرنا پڑے گا۔ جب آپ یہ فائدے لکھ لیتے ہیں تو پھر آپ

کی توجہ برقرار رہنا شروع ہو سکتی ہے۔

اپنی زندگی میں شوق پیدا کیجیے۔ شوق پیدا کرنے کیلئے ان لوگوں کے ساتھی بنیں جو شوق پیدا کرتے ہیں، جو پڑھنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ اپنی پڑھائی کے ٹارگٹ بنائیں، کیونکہ جب آپ ٹارگٹ کے ساتھ پڑھائی کرتے ہیں تو اس سے آپ کی توجہ برقرار رہتی ہے۔ ہمارے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ ہم اس شخص کی طرح ہوتے ہیں جو بس میں بیٹھ جاتا ہے۔ بس سولہ منٹ چلتی ہے اور سولہ منٹ کے بعد ہمیں پتا چلتا ہے کہ بس کہیں اور جا رہی ہے۔ ہمارے ملک میں سولہ سال مکمل ہو جاتے ہیں، بچے کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ اسے جانا کدھر ہے۔ بچے دوسروں کے کہنے پر پڑھتے جاتے ہیں، جبکہ شوق کہیں اور ہوتا ہے۔ سب سے پہلے آپ یہ دیکھیں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ زمانے کو چھوڑیں۔ اپنے اندر سے تلاش کریں جس کے بارے میں دانشوروں نے کہا کہ آپ کے سوالوں کا جواب آپ کے اندر موجود ہے۔ جب آپ اپنے اندر سے جواب لیتے ہیں تو آپ کی توجہ برقرار رہتی ہے۔

روایتی تعلیم کی مہارت کی طرف منتقلی

دنیا میں تعلیم کا سارا نظام روایتی تعلیم سے مہارت کی طرف چلا گیا ہے۔ دنیا میں آئی کیو کے سارے نظریے ختم ہو چکے ہیں۔ 1986ء میں ہاورڈ گارڈنامی ایک سائنس داں نے کثیر ذہانت کا نظریہ (Theory of Multiple Intelligence) پیش کیا جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ سارے تعلیمی نظام اس نظریے پر شفٹ ہو گئے۔ اس کا نظریہ تھا کہ دنیا کے ہر انسان میں نو ذہانتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ کم بھی ہو سکتی ہیں اور زیادہ بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں ایک نمایاں ہوتی ہے تو باقی اس کی معاونت کرتی ہیں۔

ہمارا تعلیمی نظام رٹے اور نمبروں پر چل رہا ہے۔ ہمارے ہاں اس کو اچھا سمجھا جاتا ہے جس کے نمبر زیادہ آتے ہیں اور گولڈ میڈل ملتا ہے۔ آپ پچھلے دس سال گولڈ میڈل لینے والے بچوں پر ریسرچ کیجیے اور دیکھیے کہ وہ اگلے بیس سال کہاں پر ہیں، تو آپ حیران ہوں

جائیں گے کہ گولڈ میڈل لینے بچے زندگی کے اہم عہدوں تک نہیں جا سکے۔ کبھی بھی کوئی کمپنی نہیں چاہے گی کہ وہ اپنی کمپنی کا ہیڈ اس شخص کو بنائے جس میں لیڈرشپ کی صلاحیت نہیں ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس بچے نے لیڈر کے طور پر کیا کیا۔ اگر یہ پہلے اچھا کام دکھا چکا ہے تو پھر یہ یہاں پر بھی کام کر سکے گا۔

ہم نے بھی تعلیم کے اس سارے نظام کو مہارت پر منتقل کرنا ہے، کیونکہ دنیا کا پورا انظام مہارت پر منتقل ہو گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بچے کو ضرور پڑھائیں، لیکن اس کے اندر گیارہ صلاحیتیں پیدا کریں جو اس کی زندگی میں کام آتی ہیں۔ دنیا میں آج یہ گیارہ صلاحیتیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ دنیا میں سب سے اہم چیز اخلاق ہے جس نے آج تک راج کیا ہے۔ دنیا میں آج تک بددیانتی کو اچھا نہیں کہا گیا، یہاں تک کہ بددیانتی کرنے والا بھی کہتا ہے کہ میری ٹیم دیانت دار ہونی چاہیے۔

امتحان لینے والے کی اپروچ

آپ روز تیرنا سیکھتے رہیں۔ جب سال کے آخر میں امتحان لینے والا کہے کہ بھاگ کر دکھاؤ تو آپ کا جواب ہوگا کہ مجھے تو دوڑنا نہیں آتا۔ میں نے تو سارا سال تیراکی کی تیاری کی ہے۔ اسی طرح بہت سارے بچے جیسی تیاری کرتے رہتے ہیں ان کی وہ چیزیں چیک ہی نہیں ہوتی ہوتیں کہ جن پر ان کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ سب سے پہلے سوالیہ پیپر تیار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک جوابی گائیڈ تیار ہوتی ہے۔ سوالیہ پیپر اور گائیڈ دونوں بورڈ میں دی جاتی ہیں تاکہ جب پیپر چیک کیا جائے تو اس جواب کو مدنظر رکھ کر چیک کیا جائے۔ بچوں میں ایک سوچ یہ بھی پائی جاتی ہے کہ امتحان لینے والا میرا دشمن ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس کا کام تو صرف پیپر چیک کرنا ہوتا ہے۔ اگر اچھا پیپر ہے تو نمبر مل جاتے ہیں اور اگر نہیں تو پھر نمبر نہیں ملتے۔ ایسے بہت سارے بچے ہیں جنہوں نے مشکل حالات میں بھی اچھے نمبر لیے۔ اس کا مطلب ہے اگر ہر بچہ سوالوں کے صحیح جواب دے تو اچھے نمبر آ سکتے

ہیں۔ امتحان لینے والے کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ یہ کس کا پیپر ہے۔ اس کو تو صرف یہ پتا لگتا ہے کہ یہ کسی لائق طالب علم کا پیپر ہے یا نالائق طالب علم کا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ خون کا ٹیسٹ دیں تو ساتھ تصویر نہیں جاتی، لیکن جب رپورٹ آتی ہے تو وہ آپ کے خون کی ہوتی ہے۔ اسی طرح جو نتیجہ آتا ہے، وہ آپ کا ہی ہوتا ہے۔ درج ذیل چیزیں وہ بیان کی گئی ہیں جن کا بچے خیال نہیں رکھتے، اور پھر نمبر کم آتے ہیں:

1- پیپر کی پیشکش

امتحان لینے والا یہ دیکھتا ہے کہ بچے نے پیپر کس طرح پیش کیا ہے۔ یاد رکھیے، اگر آپ کو پیپر پیش کرنا نہیں آتا تو آپ جتنے مرضی لائق ہیں، نمبر اچھے نہیں لے سکتے۔ پاس ہو جائیں گے، گزارا بھی ہو جائے گا، مگر اے ون پر جانے کیلئے آپ کو پرچہ بہت اچھا پیش کرنا آنا چاہیے۔ امتحان دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ بچے نے لائنیں لگائی ہیں، کیا لائن ایک سائیڈ پر تو نہیں لگائی، کیا لائن سیدھی اور خوبصورت ہے۔ بچہ پیپر چیک کرنے والے کو پیپر چیک کرنے میں جتنی سہولت دے گا وہ اتنے زیادہ نمبر دے گا۔ سوال نمبر صحیح جگہ پر لکھیے۔ ہیڈنگ صحیح جگہ ڈالیے۔ جو سوال پوچھا گیا ہے، صرف اسی کا جواب دیں۔ غیر ضروری جواب نہ دیں۔ جتنے سوالوں کے جواب مانگے گئے ہیں، صرف اتنے سوالوں کے جواب دیں۔ مثال کے طور پر، آٹھ سوالوں میں سے چار کے جواب دینے ہیں اور آپ پانچ کے دے آتے ہیں۔ آپ یہ سوچ کر زیادہ جواب دے آتے ہیں کہ شاید امتحان لینے والا پانچوں کو چیک کر کے ان میں سے جو چار سب سے اچھے ہیں، ان کے نمبر لگائے گا۔ ایسا نہیں ہے۔ وہاں اصول ہے کہ پہلے چار کو چیک کرتا ہے۔ اگر پانچواں ہے تو اس کو کراس کر دیں، کیونکہ پوچھا ہی چار کا گیا تھا۔

2- صفائی/لکھائی

امتحان لینے والا دیکھتا ہے کہ بچے نے پیپر کتنا صاف ستھرا رکھا ہے۔ بچوں کو پیپر صاف

رکھنا ہی نہیں آتا۔ کئی بچوں کے پیپر پر جگہ جگہ سیاہی گری ہوتی ہے۔ کئی بچوں کے ڈایا گرام صحیح نہیں ہوتے۔ پرچہ ہمیشہ معیاری ہونا چاہیے۔ ڈایا گرام مناسب سائز کا ہونا چاہیے۔ ڈایا گرام چھوٹی اور درمیان میں ہو۔ امتحان لینے والا دیکھتا ہے کہ پیپر پڑھنے کے قابل ہو، اس لیے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اگر صاف لکھا ہوگا تو مجھے پڑھنے میں آسانی ہوگی۔ جس کی لکھائی صاف نہیں ہوتی، اس کیلئے امتحان لینے والے کی اپروچ اچھی نہیں ہوتی۔ پیپر میں آپ نظر نہیں آتے بلکہ آپ کی لکھائی نظر آتی ہے۔ اگر آپ کی لکھائی اچھی ہے تو پھر آپ کے نمبر بھی اچھے آئیں گے۔

3- زیادہ شیٹیں

امتحانی پیپر چیک کرنے والا بے وجہ شیٹیں لگانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک استاد ہے۔ اس نے بچوں سے زیادہ پڑھایا ہوتا ہے۔ اس کا بچے کی عمر سے زیادہ پیپر چیک کرنے کا تجربہ ہوتا ہے۔ بورڈ نے صرف اس پیپر چیک کرنے کیلئے رکھا ہوتا ہے۔ بے وجہ شیٹیں لگانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچے نے پیپر کی دونوں سائیڈوں پر بہت زیادہ جگہ چھوڑی ہوتی ہے۔ درمیان میں جو جگہ لکھنے والی ہوتی ہے، اس میں بھی تھوڑا لکھا ہوتا ہے۔ پھر وہ ایک ایک لائن چھوڑ کر لکھتا ہے۔ صفحے کے شروع میں جب جواب ختم ہوتا ہے تو اگلے صفحے پر جواب لکھا ہوتا ہے۔ پورا صفحہ خالی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اصول یہ ہے کہ اگر پچاس فیصد سے زیادہ صفحہ استعمال ہو چکا ہے تو پھر چھوڑ دیں، لیکن اگر اس سے کم استعمال ہوا ہے تو پھر نیا سوال اسی صفحے پر شروع کیجیے۔ کبھی بے وجہ زیادہ شیٹیں نہ لگائیں۔ امتحان لینے والا آپ کی صلاحیت کو دیکھتا ہے۔ اس نے وزن کے نمبر نہیں دینے۔ اس نے دیکھنا ہے کہ آپ کا علم کتنا ہے اور اس پر آپ کی گرفت کتنی ہے۔

4- تین گھنٹے میں خود کو ثابت کرنا

امتحان لینے والا، بچے کو دیکھتا ہے کہ میں آپ کو تین گھنٹے دے رہا ہوں اور آپ ان تین

گھنٹوں میں ثابت کریں کہ آپ لائق ہیں۔ لائق بچہ سمجھ جاتا ہے کہ میں نے ثابت کرنا ہے کہ میں لائق ہوں۔ نالائق بچہ کہتا ہے، کوشش کروں گا، گزارا کروں گا، دیکھوں گا۔ جبکہ امتحان لینے والا کہتا ہے کہ تم کوشش کرو۔ اگر تم نے واقعی اچھا کیا ہے تو میں تمہیں نمبر دوں گا۔ اگر آپ واقعی لائق ہیں تو وہ آپ کو نمبر ضرور دیتا ہے۔ وہ کبھی نہیں برداشت کرتا کہ بعد میں اس کا ضمیر ملامت کرے۔ وہ آپ کو نمبر دینے کیلئے بیٹھا ہے

5- بے مقصد لکھنا

فرض کیجیے، امتحان لینے والا پوچھتا ہے کہ نیوٹن کا پہلا قانون کیا ہے۔ بچہ یہ جواب دیتا ہے کہ نیوٹن کا پہلا قانون یہ ہے، دوسرا قانون یہ ہے، تیسرا قانون یہ ہے۔ پھر اس کے مرنے کی تاریخ بھی لکھ دیتا ہے۔ کبھی بھی امتحان لینے والا ایسے بچے کو اچھا نہیں سمجھتا جو ضرورت سے زیادہ لکھتا ہے۔ بہت سے بچوں کے ذہن میں یہ بات ہے کہ جتنا زیادہ لکھا جائے، اتنے زیادہ نمبر آتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ امتحان لینے والا ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ سوال کے مطابق جواب ہے یا نہیں ہے۔ اسی طرح، بہت سے بچے ایسا لکھتے ہیں کہ اگر اسے پڑھا جائے تو خود انہیں بھی سمجھ نہیں آئے گا کہ انہوں نے کیا لکھا ہے۔ امتحان لینے والا سوچتا ہے کہ اگر یہ خود بھی پڑھے تو اس کو سمجھ نہ آئے، میں اس کو کیا نمبر دوں۔ ہمیشہ چیک کیجیے کہ جو پیپر آپ نے دیا ہے، کیا آپ کو سمجھ آ رہا ہے؟ اس کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ پیپر مکمل کرنے کے بعد اسے استاد کے حوالے کرنے سے پہلے دس منٹ لگائیں اور سارے پیپر کو دوبارہ پڑھیں۔ اسے عادت بنائیں۔ پورا سال اس کی مشق کیجیے۔ کلاس کے جتنے بھی ٹیسٹ ہوں، ان میں یہی کام کیجیے پیپر پڑھ کر دیا کریں۔

6- ذہنی طور پر تیار ہونا

ہمیشہ ذہنی طور پر تیار ہو کر پیپر دیجیے۔ امتحان لینے والے کو وہ بچہ متاثر کرے گا جو پہلے سے تیار ہوگا کہ مجھے اچھے نمبر لینے ہیں۔ میں نے گزارا نہیں کرنا۔ مجھے پہلے سے تیاری رکھنی

ہے۔ مجھے پریکٹس پہلے سے کرنی ہے تاکہ پیپر میں مجھے کسی تنگی اور مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جس بچے کی یہ اپروچ ہوگی، وہ زیادہ نمبر لے گا۔ جو بچہ اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا وہ زیادہ نمبر نہیں لے سکتا۔

7- ترتیب سے پیپر کرنا

امتحان لینے والے کو وہ بچہ متاثر کرتا ہے جس نے سوالوں کے جواب مکمل دیئے ہوں، یعنی ایک سوال مکمل ہونے کے بعد لائن لگائی ہوتی ہے، پھر اس کے بعد دوسرا سوال شروع کیا ہوتا ہے۔ کئی بچے ایک سوال کو شروع کرتے ہیں، اسے درمیان میں ہی چھوڑ کر اگلا سوال شروع کر دیتے ہیں۔ اسے ختم کرنے کے بعد پھر پہلے سوال پر آ جاتے ہیں۔ اس وقت پیپر پر جگہ نہیں ہوتی۔ پھر وہ اسٹار لگا کر لکھ دیتے ہیں کہ اس سوال کا مزید جواب فلاں صفحہ پر ہے۔ یہ انداز اس کی ترتیب خراب کر دیتا ہے۔ پیپر چیک کرنے والا جھنجلا جاتا ہے۔ جب آپ ترتیب سے پیپر کرتے ہیں تو امتحان لینے والے کو سہولت ملتی ہے۔ وہ پیپر چیک کرتے ہوئے آسانی محسوس کرتا ہے اور جب اسے سہولت ملتی ہے تو پھر آپ کے نمبر زیادہ آتے ہیں۔

8- اپروچ کو سمجھنا

بچہ امتحان لینے والے کی اپروچ کو تب سمجھ سکتا ہے کہ جب بچہ عادت بنائے کہ کلاس میں بیٹھ کر جب بھی پیپر دے گا وہ یہ سوچ کر پیپر دے گا کہ اگر اس کو امتحان لینے والا پڑھے تو کیا پڑھے۔ جو بچہ یہ دیکھتا ہے کہ امتحان لینے والا کیا دیکھے گا، وہ بچہ بہتر ہونے لگتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، جو بچے اپنی غلطیاں خود ٹھیک کرتے رہتے ہیں، وہ بہتر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو اپنی غلطیاں خود نہیں ٹھیک کرتے، تو بورڈ میں اُن کے نمبر کٹتے ہیں۔ جس بچے نے بہت سارے ٹیسٹ دے کر، استادوں کی ڈانٹ سن کر، لال پین سے نشان لگے ہوئے پیپر کلاس میں دیکھے ہوئے ہیں، اسے اپنی غلطیاں پتا لگ جاتی ہیں۔ وہ اپنی غلطیاں درست

کرتا ہے۔ پھر وہ امتحان لینے والے کو متاثر کر سکتا ہے۔

پیپر کیسے حل کریں

بچے پورا سال پڑھتے ہیں۔ انہیں تقریباً گیارہ ماہ تیاری کرنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن اتنے ماہ ملنے کے باوجود، کورس ختم کرنے کے باوجود، اسکول باقاعدہ جانے کے باوجود بہت سے بچے ایسے ہوتے ہیں جنہیں سب کچھ یاد کیا ہوتا ہے، پڑھا ہوتا ہے، تیار کیا ہوتا ہے مگر انہیں پیپر حل کرنا نہیں آتا۔ اس لیے وہ اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتے۔ پیپر بہتر حل کرنے کیلئے درج ذیل خصوصیات ہونا ضروری ہیں:

1- امتحان لینے والے کو متاثر کرنا

پیپر حل کرنے کی صلاحیت میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آپ پیپر کو دل کش بنا سکیں۔ آپ کو اس کو انسپائر کرنا آتا ہو۔ جب آپ کسی کو انسپائر کرتے ہیں تو پھر وہ آپ کو نمبر دیتا ہے، کیونکہ پیپر چیک کرنے والے کے سامنے آپ موجود نہیں ہوتے، آپ کی تصویر سامنے نہیں ہوتی، آپ کی محنت سامنے نہیں ہوتی۔ محنت کا ثبوت صرف یہی ہوتا ہے کہ آپ نے پیپر کو اچھے انداز میں حل کیا ہو۔ فرض کیجیے، دو اسٹوڈنٹس نے اپنے اپنے پیپر ایک جیسے حل کیے ہیں۔ ایک کے دس میں سے دس نمبر آتے ہیں جبکہ دوسرے کے تین آتے ہیں۔ اگر صرف ان نمبروں کو دیکھیں یہی لگتا ہے کہ پہلے بچے نے کچھ ایسا ضرور کیا ہے، جس کی وجہ سے امتحان لینے والا متاثر ہو گیا۔

2- صاف پیپر

امتحان لینے والا اس طالبعلم کو زیادہ نمبر دیتا ہے جس کا پیپر صاف ہوتا ہے۔ بچوں نے پیپر اس طرح کیا ہوتا ہے کہ انہیں خود سمجھ نہیں آتا کہ انہوں نے کیا کیا ہے۔ اگر وہ خود پڑھیں، اس کو غور سے دیکھیں تو انہیں خود سمجھ نہیں آئے گا۔ اگر آپ اپنے پیپر کو خود ہی سمجھ نہیں پا رہے تو پیپر چیک کرنے والا کیسے سمجھے گا۔ صاف پیپر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خالی

شیٹیں واپس کر دیں۔ صاف پیپر کا مطلب ہے کہ پیپر حل کیا ہو، ہر چیز کو صاف طریقے سے لکھا ہو۔

3- ہیڈنگ / حاشیہ لگانا

لائق بچہ سب سے پہلے پیپر کے ایک سائیڈ پر مارکر سے لائن لگاتا ہے۔ اسے "حاشیہ" کہتے ہیں۔ اکثر بچوں کو یہ پتا ہی نہیں ہے کہ بورڈ میں کچی پینسل کا استعمال منع ہے۔ یہ رول نمبر سلپ کے پیچھے بھی لکھا ہوتا ہے اور اس بارے میں استاد کو سال کے شروع میں ہی بتا دینا چاہیے کہ کچی پینسل کا استعمال نہیں کرنا۔ آپ کو حاشیہ مارکر سے لگانے ہیں اور مارکر بھی نیلی روشنائی والا استعمال کرنا ہے۔ کالا مارکر استعمال نہیں کرنا۔ آپ پیپر کے سائیڈ پر مارکر سے خوبصورت اور واضح حاشیہ لگائیں۔ عموماً حاشیہ کی چوڑائی پون انچ سے ایک انچ مناسب ہوتی ہے۔ حاشیہ لگانے کے بعد پیپر میں جتنی جگہ بچ جائے، اسے پیپر کے سوالات حل کرنے کیلئے استعمال کیجیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جتنی لائنیں ہیں، ان پر لکھیں۔ انہیں خالی نہ چھوڑیں۔ ایک کونے سے شروع کریں اور دوسرے کونے تک لکھیں۔ اگر تعریف لکھنی ہے تو اسے واضح کر دیں، مگر جگہ ضائع نہ کریں۔

پیپر حل کرتے ہوئے ضروری ہیڈنگ ضرور دیں۔ سب سے پہلے پیپر کے شروع میں، پھر درمیان میں مین ہیڈنگ دیں۔

4- صحیح جواب

پیپر چیک کرنے والا متاثر تب ہوتا ہے کہ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ جو سوال پوچھا گیا ہے اس کا وہی جواب دیا گیا ہے۔ جو بچہ زیادہ نمبر لیتا ہے، وہ بچہ پیپر حل کرتے ہوئے پورا خلاصہ بناتا ہے کہ جب یہ پیپر چیک کرنے والے کے پاس جائے تو جو اس نے پوچھا ہے، میں نے اس کے بارے میں صحیح لکھا ہو۔ جبکہ اس کے مقابلے میں نالائق بچے سے جو پوچھا گیا ہوتا ہے، وہ اس کے سوا سب کچھ لکھتا ہے مگر سوال کا جواب نہیں دے پاتا۔ فرض کیجیے،

سوال شمال کے بارے میں کیا گیا ہے تو وہ جنوب کے بارے میں بتائے گا۔ ہمیشہ دیکھیں کہ سوال کے نمبر کتنے ہیں، کیا اور کتنا پوچھا گیا ہے اور اس کا کتنا جواب دینا ہے۔

5- سوال ختم ہونے پر لائن لگانا

جب سوال ختم کریں تو چاہے سوال چھوٹا ہو یا بڑا، لائن لازماً لگائیے۔ یہ لائن مار کر کی مدد سے لگائیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ لائن لگاتے ہیں تو یہ علامت ہے کہ آپ کے سوال کا جواب ختم ہو چکا ہے۔ بسا اوقات پیپر چیک کرنے والا تیزی میں چیک کر رہا ہوتا ہے تو وہ دو سوالوں کو ایک سمجھ کر چیک کر دیتا ہے۔ اپنے جوابات کو لائنوں کے ذریعے واضح کیجیے تاکہ چیک کرنے والے کیلئے آسانی ہو۔

6- غیر ضروری جگہ چھوڑنا

کئی بچے سوال کیلئے دو لائنیں استعمال کرتے ہیں اور نیچے سارا صفحہ چھوڑ دیتے ہیں۔ چیک کرنے والا اس چیز کو پسند نہیں کرتا۔ اگر پچاس فیصد سے زیادہ صفحہ استعمال ہو گیا ہے تو پھر تو خیر ہے، لیکن اگر اس سے کم استعمال ہوا ہے تو اس کو اگلے سوال کیلئے استعمال میں لائیے۔ کئی بچے یہ غلطی کرتے ہیں کہ اگر سوال میں کہا گیا ہے کہ کوئی سے چار سوالوں کے جواب دیں تو وہ پانچ کے جواب دے دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچتے ہیں کہ جو صحیح ہوں گے، چیک کرنے والا خود ہی چیک کر لے گا۔ چیک کرنے والا صرف نمبر دینے تک آپ کا ہمدرد ہے۔ وہ ایکسٹرا پیپر چیک نہیں کرے گا۔ اس نے پہلے چار سوال چیک کرنا ہیں اور باقی کو کاٹ دینا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جو پوچھا گیا ہے، جتنا پوچھا گیا ہے اسی کا جواب دیں۔

7- جواب دینے کی ترتیب

جب بھی پیپر حل کریں، سب سے اچھا سوال جو آپ کو آتا ہو وہ دوسرے نمبر پر کریں۔ جو دوسرے نمبر پر کرنا ہے وہ پہلے نمبر کریں، کیونکہ چیک کرنے والے کے ذہن میں یہ بات

ہوتی ہے کہ پہلا سوال اچھا ہی ہوتا ہے اس لیے جو دوسرے نمبر والا سوال آپ نے پہلے کیا ہوگا، اس کے نمبر بھی پہلے سوال جتنے آئیں گے۔ دوسری بات، جب چیک کرنے والا یہ دیکھے گا کہ اس کا دوسرا جواب بھی بڑا زبردست ہے تو وہ یہ سمجھے گا کہ یہ لائق بچہ ہے۔ جو سوال آپ کو سب سے کم آتا ہے، اسے تیسرے نمبر پر کیجیے۔ آخر میں نہ کیجیے۔ آپ تھوڑے نمبر اور لگوا لیں۔ اب ترتیب کے حساب سے تیسرے نمبر والا چوتھے نمبر پر کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا پورا پیپر ترتیب کے ساتھ حل ہو جائے گا۔ یہ پوری نفسیات ہے، اسے سیکھیں۔

8- آسانی پیدا کیجیے

ہمیشہ پیپر چیک کرنے والے کیلئے آسانی پیدا کیجیے۔ اگر کوئی چیز رہ گئی ہے اور آپ کو کہیں اور لکھنی پڑ گئی ہے تو اس کی نشان دہی واضح طور پر کیجیے کہ یہاں لکھی ہے۔ اگر کوئی چیز کاٹنی پڑ گئی ہے تو اس لائن کی دونوں سائیڈ پر کراس لگائیے اور جو لکھا ہوا ہے، اس پر ہلکی سی لائن لگا دیں۔ یہ غلطیاں زیادہ تر اُن سے ہوتی ہیں جنہوں نے وقت پر ٹیسٹ نہیں دیئے ہوتے۔ بورڈ کے پیپروں کی اچھی تیاری اسکول کالج کے ٹیسٹ دے کر ہوتی ہے۔ بچے تمام نصاب پڑھ لیتے ہیں، یاد کر لیتے ہیں، مگر ٹیسٹ نہیں دیتے۔ جو بار بار ٹیسٹ دیتا ہے اس کیلئے بورڈ کا پیپر دینا آسان ہو جاتا ہے۔

یہ عادت بنائیے کہ پیپر کرنے کے بعد دوبارہ پڑھنا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اپنی غلطیوں کا پتا لگ جائے گا اور کمی بیشی ہوگی، وہ دور کرنا ممکن ہوگا۔ جو آدمی اپنا احتساب کرتا ہے، دنیا اس کا احتساب کم کرتی ہے۔ جو اپنی غلطیاں ٹھیک کر لیتا ہے، دنیا اس کی غلطیاں کم ہی نکالتی ہے۔

9- ایک پن کا استعمال

اکثر بچے سارا سال لیڈ پنسل استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کئی بچے بال پوائنٹ استعمال کرتے رہتے ہیں، کئی مارکر استعمال کرتے ہیں جبکہ بورڈ کے پیپر میں صرف ایک

پن (Fountain Pen) کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ صحیح طریقے سے پیپر نہیں کر پاتے۔ جس ہتھیار سے لڑنا ہے، اسی ہتھیار سے پورا سال تیاری کیجیے۔ اگر آپ نے کلاس میں ٹیسٹ دینا ہے تو وہ اینک پن سے دیں۔ ہوم ورک کرنا ہے، تب بھی اینک پن کا استعمال کریں۔ غرض، کچھ بھی تیار کرنا ہے یا لکھنا ہے، اینک پین سے ہی کام کریں۔ یوں، آپ بورڈ کے امتحان میں آسانی کے ساتھ اینک پین کا استعمال کرنے کے قابل ہوں گے کہ جہاں ایک ایک نمبر کی اہمیت ہے۔

10- پورا سامان تیار رکھنا

جیسے ایک سپاہی کے پاس اپنا سامان پورا ہوتا ہے، اسی طرح آپ بھی امتحان گاہ میں جانے سے پہلے اپنا سامان پورا کرنے کی عادت بنائیے۔ پین، پینسل، مارکر اور دیگر تمام چیزیں آپ کے پاس زائد ہوں کہ خدانہ خواستہ اگر کوئی شے کم پڑ جائے یا عین وقت پر کام نہ کرے تو آپ کا کام نہ رک جائے۔ جو بچہ پورا سال اکیلے بیٹھ کر پیپر کی تیاری کرتا رہتا ہے کہ میں نے ایسے تیاری کرنی ہے، کیا کیا چیزیں ساتھ رکھنا ضروری ہیں، وہ ساری چیزوں کا خیال کرتا ہے۔ پھر اس بچے کے زیادہ نمبر آتے ہیں۔ اس کی نسبت اگر کسی بچے نے سوچا ہی نہیں ہے تو پھر وہ زیادہ نمبر حاصل نہیں کر سکے گا۔

دہرائی کی طاقت

بعض بچے سبق یاد کر لیتے ہیں اور یاد کرنے کے بعد دوبارہ اسے نہیں دیکھتے۔ کتاب بند کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جب پیپر آتے ہیں تو کتاب کھولتے ہیں اور یاد کیا ہوا سبق دوبارہ دیکھتے ہیں اور تب شکوہ کرتے ہیں کہ ہم سب کچھ بھول گئے۔ صرف یاد کرنا کافی نہیں ہے۔ یاد کرنے کے ساتھ ساتھ دہرانا بہت اہم ہے۔ جو سبق آپ نے ایک گھنٹہ لگا کر یاد کیا ہے، اگلے دن پانچ منٹ لگا کر اسے دہرا لیں۔ پھر وہ سبق کئی دنوں تک یاد رہے گا۔

ایک تحقیق کے مطابق، اگر آپ ایک سبق یاد کرتے ہیں، اگلے دن اس کو دہراتے ہیں،

پھر اسی سبق کو سات دن کے اندر دوبارہ ایک یا دو دفعہ دہرا لیتے ہیں تو پھر وہ سبق ایک سال یاد رہتا ہے۔ ہم ایک بار سبق پڑھتے ہیں، پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ جب بھی ایسا کریں گے، آپ کو سبق یاد نہیں رہے گا۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ جس سبق کو آپ نے ایک گھنٹہ لگا کر یاد کیا ہے، اگلے دن اس کی دہرائی ضرور کریں۔ اگر آپ کے گھر سے اسکول کا فاصلہ نصف گھنٹے کا ہے تو آپ اس وقت میں اپنا سبق دہرا سکتے ہیں۔ اگر اسکول میں آپ کو خالی پیریڈ مل جاتا ہے تو اس میں دہرائی کر لیا کریں۔ جب آپ گھر آ رہے ہوں اور آپ کی گاڑی لیٹ ہو جائے تو آپ کتاب کھولیں، پچھلے دن کا سبق دہرا لیں۔ جب آپ گھر آ جائیں، پڑھنے کو دل نہ کرے تو پچھلے دن کا سبق نکالیں، پانچ منٹ میں دہرائی کریں اور کتاب رکھ دیں۔ اسی طرح، جب آپ کو نیند نہ آ رہی ہو تو کتاب کھولیں۔ پچھلے دن کے سبق کو دہرانا شروع کر دیجیے۔ جہاں جہاں آپ کو وقت ملتا ہے، آپ اپنا سبق دہرا لیا کیجیے۔ اگر آپ اسے اپنی عادت بنا لیتے ہیں کہ جو میں نے سبق یاد کیا ہے، اسے دہرانا ضرور ہے تو پھر وہ سبق یاد بھی ہو گا۔ جس کو سبق یاد ہوتا ہے اس کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اعتماد ہمیشہ اس کا کم ہوتا ہے، جسے خدشہ ہوتا ہے کہ مجھے سبق یاد نہیں ہے۔

دہرائی بڑی طاقتور چیز ہے۔ جو بچہ دہرائی کرتا ہے، اس کے نمبرز زیادہ آتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ بھولے ہوئے سبق کو دوبارہ یاد کرنے میں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ جو سبق آپ نے آج یاد کیا ہے، اسے اگلے دن ضرور دہرا لیں۔ چند دن بعد اگر آپ کو وقت ملے، پھر دہرا لیں۔ اس سے آپ کا اپنا وقت بچے گا۔ فقط پانچ پانچ منٹ لگانے سے سبق ایک سال تک یاد رہے، وہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ سبق یاد کیا اور چھوڑ دیا اور جب پیپر آئیں، کتاب کھولی اور پتا لگا کہ سب کچھ بھول چکا ہے۔ اگر اساتذہ کرام بچوں کو دہرائی کرانے لگیں تو پڑھائی ان کیلئے انتہائی آسان ہو جائے گی اور جس کیلئے پڑھائی آسان ہے، اس کی زندگی بھی آسان ہے۔ ہماری زندگی میں پڑھائی بہت اہم ہے۔ جو انسان پڑھتا

ہے، محنت کرتا ہے، کتابیں کھولتا ہے، تو کوشش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو اس کی محنت و کوشش کا صلہ ضرور دیتے ہیں۔ دو چیزیں ذرا مشکل ضرور ہوتی ہیں۔ ایک، پڑھائی اور دوسرا، چڑھائی۔ پڑھائی کا مطلب ہے، کتابیں کھولنا اور چڑھائی کا مطلب ہے، بلندی کی طرف جانا۔ دونوں کا فائدہ یہ ہے کہ یہ آپ کو غیر معمولی بناتی ہیں۔

خود پر یقین

خود پر یقین اتنی اہم چیز ہے کہ بعض ذہین طالب علموں کے پاس یہ یقین نہیں ہوتا اور بعض اوسط طالب علموں کے پاس یہ ہوتا ہے تو صرف خود پر یقین ہونے کی وجہ سے اوسط طالب علم کے زیادہ نمبر آجاتے ہیں۔ ایک ہوٹل میں دس دوست کھانا کھانے کیلئے اکٹھے ہوئے۔ کھانا کھانے کے بعد انہیں خیال آیا کہ کیوں ناں ہم لکھیں کہ آنے والے سال میں ہماری توقعات کیا ہیں۔ سب نے اپنے مستقبل کے بارے میں ایک ایک صفحہ لکھا۔ لکھنے کے بعد ہر ایک نے اسے بند کیا اور ہوٹل کے مالک کو بلا کر اسے وہ صفحات دے دیے اور کہا کہ ہم ایک سال بعد دوبارہ یہاں آکر کھانا کھائیں گے اور آپ کو بتائیں گے کہ ہم نے ان صفحات میں جو لکھا ہے، ان پر کتنا عمل ہوا ہے۔ اگلے سال نو دوست آئے۔ کھانا کھایا۔ پھر وہ صفحے منگوائے۔ جب انہوں نے صفحات کو دیکھا تو حیران کن بات یہ سامنے آئی کہ ان سب نے ایک سال سے جو توقعات لگائی تھیں، وہ پوری ہو چکی تھیں۔ انہوں نے دسویں دوست کا صفحہ کھول کر دیکھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا: "ہمارے خاندان کے لوگ بہت عرصہ نہیں جیتے، جلدی مر جاتے ہیں۔" جب اسے ڈھونڈا گیا تو پتا چلا کہ وہ فوت ہو چکا تھا۔ یعنی انسان کا یقین اس کی زندگی کی ہر طرح کی پرفارمنس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر آپ کا یقین ہے کہ آپ کے نمبر آسکتے ہیں تو پھر نمبر ضرور آئیں گے۔

بچے کو فزکس آتی ہے، کیمسٹری آتی ہے... مگر یقین بنانا نہیں آتا۔ اگر آپ کو یقین مل جائے تو پھر اس سے بڑا انعام کوئی نہیں ہے۔ یہ انعام کیا ہے کہ میں کر سکتا ہوں۔ ہر بچہ

چاہے وہ لائق ہو یا نالائق، اگر اس کے پاس یقین ہے تو اس کو نمبر ضرور ملیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ تنور پر روٹیاں لگانے والا سو سال سے زائد کا ریکارڈ توڑ دیتا ہے۔ نمبر حالات سے نہیں آتے، نمبر یقین سے آتے ہیں۔ اور وہ یقین خود پر ہوتا ہے۔ اگر آپ کو خود پر یقین نہیں ہے تو ساری دنیا مل کر بھی آپ کیلئے کچھ نہیں کر سکتی۔

چڑیا گھر میں ہاتھی کا چھوٹا بچہ لایا جاتا ہے۔ وہاں اس کا دل نہیں لگتا۔ وہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ چڑیا گھر والے ایک عام سی زنجیر اس کے پاؤں کے ساتھ باندھ کر ایک ہک کے ساتھ اس کو باندھ دیتے ہیں۔ وہ کوشش کرتا ہے مگر وہ نہیں کھلتی کیوں کہ زنجیر کے مقابلے میں اس کی قوت کم ہے۔ وہ ابھی چھوٹا ہے۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ہاتھی کا بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اس کا پاؤں بھی بڑا ہوتا جاتا ہے۔ وہ زنجیر کو بھی ساتھ ساتھ بڑا کرتے جاتے ہیں۔ ایک دن آتا ہے کہ وہ جوان ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ اس کی زنجیر کھول دیتے ہیں۔ مگر وہ ہاتھی وہاں سے نہیں بھاگتا، کیونکہ اس کا یقین اس عرصے میں اتنا پختہ ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ زنجیر جو میرے پاؤں کے ساتھ لگی ہوئی ہے، مجھے بھاگنے نہیں دے گی۔ یقین نظر نہیں آتا، مگر اس کا نتیجہ نظر آتا ہے۔

خود پر یقین کا مطلب ہے کہ اپنی صلاحیت، یادداشت، لکھائی، پیپر کرنے کی صلاحیت، محنت اور اپنے استاد پر یقین ہونا۔ استاد تو چاہتا ہے کہ بچے کے نمبر آئیں، مگر بچے کو استاد پر یقین ہی نہ ہو تو پھر اس کے نمبر نہیں آئیں گے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں پڑھایا بہت جاتا ہے، مگر یقین نہیں دیا جاتا۔ اساتذہ کرام کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو بچوں سے یقین چھین لیتے ہیں۔ اسی طرح، بہت سے والدین اپنے بچوں سے یقین چھین لیتے ہیں۔ جب ہم کسی کے بارے میں رائے دیتے ہیں تو اس کا یقین بننا شروع ہو جاتا ہے۔

امریکا میں دو لوگ تھے۔ دونوں کی ٹانگ میں درد رہتا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ دونوں کا اپریشن ہوگا۔ انہوں نے دونوں کو بے ہوش کیا۔ ان میں سے ایک کا اپریشن کیا جبکہ

دوسرے کو صرف بے ہوش کر کے ٹانگ پر صرف چیرا لگایا اور دوبارہ اس کو سی کر پٹی کر دی۔ جب دو ماہ بعد پٹی کھولی گئی تو دونوں ٹھیک ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپریشن ان کی ٹانگوں کا نہیں، بلکہ ان کے دماغ کا ہوا تھا۔ صرف آدمی کا یقین بدل دیجیے، اس کی ساری زندگی بدل جائے گی۔ آپ کی بڑی کمائی فزکس، کیمسٹری، میتھ نہیں ہے، بلکہ وہ یقین ہے کہ میں ان مضامین میں ماہر ہوں۔ میں ماہر ہوں تو میرے نمبر اچھے آسکتے ہیں۔

یقین کیسے پیدا کریں

اگر آپ کے اندر سے آواز آرہی ہے کہ میں کر سکتا ہوں تو پھر آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کے اندر سے آواز آرہی ہے کہ میں نہیں کر سکتا تو پھر ساری دنیا آپ کی ''ناں'' کو ''ہاں'' میں نہیں بدل سکتی۔ خود پر یقین پیدا کرنے کیلئے اپنے آپ سے کہا کیجیے کہ ''میں کر سکتا ہوں۔''

ہم زندگی میں دو طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک وہ جو دوسرے ہم سے کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ہم اپنے آپ سے کرتے ہیں۔ ہمارے لیے زیادہ اہم ہماری باتیں ہوتی ہیں جو ہم اپنے آپ سے کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں لگتا ہے کہ دوسروں کی باتیں ہمارے لیے زیادہ اہم ہیں۔ جب آپ اپنے آپ سے کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ میں کر سکتا ہوں تو پھر آپ میں یقین پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

جب ہم کسی دن کوئی موٹیویشنل لیکچر لیتے ہیں یا پرسنل ڈیولپمنٹ کی کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو اس دن یقین کا لیول بہت بلند ہوتا ہے۔ اپنے مثبت یقینوں کو مضبوط کرنے کیلئے آپ یقین کے ذرائع تلاش کیجیے۔ وہ لیکچر ہو سکتا ہے، وہ کوئی دوست ہو سکتا ہے، وہ کوئی استاد ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ فزکس، کیمسٹری کے استاد کے پیچھے بھاگتے ہیں، یقین والے کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ آپ کو جو کچھ بننا ہے، پہلے اس کا یقین کر لیجیے کہ میں وہ بن چکا ہوں۔ دنیا کے جتنے بھی بڑے لوگ بنے ہیں، انہوں نے پہلے ہی یقین کر لیا تھا کہ ہم وہ بن چکے ہیں جو

ہم بننا چاہتے ہیں۔

اپنی پچھلی کامیابیوں کو یاد کیجیے۔ آپ کے پہلے جو ٹیسٹ ہوئے ہیں، اگر ان میں زیادہ نمبر آئے ہیں تو پھر آج بھی نمبر آ سکتے ہیں۔ ایک بچہ ایک مضمون میں بہت زیادہ کمزور تھا۔ اس میں اس کے نمبر نہیں آتے تھے۔ وہ بڑا پریشان رہتا تھا۔ ایک ٹیسٹ کے نتیجے میں وہ فرسٹ آ گیا۔ اس وجہ سے اس کا یقین کا لیول بہت زیادہ بلند ہو گیا۔ جب ہمیں کامیابی کا ذائقہ ملتا ہے تو پھر یقین کا لیول بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ یقین کو جمع ہی نہیں کرتا، مگر وہ فزکس، کیمسٹری جمع کر لیتا ہے۔ یقین بھی جمع کرنا پڑتا ہے۔ یقین کا تیل جمع کر کے اپنا دیا جلانا پڑتا ہے۔ آپ کامیابی کے بارے میں سوچیں، ان شاء اللہ کامیابی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

پڑھنے کی منصوبہ بندی کیسے کی جائے؟

پڑھائی کی منصوبہ بندی کرنے کیلئے دو چیزیں بہت اہم ہیں:

1- کورس

سب سے پہلے دیکھئے کہ آپ کا کورس کتنا ہے، یاد کتنا کرنا ہے، کتاب کتنی بڑی ہے، اس میں کتنے مضامین ہیں۔ جب آپ کورس کی طرف آتے ہیں تو سب سے پہلا کام یہ کیجیے کہ جو مضمون آپ تیار کرنے لگیں، اس کے حصے بنالیں۔ جب آپ کسی چیز کے حصے بنا لیتے ہیں تو پھر اس کی تیاری آسان ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، پوری روٹی ایک نوالے میں کوئی نہیں کھا سکتا، جو ایسا کرنے کی کوشش کرے گا، روٹی اس کے گلے میں پھنس جائیگی لیکن اگر وہ اس کے نوالے کر کے کھانا شروع کرے گا تو پھر وہ ایک نہیں چار کھا جائے گا۔ کسی بھی بڑے کام کے چھوٹے حصے کر لیے جائیں تو وہ کام کرنا آسان ہو جاتا ہے اور حوصلہ بن جاتا ہے۔ جو مضمون آپ کو تیار کرنے لگیں، اسے دیکھیں کہ میں اسے کیوں تیار کرنے لگا ہوں؟ اس میں کیا ہے؟ کبھی بھی کسی سبق کو بغیر دیکھے شروع نہ کریں، ہمیشہ اس کا جائزہ لے لیں کہ کیا یہ مضمون ضروری ہے؟ عموماً کتابوں کی ابتدا میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس میں کون سا

مضمون اہم تر ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ جب آپ کسی چیز کے مقصد اور محرک کو جان جاتے ہیں، آپ کو وجہ پتا لگ جاتی ہے تو پھر آپ زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بعض بچے چھے گھنٹے کتاب کھول کر بیٹھے رہتے ہیں۔ انہیں ایک سبق بھی یاد نہیں ہوتا جبکہ کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں جو کتاب کھولتے ہیں، بیس منٹ میں انہیں پورا باب یاد ہو جاتا ہے۔ سبق یاد کرنے کا تعلق فوکس کی صلاحیت سے ہے۔ بعض بچوں نے نیوٹن کے قوانین کو کھولا ہوتا ہے جبکہ ان کے دماغ میں کچھ اور چل رہا ہوتا ہے۔ جس بچے نے کتاب کھولی ہے اور ذہنی طور پر بھی کتاب کے ساتھ رہا، اسے جلد سبق یاد ہو جائے گا۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ جسمانی موجودگی کافی نہیں ہوتی، ذہنی طور حاضر ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ جب بھی آپ فوکس کے ساتھ سبق یاد کرتے ہیں، آپ کی سبق یاد کرنے کی صلاحیت زیادہ ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اگر آپ میٹرک میں ہیں اور ابھی بھی آپ کو پڑھتے وقت زیادہ وقت لگتا ہے تو آپ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیں۔ آپ کی سبق یاد کرنے کی پریکٹس کتنی ہے۔ غور کیجیے کہ آپ دس سال سے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ نے سبق یاد کرنے کی صلاحیت نہیں بڑھائی۔

2- وقت

ہمیشہ دیکھئے کہ امتحانات میں کتنا وقت باقی ہے۔ ہمیشہ اپنی منزل مقصود کو سامنے رکھتے ہوئے تیاری کیجیے۔ فرض کیجیے، اگر وقت کم ہے، صرف چار ماہ ہیں تو پھر پلاننگ بدل جائے گی۔ اگر آپ روزانہ کا ایک پیراگراف تیار کر رہے ہیں تو پھر تیاری نہیں ہوگی۔ اس وقت میں اچھی دہرائی تو ہو سکتی ہے، دوبارہ نئے سرے سے پڑھا نہیں جا سکتا۔ وقت دیکھئے۔ پھر اس وقت کے بھی حصے بنالیں۔ سال میں 365 دن ہوتے ہیں، 52 ہفتے ہوتے ہیں۔ مہینے میں 30 دن ہوتے ہیں، ہفتے میں سات دن ہوتے ہیں اور ایک دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں۔ ایک گھنٹے میں 60 منٹ ہوتے ہیں۔ پتا چلا کہ وقت کے پہلے ہی حصے ہوئے ہیں۔

آپ اپنی کتاب اٹھائیے اور دیکھئے کہ ایک باب ایک دن میں تیار ہو سکتا ہے یا دو دونوں میں۔ جو بچہ اپنے کورس کو وقت کے ساتھ نہیں جوڑتا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اصل میں کامیابی وقت کی تنظیم اور کورس کی تنظیم میں ہے۔ جو بچہ تعلیمی منصوبہ بندی میں کمزور ہوتا ہے، وہ نمبر نہیں لا سکتا۔ وہ چاہے لائق ہو، ذہین ہو، سارا کورس چھ بار بھی پڑھا ہو، اس کیلئے وقت اور کورس کی تنظیم بہت ضروری ہے۔

زندگی میں جب بھی کوئی بڑا کام آئے تو دیکھئے کہ کام کتنا بڑا ہے، میری صلاحیت کتنی ہے، اس کام کو تقسیم کیسے کیا جا سکتا ہے اور وقت کتنا ہے۔ ان سب چیزوں کو جب آپ منظم کرنا سیکھ جاتے ہیں تو در اصل آپ پلاننگ سیکھتے ہیں۔ جو پلاننگ سیکھ لیتا ہے، نہ صرف اس کی تعلیم بلکہ اس کی زندگی بھی منظم ہونے لگتی ہے۔ اس کے نمبر اچھے آتے ہیں بلکہ اس کی زندگی کے ہر شعبے میں اس کی کامیابی بہتر سے بہتر ہونے لگتی ہے۔

پڑھنے کی منصوبہ بندی

کئی بچے بڑے ذہین و فطین ہوتے ہیں، لیکن ان کے نمبر نہیں آتے۔ یہ وہ بچے ہوتے جنہیں پڑھنے کی منصوبہ بندی کرنا نہیں آتی۔ منصوبہ بندی اتنی اہم چیز ہے کہ دنیا میں جتنی بھی حکومتیں ہیں، وہ منصوبہ بندی کی بنیاد پر چل رہی ہیں۔ ان کے باقاعدہ ڈیپارٹمنٹ بنے ہوتے ہیں جہاں لوگ بیٹھ کر منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ دنیا میں جتنے بڑے کام ہو رہے ہیں، وہ منصوبہ بندی سے ہو رہے ہیں۔ کئی ملک سوپر پاور بن جاتے ہیں، یہ ساری منصوبہ بندی کا کمال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو جتنا اچھا منصوبہ ساز ہے، وہ اتنا زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ آپ پڑھائی کی جتنی اچھی منصوبہ بندی کریں گے، آپ اتنے ہی کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر آپ منصوبہ بندی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں تو پھر آپ زندگی کے ہر شعبے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ایک آدمی نے گاڑی چلانا سیکھا ہے۔ اگر وہ گاڑی بدل بھی لے تو

اس کیلئے دوسری گاڑی چلانا بھی آسان ہوگا، کیونکہ اس نے گاڑی چلانا سیکھ لیا ہے۔ اسی طرح، جب آپ منصوبہ بندی سیکھتے ہیں اور خاص کر پڑھائی کی منصوبہ بندی تو اس کا سب سے بڑا فائدہ آپ کو یہ ہوتا ہے کہ وہ منصوبہ بندی آپ کی تعلیم کے علاوہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی رنگ لاتی ہے۔

منصوبہ بندی کے فوائد

منصوبہ بندی کے درج ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:

1- آپ کا وقت بچتا ہے

2- آپ کا ذہنی دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ آپ جب بھی بغیر منصوبہ بندی کے پڑھائی شروع کرتے ہیں، آپ ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

3- اعتماد بڑھ جاتا ہے، جتنی اچھی منصوبہ بندی ہوگی، اتنا زیادہ آپ میں اعتماد ہوگا۔ بچے سبق یاد کر رہے ہوں اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کو سبق یاد ہے تو جواب نہیں دے پاتے، کیوں کہ انہیں یقین نہیں ہوتا کہ واقعی انہیں سبق یاد ہے۔ جس بچے کو اس کا یقین ہوتا ہے کہ مجھے سبق یاد ہے، اس میں اعتماد ہوتا ہے۔ وہ فوری اقرار کرتا ہے کہ اسے سبق یاد ہے۔

4- پڑھائی کی منصوبہ بندی پڑھائی سے نکل کر زندگی کے ہر شعبے میں چلی جاتی ہے، کیونکہ آپ جو کچھ سیکھتے ہیں، وہ آپ کی عملی زندگی میں بھی کام آنا شروع ہو جاتا ہے۔



وقت

''کسی کے پاس بھی سب کچھ کرنے کا وقت نہیں ہوتا، مگر اہم ترین کام کرنے کا وقت ہر ایک کے پاس ہوتا ہے!''

برائن ٹریسی

وقت کی تنظیم

وقت کی تنظیم کا مطلب ہے کہ قدرت نے آپ کو جو وقت دیا ہے، ایک دن میں 1440 منٹ، اسے بہتر طور پر استعمال میں لایا جائے۔ اگر ہم وقت کو بہتر طور پر استعمال میں لا رہے ہیں تو زیادہ کامیابی ملے گی۔ اگر نہیں لا رہے تو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ قدرت ہماری جیب میں ساٹھ ستر سال ڈال کر ہمیں زمین پر بھیجتی ہے اور ہمیں اس وقت کی تنظیم کرنی ہوتی ہے۔ زندگی میں اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو برابر کی سطح پر وقت دے دیا ہے۔ ہر زندہ انسان کو دن اور رات میں چوبیس گھنٹے ملتے ہیں۔ یہ کسی کیلئے نہ کم ہوتے ہیں اور نہ زیادہ۔ آج تک دنیا میں جتنے بھی دانشور آئے ہیں، وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وقت سے پیچھے رہنے والا خود ہی پیچھے رہ جاتا ہے۔ کوئی پرانے زمانے کا شخص نئے زمانے کی ٹیکنالوجی کے زمانے میں نہیں آ سکتا۔ اپنے زمانے میں چاہیں آگے نکل جائیں یا پیچھے رہ جائیں، وقت کو روکا نہیں جا سکتا۔ صرف ایک اختیار ہے، وقت کی تنظیم یعنی ٹائم مینجمنٹ۔ وقت کی تنظیم کا مطلب ہے، وقت کے ساتھ زندگی گزارنا۔

دنیا میں پہلی قسم کے لوگ وہ ہوتے جو وقت کی تنظیم کرنا نہیں جانتے۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو غیر سنجیدہ ہوتے ہیں۔ ان کے غیر سنجیدہ ہونے کی وجہ سے ان سے وقت

کی تنظیم نہیں ہوتی۔ تیسری قسم کے لوگ بے مقصد ہوتے ہیں۔ جس کے پاس مقصد نہیں ہے وہ بھی وقت کی تنظیم نہیں کر سکتا۔ جو آدمی اپنے مقصد کو سامنے رکھتا ہے، وہ وقت کی تنظیم کر سکتا ہے۔ چوتھی قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس وقت ضائع کرنے کے ذرائع ہوتے ہیں۔ وقت کی تنظیم وہ شخص کر سکتا ہے جو وقت ضائع کرنے والے ذرائع کو ختم کر دیتا ہے۔

ہر فرد کی زندگی میں وقت ضائع کرنے والی چیزیں ہوتی ہیں جن میں یہ عام طور پر پائی جاتی ہیں:

1- دفتر میں لوگوں سے غیر ضروری موضوعات پر باتیں کر کے وقت ضائع کرنا

2- سوشل میڈیا کا بہت زیادہ استعمال کرنا

3- بہت زیادہ ٹی وی دیکھنا

4- وقت ضائع کرنے کیلئے کام ڈھونڈنا

5- چھوٹے سے کام میں بے نتیجہ مصروف رہنا

6- اخبار یا میگزین کا غیر ضروری مطالعہ کرنا

7- ہماری زندگی کوئی ایسا فرد جو ہمیشہ ہمارا وقت ضائع کرتا ہے

بہترین وقت میں بہترین استعمال

ایک تحقیق کے مطابق، پورے دن میں کچھ گھنٹے ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان سب سے بہتر کام کرتا ہے۔ یہ وقت انسان کی توانائی کے جوبن کا ہوتا ہے۔ فرض کیجیے، آپ پورا دن کوئی کام نہیں کرتے، لیکن اپنی ساری توانائی جمع کر کے شام کے وقت اپنی توانائی کسی ایک کام پر لگا کر اس کام کو بہترین بناتے ہیں۔ آپ چوبیس گھنٹوں میں وہ وقت نکالیں جس میں سب سے اچھا کام پوری توانائی سے کر سکتے ہیں۔ وہ وقت کام کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے توانائی کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے۔

کئی لوگوں کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ صبح کے وقت بہت اچھا کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ

رات کے وقت بہت اچھا کام کر سکتے ہیں۔ انہیں عادت ہوتی ہے کہ دنیا سو جائے اور ہم اپنا کام شروع کریں۔ ایسے لوگ جاگنے والے ہوتے ہیں۔ کئی لوگ شام کے وقت بہت اچھا کام کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شام کی چائے کے بعد ہم بہت اچھے طریقے سے کام کرتے ہیں۔ ممکن ہے، روز ایسا نہ ہو سکے۔ واقعات، حالات، خوشی، غمی... وقت بدلتا ہے۔ لیکن جب آپ کو اس طریقے کا پتا ہوگا تو پھر آپ کو استعمال کرنا بھی آئے گا۔ وہ وقت آپ کیلئے انتہائی موثر ہونا چاہیے اور آپ کہہ سکیں کہ یہ میرے پورے دن کا نچوڑ ہے۔ اپنے اچھے وقت کو اچھے طور پر استعمال کیجیے۔ اگر کوئی اس وقت کو خراب کرنے کی کوشش کرے تو آپ اس سے معذرت کرلیں۔ اپنے وقت کو کاموں کی نوعیت کے لحاظ سے تقسیم کیجیے۔ بہترین وقت بہترین کاموں اور افراد کیلئے مختص کیجیے۔ یہ نہ ہو کہ سب سے اچھا وقت آپ نے کسی فارغ آدمی کو دے دیا اور جب کام کرنے کا وقت آیا تو اس وقت آپ کی توانائی ضائع ہو چکی تھی۔

قدرت صبح کے وقت ہماری جیب میں اشرفیاں ڈالتی ہے جن میں کچھ سونے کی، کچھ چاندی کی اور کچھ پیتل کی ہوتی ہیں۔ اس میں جو سونے کی ہیں، وہ ہمارا بہترین وقت ہوتا ہے۔ اس لیے بہترین وقت کو بہترین کاموں، بہترین لوگوں، بہترین واقعات کیلئے استعمال کرنا چاہیے۔ جو وقت بچ جائے، اس میں جو کام اہم نہ ہوں، انہیں کیا جا سکتا ہے۔

وقت کا ضیاع

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر آپ نے کسی کے مستقبل کے بارے میں جاننا ہے تو یہ دیکھیں کہ وہ کتنا فارغ رہتا ہے۔ آپ جو روزانہ کام کرتے ہیں، اس کا شیڈول بنایئے تو اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کا کتنا وقت ضائع جاتا ہے:

1۔ اخبار پڑھ کر اس پر تبصرہ کرنا (ایک گھنٹہ)

2- گپیں (ایک گھنٹہ)

3- سستی (ایک گھنٹہ)

4- ٹی وی (ایک گھنٹہ)

5- سوشل میڈیا (ایک گھنٹہ)

یہ کل پانچ گھنٹے بنتے ہیں۔ اگر ہم اس کو سات سے ضرب دیں تو یہ 35 گھنٹے ہوئے۔ یہ مہینے کے 140 گھنٹے بنیں گے اور سال کے 1680 گھنٹے بنتے ہیں۔ اس کو اگر 24 پر تقسیم کیا جائے تو یہ 70 دن بنتے ہیں۔ غور کیجیے کہ ہم اپنی زندگی کے ایک سال میں 70 دن ضائع کرتے ہیں۔ زندگی بہت قیمتی ہے اور اس میں کتنا وقت ضائع جاتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ وقت زندگی ہے۔ وقت اصل وہ ہے جو شعور کا وقت ہے۔ جب تک وقت کی قدر نہیں ہوگی، وقت کی تنظیم نہیں ہوگی۔ خوش قسمت انسان وہ ہے جو نعمت کے چھننے سے پہلے اس کی قدر کرلے۔ آپ کے پاس وقت کی نعمت ہے۔ بیماری اور فقر سے پہلے اس نعمت کی قدردانی یہ ہے کہ اسے اپنی زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول پر صرف کیجیے۔

وقت کو ضائع ہونے سے کیسے بچائیں

جب آدمی وقت کی تنظیم کرتا ہے تو اس کی زندگی میں برکت آجاتی ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے تحفے کو عزت دیتا ہے اور یہیں سے اس کی ترقی شروع ہوتی ہے۔ آپ ایک فہرست بنائیں کہ کن کن کاموں میں آپ کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ پھر، لکھیے کہ اس وقت میں آپ کیا کیا مفید کام کرسکتے ہیں:

1- اللہ تعالیٰ کا ذکر

2- اچھی کتابوں کا مطالعہ، خاص کر اگر آپ اپنی نوکری میں ترقی کیلئے پڑھ رہے ہیں تو وہ کتابیں ضرور پڑھیں

3. کوئی ایسا کام جس میں معاوضہ نہ ہو (رضا کارانہ)
4. اگر اسمارٹ موبائل ہے تو اس میں ڈکشنری ڈاؤن لوڈ کر کے الفاظ کے معانی سیکھنا
5. غور و فکر کرنا کہ میں کون ہوں، میں کدھر سے آیا ہوں، میرا مالک سے کیا تعلق ہے، یہ نظام کیسے چل رہا ہے، میں نہیں بھی ہوں تو یہ نظام تب بھی چلتا رہے گا... غور و فکر عبادت کے برابر ہے۔

وقت کو بہتر طور پر گزارنے کیلئے دو چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ اول، ویژن۔ دوم، مقصد۔ ویژن کا مطلب ہے کہ آج کے وقت کو سامنے رکھتے ہوئے کل کو دیکھنا، آنے والے وقت کے خواب، آنے والے وقت کو سامنے رکھ کر قدم اٹھانا۔ ایک دفعہ حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے دیکھتے ہیں کہ ایک اندھا بھکاری ہے جس کی عمر اسی سال ہے اور وہ رو رہا ہے۔ کہہ رہا تھا، میں بھیک مانگنے نہیں آیا، میرا صرف آپؒ سے ایک سوال ہے، کیا اس وقت دنیا میں میرے سے زیادہ بدقسمت کوئی ہے؟ آپؒ نے پوچھا، کیوں یہ خیال آیا؟ اس نے کہا، میری آنکھوں میں بصارت نہیں ہے، اسی سال عمر ہے، میں نے دیکھا ہی کچھ نہیں ہے، اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپؒ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کو گلے لگایا، پھر ایک بات کہی، ''دنیا کا بدقسمت وہ نہیں ہے جس کے پاس بصارت نہیں ہے۔ بدقسمت وہ ہے جس کے پاس بصارت تو ہے، بصیرت نہیں ہے۔'' بصیرت کا دوسرا نام ہے، ویژن۔

مقصد... مقصد کا مطلب ہے کہ ذمے داریوں کا شعور۔ مقاصد کئی اقسام کے ہوتے ہیں جس میں گھر، گاڑی، روپیہ پیسہ، اپنی بہتری، اپنے کام میں بہتر انسان بننا، خاندان کو کامیاب بنانا، اپنے آپ میں مذہبی بہتری لانا۔ جب مقصد سامنے ہو اور کل کے خواب سامنے ہوں تو پھر وقت کی تنظیم ہوتی ہے۔ وقت ضائع کرنا ایک عادت ہے۔ عادت اگر بری ہو تو اس کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ وقت کو استعمال میں لانا بھی عادت ہے۔ بھارت کے

سابق صدر ابو الکلام کہتے ہیں، ''دنیا کا کوئی انسان اپنے مستقبل کو نہیں بدل سکتا، لیکن اپنی عادتوں کو بدل سکتا ہے اور عادتیں اس کے مستقبل کو خود بدل دیتی ہیں۔'' درج ذیل پانچ عادتیں آپ کو وقت کے بہتر استعمال میں معاون ثابت ہوں گی:

1- آنے والے دن کی پہلے سے تیاری کیجیے
2- آنے والے دن کے کاموں کو ایک کاغذ پر لکھ لیجیے۔ اگر آپ یہ کر لیتے ہیں تو آپ کو کام کم لگے گا۔ اس سے آپ کو تھکاوٹ بھی کم ہو گی۔
3- اپنی زندگی کے اور روزانہ کے مقاصد کی فہرست بنائیے جو ہر وقت آپ کے سامنے ہو
4- کسی بھی کام کو نہ لٹکائیے
5- اپنی زندگی میں وقت کی قدر اور وقت کے حوالے سے گاہے گاہے سوچا کیجیے

کمال یہ ہے کہ آپ کی وجہ سے کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور آئے، تاکہ آپ کے جانے کے بعد آپ کی نسلیں آپ کی مثالیں دیں۔

غیر مکمل کام کو اگلے دن انجام دینا

آپ نے اپنے کام کی جو منصوبہ بندی کی ہوتی ہے اگر ایک دن کسی وجہ سے آپ پوری طرح سے وہ کام انجام نہیں دے سکے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں، کیونکہ آپ انسان ہیں۔ انسان ہونے کے ناتے کوتاہی ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے، ایک دن آپ کا ایک گھنٹہ ضائع ہو گیا۔ آپ کوشش کیجیے کہ دوسرے دن ایک گھنٹہ زیادہ کام کر کے اپنے کام کی ترتیب ٹھیک کر لیں۔ اپنے کام کی رفتار بڑھا دیجیے۔ کئی لوگوں میں وقت کے ضیاع کا احساس بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا کے خوش نصیب ترین لوگ وہی ہیں جنہیں یہ احساس ہونے لگے کہ مجھے چلے جانا ہے۔ لیکن یہ احساس اتنا زیادہ نہ ہو کہ آپ کے حواسوں پر طاری ہو جائے اور پھر آپ وہ کام بھی نہ کر سکیں جو آپ کر لیتے تھے۔ وقت کی کمی اور زیاں کا متوازن احساس ضروری ہے، پھر یہی احساس معیاری کام کی بنیاد بنتا ہے۔ ایسے لوگوں کی سوچ ہوتی ہے

کہ چونکہ مر ہی جانا ہے تو کیوں نہ کچھ کر کے جاؤں۔

اگر آپ نے کوئی بہت بڑا مقصد حاصل کرنا ہے تو پھر اپنے ساتھ موٹیویشن کی لیڈ لگائیں۔ موٹیویشن کے ذرائع آپ کے پاس ہونے چاہئیں۔ اگر آپ کے ٹارگٹ ہی چھوٹے چھوٹے ہیں تو پھر موٹیویشن کی ضرورت نہیں ہے۔ موٹیویشن کی ضرورت اس کو ہے جو انقلابی انسان ہے۔ جو کہتا ہے کہ میں نے تاریخ بدل دینی ہے۔ اگر نہیں تو کم از کم میں نے اپنے خاندان کی تاریخ بدل دینی ہے۔ موٹیویشن وہ انرجی ہوتی ہے جو تھوڑے وقت میں زیادہ کام کرائے۔ یہ موٹیویشن براہِ راست وقت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ موٹیویشن ہی نہیں ہے جو آپ سے کام نہ کرائے۔ شیر شاہ سوری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر کسی حکمران کو پانچ سو سال بھی ملیں تو وہ اتنا کام نہیں کر سکتا جتنا اس نے پانچ سال میں کیا۔ وہ فتوحات کیلئے اپنے محل سے نکلا، پھر واپس نہیں پلٹا۔ اس لیے اپنا انرجی لیول بلند تر رکھیے تاکہ کام کو اپنے منطقی انجام تک پہنچا سکیں۔

وقت ضائع کرنے والے عناصر

دشمن وہ ہوتا ہے جو آپ کا وقت ضائع کرتا ہے۔ ان تمام عناصر کی فہرست بنائیے جنہوں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ آپ کے اندر احساسِ ضیاع پیدا ہوگا اور دوسرا اس مشق سے آپ کو اپنے مزاج کا پتا لگ جائے گا۔ ان عناصر کو پڑھیں اور غور کریں کہ آپ میں ان میں سے کون کون سے عناصر پائے جاتے ہیں:

1- سوشل میڈیا کا استعمال

2- بری عادات

3- زندگی میں فارغ لوگ

4- غیر ضروری ایونٹ

5- حادثہ

6- واقعہ

7- تعلقات

8- انہونی

9- ملکی نظام کا سست ہونا

10- ناسمجھی

11- جذبات

12- مزاج

13- دوستوں کا حلقہ

14- بدانتظامی (مس مینجمنٹ)

15- انتظار

16- گمان

اس فہرست یعنی لسٹ کو دیکھئے اور غور کیجیے کہ اس میں کون سی ایسی چیزیں تھیں جو قدرتی تھیں، ان پر آپ کا کوئی کنٹرول نہیں تھا، اور کونسی چیزیں ایسی تھیں جن کو آپ کنٹرول کر سکتے تھے۔ فرض کیجیے، ایک شخص کے مزاج میں گلہ کرنا ہے۔ وہ روزانہ دن کے 10 منٹ گلہ کرتا ہے۔ ایک مہینے میں 5 گھنٹے بنتے ہیں اور سال کے 60 گھنٹے بنتے ہیں، یعنی ایک سال میں اس نے تین دن گلہ کرنے میں گزار دیئے۔ آپ جتنا وقت گلہ کرنے میں گزارتے ہیں، وہ ضائع ہی ہوتا ہے، کیوں کہ گلہ کرنے سے کبھی بہتری نہیں آتی۔

ایک دفعہ کالم نویس منور صابر صاحب نے جاوید چوہدری سے پوچھا کہ 2001ء میں آپ کا ایک کالم آیا تھا، کیا آپ کو یاد ہے؟ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا، "مجھے نہیں یاد۔" پھر پوچھا، آپ کو 6.6.2005 کا وہ کالم یاد ہے جو بہت پڑھا گیا تھا؟ انہوں نے پھر جواب

دیا، ''مجھے نہیں یاد!'' پھر پوچھا، پچھلے ہفتے کا کالم یاد ہے؟ انہوں نے پھر جواب دیا، ''نہیں۔'' پوچھا، کیوں؟ اس پر جاوید چوہدری نے جواب دیا، ''اگر میں یاد رکھوں گا تو پھر نیا کالم نہیں لکھ سکوں گا۔'' جس نے کچھ نیا کرنا ہوتا ہے، ترقی کرنی ہوتی ہے وہ پیچھے سے اپنا دھاگا کاٹ دیتا ہے۔

زندگی وہ ہے جو باقی ہے۔ جو گزر گئی، وہ زندگی نہیں ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ نے کسی پوچھا، تمہاری عمر کتنی ہے؟ اس نے جواب میں بتایا کہ اتنے سال۔ آپؒ نے کہا، وہ تو گزر گئی، جو ہے اس کا بتاؤ۔ اس نے کہا، اس کی خبر نہیں ہے۔ آپؒ فرمانے لگے، عمر کا کسی کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ کتنی ہے۔ اس لیے اپنے ماضی کی وجہ سے آنے والے وقت کو خراب نہ کیجیے۔ کسی کو نہیں پتا کہ ہمیں اور کتنا یہاں رہنا ہے۔ اس لیے معلوم ہونا چاہیے کہ فلاں کام کریں گے تو ٹھیک ہے، اس حد سے آگے جائیں گے تو وقت ضائع ہوگا۔ آپ اپنی زندگی میں لائن لگالیں کہ یہ میری گھریلو زندگی ہے، یہ میری پروفیشنل زندگی ہے، انہیں کبھی آپس میں خلط ملط نہ کیجیے۔

اگلے سال کیلئے

جب کوئی کام رہ جائے اور بعد آپ سوچیں کہ یہ بھی ہو سکتا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ اس کام میں مزید بہتری لائی جاسکتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کے اندر کا انسان اس پہ کام کر رہا ہے۔ جب آپ ایک سال کی منصوبہ بندی کرتے ہیں تو دراصل آپ وقت کی منصوبہ بندی کی طرف جاتے ہیں۔ وقت کی منصوبہ بندی کا دوسرا مطلب ہے، آپ زندگی کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ وہ چیز جو واپس نہیں آسکتی، وقت ہے۔ جب آپ وقت کی منصوبہ بندی کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس سال سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ زندگی میں کوئی موڑ آئے تو میں فائدہ مند بنوں۔ میں انسانیت کیلئے موثر بنوں اور آپ یہ کہہ

سیکھی کی اگر یہ دن نہ ہوتا یہ سال نہ ہوتا تو اتنا کچھ نہ ہو پاتا۔

اس سال سب سے اہم چیز یہ ہونی چاہیے کہ آپ کا سیکھنا مزید آگے بڑھنا جاری رہے۔ بلکہ یہ آپ کا مزاج بن جائے۔ سب سے اہم مشق یہ ہے کہ فقط ایک دن کی منصوبہ بندی کریں۔ آپ ایک دن میں کیا کیا کام کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دن شاندار بن جائے۔ جتنا اچھا ایک دن پلان ہوگا، اتنا ہی اچھا سال پلان ہو سکتا ہے۔ جب بھی کبھی زندگی میں کسی کو ٹائم مینجمنٹ یا منصوبہ بندی سکھانے لگیں تو اسے فقط ایک دن کی منصوبہ بندی کرائیں۔ اگر ہمارے وعدے ایک دن کے وفا نہ ہو سکے تو سال بھر کے کیا ہوں گے؟ اگر ہم اپنے ایک دن کے جملے پر پورے نہ اترے تو سال بھر کے دعوے تو بڑے دور کی بات ہے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں، "جو کہتا ہے، میں کل کروں گا اس کا کل کبھی نہیں آتا۔" اگر آپ نے اپنے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ میں نے اس سال سیکھنا ہے تو پھر دیکھیں کہ ایک دن میں کیا اور کتنا سیکھیں گے۔

اچھی منصوبہ بندی وہ ہوتی ہے جس میں سارے مصالے پورے ہوں۔ یہ اس لیے ہے کہ کامیاب زندگی کیلئے صرف کام ہی کافی نہیں ہوتا، اپنی ذات کی ضروریات بھی پوری کرنا ضروری ہے۔ آپ کی زندگی تبھی آگے بڑھے گی، جب اس میں تمام اجزاء متوازن مقدار میں موجود ہوں گے۔





قاسم علی شاہ

تعارف

قاسم علی شاہ صاحب پچھلے 17 سالوں سے شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں۔ آپ نے پاکستان کے ممتاز ٹیچرز اور سکالرز سے تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ ایم پی اے ای میں CSP آفیسرز DSD میں ہزاروں گورنمنٹ سکول ٹیچرز اور ہیڈ ماسٹرز کو ٹریننگ دے چکے ہیں۔ آپ انجینئرنگ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، ایگریکلچر یونیورسٹی فیصل آباد، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، گورنمنٹ مرے کالج سیالکوٹ، کامسیٹ یونیورسٹی لاہور، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور اور چینج بزنس یونیورسٹی لاہور میں اعزازی لیکچرز دے چکے ہیں۔ لاہور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے ریڈیو FM98.6 پر آپ کا پروگرام "منزل کا مسافر" ہے شمار لوگوں کو رہنمائی فراہم کر رہا ہے۔ مختلف HR فرمز، مارکیٹنگ فرمز اور مختلف کلاسز کے ٹیچرز ہیں۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی لاہور کیمپس کی ٹاپ فیکلٹی میں شمار کیے جاتے ہیں۔ Samaa TV آپ کی Success Story پر ڈاکومنٹری نشر کر چکا ہے۔ لاہور کالج فار وومن یونیورسٹی کی فیکلٹی کو ٹریننگ دے چکے ہیں۔ کئی ایسوسی ایشنز کی مشاورتی کونسل میں شامل ہیں۔ مختلف شعبہ زندگی کے لوگ آپ سے مشاورت کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ معروف ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے ملازمین کی ٹریننگ آپ سے کرواتی ہیں۔ مختلف NGS'S کے ساتھ مل کر اصلاح معاشرہ کے کام کرتے ہیں۔ بچوں کی تربیت پر آپ کا لکھا ہوا کتابچہ "آپ کا بچہ کامیاب ہو سکتا ہے" اور ان کی اولین کتاب "ذرا نم ہو" ہزاروں والدین کو رہنمائی فراہم کر چکا ہے۔ اسی موضوع پر کئی TV چینلز آپ کی گفتگو نشر کر چکے ہیں۔ Tune.pk, Dailymotion.com, Youtue.com اور Vimeo.gom پر آپ کے بے شمار لیکچرز موجود ہیں جن سے لاکھوں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ آپ کے مضامین روزنامہ اخبار، خبریں، نوائے وقت، جنگ، ایکسپریس اور حکایت اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب یہ مضامین کتابی شکل "کامیابی کا پیغام" میں موجود ہیں۔ آپ کو پنجاب نیشنل اکیڈمی میں بطور کوچ ٹریننگ کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ایک عرصہ سے بچوں کی اخلاقی تربیت کے موضوع پر کام کر رہے ہیں تاکہ وہ نئے آنے والے وقتوں میں روشنی پھیلا سکیں۔

مصنف کی دیگر شاہکار کتب







علم و عرفان پبلشرز
40۔ الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
37232336 ,37232184 ,37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
ilmoirfanpublishers@hotmail.com

منزل پبلیکیشنز
520-A گلشن راوی، لاہور
qasim.ali.shah
www.qasimalishah.com
042-37412486, 0333-4317811